آپ بیتی

میری کہانی

حصہ دوئم

جواہر لعل نہرو

IqbalCyberLibrary.Net
All Rights Reserved.
©2002-2006

فہرست

بادلوں کی گرج	03
کامل آزادی کا رزولیوشن اور اس کے نتائج	18
سول نافرمانی کا آغاز	29
نینی جیل میں	41
یرود میں صلح کی بات چیت	54
صوبہ متحدہ میں محصول نہ دینے کی تجویز	67
میرے والد کی وفات	81
دہلی کا معاہدہ	86
کراچی کانگرس	102
لنکا کی سیر	118
صلح کے زمانے میں حکومت اور کانگرس کے جھگڑے	124
گول میز کانفرنس	140
صوبجات متحدہ کے کسانوں کی پریشانیاں	156
عارضی صلح کا خاتمہ	179
گرفتاریاں۔تعزیری قوانین اور ضبطیاں	190
بازی پروپیگنڈا	197
بریلی اور دہرہ دون کے جیلوں میں	214
ایک قیدی کی نفسی کیفیتیں	229
قید خانے کے جانور	240
جدوجہد	251
مذہب کیا ہے؟	265
برطانوی حکومت کی دورخی پالیسی	282

بادلوں کی گرج

۱۹۲۹ء کی کانگرس لاہور میں ہونے والی تھی۔ دس سال کے بعد کانگرس پھر پنجاب آ رہی تھی۔ لوگوں کے ذہن ۱۹۱۹ کے واقعات سے تازہ ہو گئے:۔ جلیانوالا باغ کا حادثہ، مارشل لا اور اس کی ذلتیں، امرتسر کا اجلاس اور ترک موالات کی تحریک کا شروع ہونا۔ اس دس سال کے عرصہ میں بہت کچھ ہو چکا تھا ہندوستان کا نقشہ بدل گیا تھا مگر ۱۹۱۹ء کے واقعات کی مثالیں اب بھی موجود تھیں۔ سیاسی کشمکش بڑھتی جاتی تھی اور لڑائی کی فضا تیزی سے چھا رہی تھی۔ آنے والی لڑائی کے آثار سارے ملک میں نظر آ رہے تھے۔

اسمبلی اور صوبوں کی کونسلوں سے ایک مدت سے کسی کو دلچسپی نہیں رہی تھی سوائے ان چند حضرات کے جو ان مقدس حلقوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اپنا کام شم، پشٹم چلا رہے تھے اور اس کی کوشش کر رہے تھے کہ حکومت کی تحکم پسندی اور استبداد پر ایک پھٹا پرانا پردہ ڈالے رہیں تاکہ ہندوستان کی ''پارلیمنٹ'' کا نام باقی رہے اور اس کی ممبروں کو الاؤنس ملتا رہا۔ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی آخری کامیاب کوشش جو اسمبلی نے کی وہ اس کا ۱۹۲۸ء کا رزولیوشن تھا جس میں سائمن کمیشن سے اتحاد عمل کرنے سے انکار کیا گیا تھا۔

اس کے بعد کچھ دن تک اسمبلی کے صدارت اور حکومت کے درمیان کش مکش ہوتی رہی۔ اسمبلی کے سوراجی صدر وٹھل بھائی پٹیل اپنی آزادی رائے کی وجہ سے حکومت کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے اور ان کے پر کترنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس قسم کے واقعات لوگوں کو اسمبلی کی طرف متوجہ کر لیتے تھے مگر مجموعی طور پر پبلک کی توجہ کا مرکز باہر کے واقعات تھے۔ میرے والد کونسل کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ اس وقت کونسلوں سے کوئی طرف
سے بالکل مایوس ہو گئے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ اس وقت کونسلوں سے کوئی کام

نہیں نکل سکتا وہ خود اس چکر سے نکلنے کا موقع ڈھونڈھ رہے تھے۔ اگر چہ وہ آئینی دماغ رکھتے تھے اور قانونی طریقوں کے عادی تھے لیکن واقعات سے انھیں یہ افسوسناک تجربہ ہوا کہ نام نہاد آئینی طریقے ہندوستان میں بالکل بیکار ہیں۔ وہ اپنی قانونی ذہنیت کی تسکین کے لئے اس کے یہ تاویل کرتے تھے کہ ہندوستان میں نہ تو کوئی آئین ہے اور نہ قانون کی حکومت ہے اس لئے کہ یہاں محض ایک شخص یا چند اشخاص کی مرضی سے آرڈی نینس وغیرہ کی شکل میں یکا یک قانون نافذ ہو جاتے ہیں جیسے بازی گر کی ٹوپی سے خرگوش نکل پڑتا ہے۔ وہ اپنی طبیعت اور عادت کے لحاظ سے ہرگز انقلاب پسند نہ تھے اور اگر اوسط طبقے کی کوئی جمہوری ہوتی تو وہ یقیناً اس کے پشت پناہ ہوتے مگر موجودہ حالات میں انھیں ہندوستان کی آئینی شورش اور دکھاوے کی پارلیمنٹ کے نام سے نفرت ہوتی جاتی تھی۔

گاندھی جی ابھی تک سیاسیات سے الگ تھے۔ سوائے اس کے کہ انھوں نے کلکتے کی کانگرس میں حصہ لیا تھا۔ پھر بھی وہ واقعات کی رفتار سے پوری طرح باخبر تھے اور کانگرس کے لیڈر اکثر ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ چند سال سے ان کا وقت زیادہ تر کھاوی کو رواج دینے میں صرف ہوتا تھا اور انھوں نے اس غرض سے ہندوستان میں لمبے لمبے دورے کئے تھے۔ انھون نے باری باری سے ہر صوبے کا دورہ کیا اور ہر ضلعے، ہر بڑے قصبے یہاں تک کہ دور افتادہ دیہات میں بھی پہنچے۔ ہر جگہ انکی وجہ سے لوگوں کا بے شمار مجمع ہوتا تھا اور ان کے پروگرام کو پورا کرنے کے لئے ان کے اسٹاف کو پہلے سے بہت کچھ کام کرنا پڑتا تھا۔ اس طریقے سے انھوں نے کئی بار ہندوستان کا دورہ کیا ہے اور شمال سے لے کر جنوب کے سرے تک اور مشرقی پہاڑوں سے لیکر مغربی سمندر تک اس وسیع ملک چپہ چپہ چھان ڈالا ہے۔ میرے خیال میں کسی انسان نے ہندوستان کا اتنا سفر نہیں کیا جتنا انھوں نے کیا ہے۔ اگلے زمانے میں بڑے بڑے سیلانی گذرے ہیں جو ہمیشہ چلتے رہتے تھے۔

یہ خلفی یاتری تھے جن پر ہمیشہ سفر کی دھن سوار رہتی تھی۔ مگر ان کے زمانے میں آمدورفت کے ذریعے بہت سست تھے اور ان کی عمر بھی کی سیاحت ریل یا موٹر کے ایک سال کے سفر کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ گاندھی جی نے ریل اور موٹر سے سفر کیا مگر اس کے پابند نہیں رہے بلکہ پیدل بھی پھرے۔ اس طرح انھیں ہندوستان اور اس کے باشندوں کے متعلق وہ معلومات حاصل ہوگئیں جو کسی کو نصیب نہیں ہوئیں اور کروڑوں آدمیوں کو انھیں دیکھنے کا اور ان سے ملنے کا موقع ملا۔

۱۹۲۹ء میں وہ اپنے کھادی کے دورے کے سلسلے میں صوبہ متحدہ آئے اور سخت گرمی کے موسم میں کئی ہفتے اس صوبہ کا دورہ کرتے رہے۔ کبھی کبھی میں بھی چند روز کے لئے ان کے ساتھ چلا جاتا تھا اور پچھلے تجربے کے باوجود مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی تھی کہ ان کی کشش سے لوگوں کا کتنا زبردست مجمع اکٹھا ہوجاتا ہے۔ یہ بات سب سے زیادہ مشرقی اضلاع، مثلاً گورکھپور میں نمایاں تھی۔ جہاں لوگوں کی ہجوم پر ٹڈی دل کا گمان ہوتا تھا۔ جب ان کا موٹر دیہات سے گزرتا تھا تو ہر چند میل کے فاصلے پر دس ہزار سے لے کر پچیس ہزار تک مجمع ہوجاتا تھا۔ اور اس بڑے جلسے میں جو روزانہ کہیں نہ کہیں ہوتا تھا لوگوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی بڑھ جاتی تھی۔ سوائے چند بڑے شہروں کے اور کہیں ریڈیو کا انتظام نہیں تھا اس لئے ظاہر ہے کہ اتنا بڑا مجمع ان کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔ غالباً ان لوگوں کو سننے کی توقع بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسی سے خوش ہوجاتے تھے کہ انھیں مہاتما کا درشن نصیب ہوگیا۔ گاندھی جی عموماً ان موقعوں پر بہت مختصر تقریر کرتے تھے تاکہ انھیں حد سے زیادہ تکان نہ ہو۔ اس کے بغیر اس سلسلے کو ہر روز بلکہ ہر گھنٹے جاری رکھنا قطعاً ناممکن تھا

میں صوبہ متحدہ کیپورے دورے میں ان کے ساھت نہیں رہا کیونکہ میں ان کیلئے کچھ زیادہ کارآمد نہیں تھا اور خواہ مخواہ دروہ کرنے والوں کی تعداد بڑھانے سے

کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ گو مجھے بڑے مجمعوں سے وحشت نہیں ہوتی لیکن بغیر کسی معقول وجہ کے میں دھکے کھانے اور پیر کچلوانے کی تکلیف جو عموماً گاندھی جی کے ساتھیوں کے حصے میں آتی ہے، کیوں اٹھاتا۔ مجھے اور بہت سا کام کرنا تھا اور میں اپنی جدوجہد کو کھادی کے پرچار تک محدود نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لئے کہ موجودہ سیاسی حالت کے مقابلے میں مجھے یہ ایک چھوٹی سے چیز معلوم ہوتی تھی۔ گاندھی جی کی غیر سیاسی مصروفیتیں مجھے ایک حد تک ناگوار تھیں اور ان کے خیالات کی جڑ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان دنوں وہ کھادی کے کام کیلئے چندہ کر رہے تھے اور اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ مجھے (درد نرائن) یعنی غریبوں کے خدا کے لئے روپیہ چاہئے۔ غالباً اس سے ان کا یہ منشا تھا کہ وہ گھریلو صنعتوں کے ذریعے سے غریبوں کے لئے کام مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان الفاظ کی تہ میں مفلسی کی عظمت کا خیال پوشیدہ تھا۔ گویا ان کے نزدیک خدا خاص طور پر غریبوں کا خدا ہے اور وہ اس کے برگزیدہ بندے ہیں۔ شاید مفلسی قابل نفرت چیز معلوم ہوتی ہے جس کی ہرگز تعریف نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس کا مقابلہ کر کے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہئے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ میں اس نظام پر حملہ کروں جو لوگوں کے مفلس ہونے کو گوارا کرتا ہے بلکہ خود مفلسی پیدا کرتا ہے۔ جو لوگ اس سے ہچکچاتے ہیں انھیں کسی نہ کسی طرح مفلسی کے وجود کی حمایت کرنی پڑتی ہے۔ ان کے دل میں خیال بسا ہوا ہے کہ دنیا میں دولت کی کمی ہے اور وہ کسی طرح دنیا کی اس حالت کا تصور نہیں کر سکتے جس میں سب کے لئے ضروریات زندگی افراط سے مہیا ہوں۔ غالباً ان کا یہ خیال ہے کہ غریب اور امیر فرق ہمیشہ باقی رہے گا۔

جب کبھی مجھے گاندھی جی سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع ملا انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ امیر اپنی دولت کو عالم لوگوں کی امانت سمجھیں۔ یہ بہت قدیم خیال ہے جو یورپ میں قرون وسطیٰ میں بہت عام تھا اور ہندوستان میں اب

تک پایا جاتا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ انسان کس طرح اس کی توقع کرسکتا ہے یا اسے سماجی مسئلے کا حل سمجھ سکتا ہے۔

اسمبلی، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ایک اونگھتی سوتی جماعت ہوتی جاتی تھی اور اس کی روکھی پھیکی کاروائیوں میں بہت کم لوگ دلچسپی لیتے تھے۔ ایک دن بھگت سنگھ اور ب۔ک۔دت نے اسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ انھوں نے مہمانوں کی گیلری سے نیچے کی منزل میں دو بم پھینکے۔ کسی کے زیادہ چوٹ نہیں آئی اور غالباً جیسا کہ ان ملزموں نے آگے چل کر بیان کیا، ان کا مقصد بھی کسی کو نقصان پہنچانا نہ تھا۔ بلکہ محض ایک ہل چل پیدا کر دینا تھا۔

چنانچہ واقعی اسمبلی میں اور سارے ملک میں ایک ہل چل مچ گئی۔ تخویف پسندوں کی دوسری کاروائیاں اس قدر بے ضرر نہ تھیں۔ ایک نوجوان انگریز افسر، جس کی نسبت یہ خیال تھا کہ اس نے لالہ لاجپت رائے کو مارا تھا، لاہور میں گولی سے ہلاک کر دیا گیا۔ بنگال وغیرہ میں بھی پھر تخویف پسندوں کا زور ہو گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے کئی سازش کے مقدمے چلائے جا رہے تھے۔ نظر بندوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

لاہور کی سازش کے مقدمے میں پولیس نے عدالت میں عجیب عجیب حرکتیں کیں جس کی وجہ سے پبلک اس مقدمے کی طرف خاص طور پر متوجہ ہو گئی۔ اکثر قیدیوں نے اس برتاؤ کے خلاف جو ان سے عدالت اور جیل خانوں میں ہوتا تھا بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ یہ ہڑتال کس وجہ سے شروع ہوئی تھی مگر آگے چل کر اس کے مقاصد میں اس برتاؤ کا مسئلہ بھی شامل ہو گیا جو قیدیوں خصوصاً سیاسی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ بھوک ہڑتال ہفتوں چلتی رہی اور اس کی وجہ سے ملک میں ایک ہل چل مچ گئی ملزم اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ انھیں عدالت میں لیجانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے کارروائی بار بار ملتوی کرنی پڑتی تھی۔ اس پر

حکومت ہند نے ایک نئے قانون کی رو سے عدالت کو یہ اجازت دی دی کہ ملزموں یا ان کے وکیلوں کی غیر موجودگی میں بھی مقدمے کی کاروائی جاری رکھی جاسکتی ہے۔ اس کی تحقیقات بھی کہ قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہوتا ہے انھیں کے سپرد کردی گئی۔

جس وقت بھوک ہڑتال کو شروع ہوئے ایک مہینہ گزرا تھا میں لاہور میں موجود تھا۔ مجھے جیل خانے میں بعض قیدیوں سے ملنے کی اجازت دے دی گئی اور میں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے بھگت سنگھ کو عمر بھر میں پہلی بار دیکھا اور جتندر ناتھ داس اور دوسرے قیدیوں سے بھی ملا۔ یہ سب کے سب بہت کمزور اور صاحب فراش تھے اوران سے زیادہ بات چیت کرنے کا موقع نہ تھا۔ بھگت سنگھ کا چہرہ دلکش تھا اس سے ذہانت ٹپکتی تھی اور کچھ عجیب سکون و اطمینان کی کیفیت پائی جاتی تھی غصے کا اس میں نام تک نہ تھا اس کی بات چیت اور سارے انداز میں ایک خاص نرمی تھی مگر شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایک مہینے کے فاقے کے بعد ہر شخص میں روحانیت اور نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ جتندر ناتھ داس اور بھی زیادہ حلیم معلوم ہوتا تھا اور اس لڑکیوں کی سی بھولی صورت تھی۔ جس وقت میں نے اس دیکھا اور سخت تکلیف کی حالت میں تھا۔ آگے چل کر اکسٹھ دن کے فاقے کے بعد وہ دنیا سے گذر گیا۔

بھگت سنگھ کو سب سے زیادہ اس کی فکر تھی کہ وہ اپنے چچا سردار جیت سنگھ سے جو ۱۹۰۷ء میں لالہ لاجپت رائے کے ساتھ جلاوطن کئے گئے تھے ملے، یا کم از کم انکی خیر خبر معلوم کرے۔ مدتوں سے وہ جلاوطنی کی زندگی بسر کررہے تھے۔ ایک افواہ یہ سننے میں آئی تھی کہ انہوں نے افریقہ میں سکونت اختیار کرلی ہے مگر کوئی یقینی بات نہیں معلوم ہوسکی۔ خدا جانے وہ اب زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

جتندر ناتھ داس کی موت سے سارے ملک میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ سیاسی قیدیوں سے بدسلوکی کا مسئلہ زور شور سے چھڑ گیا۔ حکومت نے اس کی تحقیقات کے

لئے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے قواعدہ بنائے گئے جن کی رو سے قیدیوں کے تین درجے قرار دئے گئے۔ سیاسی قیدیوں کا کوئی خاص درجہ نہیں رکھا گیا۔ ان قواعد سے کچھ اصلاح کی امید معلوم ہوتی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان سے کوئی فرق نہیں پڑا اور قیدیوں کی حالت اب تک نہایت نا قابل اطمینان ہے۔

گرمی اور برسات گزر گئی اور خزاں کا موسم آ گیا۔ صوبوں کا کانگرس کمیٹیاں لاہور کانگرس کے صدر کے انتخاب میں مصروف تھیں۔ انتخاب کا عمل بہت طول طویل تھا اور اگست میں شروع ہو کر اکتوبر میں ختم ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں سب لوگ اس پر متفق تھے کہ گاندھی جی صدر بنائے جائیں۔ دوبارہ صدر منتخب ہونے سے کانگریس میں ان کا درجہ بڑھ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ کئی سال سے مہا صدر مانے جاتے تھے مگر سب کا یہ خیال تھا کہ ملک میں لڑائی چھڑنے والی ہے جس کے سردار واقعتاً وہی ہوں گے۔ اس لئے اگر قانوناً کانگرس کے سردار بھی وہی بنا دئے جائیں تو اچھا ہے۔ اس کے علاوہ حقیقت میں کوئی اور ایسا تھا بھی نہیں جس پر سب کی نظریں پڑتیں۔

چنانچہ صوبوں کی کمیٹیوں نے گاندھی جی کا نام صدرارت کے لئے تجویز کیا مگر انہوں نے اسے منظور نہیں کیا۔ ان کا انکار بالکل صاف تھا لیکن اس میں مزید بحث کی گنجائش معلوم ہوتی تھی اور لوگوں کو امید تھی کہ وہ اپنے فیصلے کرنے کے لئے لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اور آخر تک ہم سب کا یہ خیال تھا کہ وہ راضی ہو جائیں گے مگر وہ کسی طرح نہ مانے اور بالکل آخری لمحے میں انہوں نے میرا نام پیش کیا۔ ان کے آخری انکار سے کمیٹی گھبرا گئی اور اس کے ممبروں کو یہ بات کسی قدر ناگوار ہوئی کہ گاندھی جی نے انہیں بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ اس وقت اور کوئی صدر نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے چار ناچار مجھی کو منتخب کیا۔

مجھے کبھی اتنی تکلیف اور ذلت کا احساس نہیں ہوا تھا جتنا اس انتخاب کے موقع پر ہوا۔ میں جانتا تھا کہ یہ بہت بڑی عزت ہے اور اگر میرا انتخاب معمولی طریقے سے ہوتا تو مجھے بے حد خوشی ہوتی مگر میں صدر دروازے سے تو کے اپہلو کے دروازے سے بھی داخل نہیں ہوا تھا بلکہ یکا یک چور دروازے سے نکل پڑا تھا۔ لوگ حیران رہ گئے اور انہیں میری صدارت قبول کرنی پڑی۔ انہوں نے بگڑی بات بنا لی اور مجھے کڑوی دوا سمجھ کر پی گئے۔ میری خودداری کو ٹھیس لگی اور جی چاہا کہ اس اعزاز کو واپس کر دوں، مگر خوش قسمتی سے میں نے ضبط سے کام لیا ورنہ تماشا بن جاتا۔ میں بہت ملال اور افسردگی کی حالت میں چپکے سے اٹھ کر چلا گیا۔

غالباً اس فیصلے سے سب سے زیادہ خوشی میرے والد کو ہوئی۔ انہیں میرے سیاسی خیالات پسند نہ تھے مگر مجھے چاہتے تھے اور میری ہر کامیابی سے بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ خود اکثر مجھ پر نکتہ چینی کرتے تھے اور مجھے جھڑک دیتے تھے مگر کسی اور کی مجال نہ تھی کہ مجھے ان کے سامنے برا کہے۔

میرا انتخاب میرے لئے بہت بڑی عزت اور بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ یہ پہلی مثال تھی کہ باپ کے بعد ہی بیٹا صدارت کی کرسی پر بٹھایا گیا۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ میں کانگرس کا سب سے کم عمر صدر ہوں (اس وقت میری عمر چالیس برس کی تھی) مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ میرے خیال میں کھوکھلے جب کانگرس کے صدر ہوئے تو ان کی بھی قریب قریب یہی عمر تھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے (اگرچہ وہ مجھ سے کچھ بڑے ہیں) اس سے بھی کم عمر میں صدارت کی۔ مگر گوکھلے ۳۷۔۳۸ برس کی عمر میں پختہ کار مدبروں میں شمار ہوتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے خاص اہتمام سے قابل احترام بوڑھوں کی سی شکل بنالی تھی جو ان کے علم و فضل کے شایان شان تھی مگر مجھے تو لوگ مدبر سمجھتے تھے اور نہ کبھی مجھ پر علم و فضل کا الزام لگایا گیا اس لئے میں اب تک بڑھاپے کے شبہ سے بچا ہوا ہوں۔ حالانکہ میرے بال

سفید ہو گئے ہیں اور میرا چہرہ میری عمر کے راز کو فاش کر رہا ہے۔

لاہور کانگریس کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اس اثنا میں واقعات کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود ان کے اندر قوت کام کر رہی ہے جو انہیں آگے بڑھائے لئے جاتی ہے۔ افراد خواہ اپنی کتنی ہی اہمیت سمجھتے ہوں مگر اصل میں انہیں اس تحریک میں بہت کم دخل تھا۔ انسان کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی زبردست مشین کا ایک پرزہ ہے جو پوری قوت سے چل رہی ہے۔

غالباً تقدیر کے اس ریلے کو روکنے کی توقع میں حکومت نے ایک قدم آگے بڑھایا اور وائسرائے ہند لارڈ ارون نے یہ اعلان کیا کہ ایک ''گول میز کانفرنس'' منعقد کی جائے گی۔ اس اعلان میں بڑی ہوشیاری سے ایسے الفاظ رکھے گئے تھے جن کی معنی ممکن تھا کہ بہت کچھ ہوں اور یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ نہ ہوں۔ ہم میں سے اکثر لوگ دوسری صورت کو زیادہ قرین قیاس سمجھتے تھے۔ بہر حال اگر اس اعلان کے کچھ معنی تھے بھی تب بھی جو کچھ ہم چاہتے تھے اس سے بہت کم تھے۔ اس اعلان کے ہوتے ہی بڑی بے صبری کے ساتھ لیڈروں کی ایک کانفرنس دہلی میں منعقد کی گئی۔ گاندھی جی، میرے والد، اور وٹھل بھائی پٹیل (جو اب تک اسمبلی کے صدر تھے) اور اعتدال پسند لیڈروں میں سر تیج بہادر سپرو اور دوسرے حضرات وہاں موجود تھے، ان سب نے مل کر ایک متفقہ رزولیوشن یا اعلان تیار کیا جس میں یہ ظاہر کیا گیا کہ ہم وائسرائے کا اعلان بعض اہم شرطوں کے ساتھ، جن کا پورا ہونا نہایت ضروری ہے قبول کرتے ہیں۔ اگر حکومت ان شرطوں کو منظور کر لے تو ہم اس کے ساتھ اتحاد عمل کر سکتے ہیں یہ واقعی اچھی خاصی اہم شرطیں تھیں۔ (۱)

اس رزولیوشن کو سب جماعتوں کے نمائندوں سے جن میں اعتدال پسند بھی تھے اور انتہا پسند بھی منوا لینا واقعی بڑی کامیابی تھی۔ کانگریس کے نصب العین سے یہ بہت پست تھا۔ البتہ ایک متفقہ تجویز کے لحاظ سے خاصا بلند تھا۔ مگر اس میں

ایک بڑا دھوکا تھا، ان شرطوں کے متعلق کم سے کم دو فریق مختلف نقطہ نظر رکھتے تھے۔ کانگرس والے تو انہیں واقعی ناگزیر چیز سمجھتے تھے جس کے بغیر اتحاد عمل ممکن نہ تھا۔ ان کی طرف سے یہ کم سے کم مطالبہ تھا۔ یہ بات کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں جو اس کے بعد منعقد ہوا بالکل صاف کر دی گئی اور یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ ان شرطوں کی میعاد کانگرس کے آئندہ اجلاس تک ہے مگر اعتدال پسندوں کے نزدیک یہ زیادہ سے زیادہ مطالبہ تھا اور اس پر اس حد تک زور دینے کی ضرورت نہ تھی کہ اتحاد عمل سے انکار کر دیا جائے۔ رزولیوشن میں تو ان شرطوں کو اہم قرار دیا گیا تھا مگر وہ لوگ انہیں سرے سے شرطیں ہی نہیں سمجھتے تھے۔

چنانچہ باوجود اس کے کہ ان میں سے کوئی شرط پوری نہیں کی گئی اور ہم میں سے اکثر اور ہمارے ساتھ اور ہزاروں آدمی قید کر دئے گئے مگر ہمارے اعتدال پسند اور مصالحت پسند دوستوں نے جو اس اعلان پر دستخط کرنے میں ہمارے شریک تھے، ہمیں قید کرنے والوں کے ساتھ پورا پورا اتحاد عمل کیا۔

ہم میں سے اکثر کو شبہ تھا کہ ایسا ہی کچھ ہوگا۔ (اگرچہ ہم یہ نہیں سمجھتے تھے کہ یہ حضرات اس حد تک عمل کرنے پر تیار ہو جائیں گے) پھر بھی اس وقت تھوڑی بہت امید تھی کہ اس متحدہ فیصلے کی وجہ سے جس میں کانگرس والوں نے کس قدر ضبط سے کام لیا تھا، اعتدال پسند اور دوسرے فریق بھی جنہیں بے سمجھ بوجھے حکومت سے اتحاد عمل کرنے کی عادت ہے، اپنی اس خواہش کو ضبط کریں گے۔ ہم لوگوں کو جنہیں یہ سمجھوتا سخت ناپسند تھا سب سے زیادہ خیال اس کا تھا کہ ہم کانگرس کی جماعت میں پورا پورا اتحاد قائم رکھیں۔ ایک بہت بڑی لڑائی شروع ہونے والی تھی اس لئے ہم یہ ہرگز نہیں کر سکتے تھے کہ آپس میں تفریق ہونے دیں۔ یہ معلوم تھا کہ حکومت ان شرطوں کو منظور نہیں کرے گی۔ اسلئے ہماری پوزیشن اور مضبوط ہو جائے گی اور ہم کانگرس کے نرم فریق کو بھی اپنی طرف کھینچ لیں گے۔ چند ہی ہفتہ

کی بات تھی دسمبر کا مہینہ اور لاہور کانگرس کچھ دور نہ تھی۔

پھر بھی ہمارے لئے یہ مشترکہ اعلان بہت ناگوار چیز تھی۔ کامل آزادی کے مطالبے کو چھوڑنا خواہ وہ فرضی طور پر اور تھوڑی ہی مدت کے لئے کیوں نہ ہو غلط اور خطرناک پالیسی تھی اس لئے مجھ کو اس اعلان پر دستخط کرنے میں تامل تھا اور سوبھاش بوس نے تو قطعاً انکار کر دیا تھا۔ پہلے میں نے بھی نا کار کیا، مگر جیسا کہ میں اکثر کرتا ہوں، سب کے کہنے سننے سے دستخط کر دئے۔ پھر بھی مجھے سخت صدمہ تھا اور دوسرے ہی دن میں نے کانگرس کی صدارت سے استعفا دینے کا ارادہ کر لیا اور گاندھی جی کو خط کے ذریعے سے اس کی اطلاع دی۔ غالباً میں دل سے استعفا دینا نہیں چاہتا تھا۔ اگر چہ میں وقتی بے حد پریشان تھا۔ گاندھی نیا یک تسکین وہ خط لکھا اور تین دن غور کرنے کے بعد میرا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔

لاہور کانگرس سے تھوڑے ہی دن پہلے کانگرس ارحکومت کے درمیان سمجھوتے کی ایک آخری کوشش کی گئی۔ لارڈ ارون سے ملاقات کا انتظام کیا گیا مجھے نہیں معلوم کہ اس ملاقات کی تحریک کس نے کی تھی مگر میرا خیال یہ ہے کہ شاید وٹھل بھائی پٹیل اس کے محرک تھے۔ گاندھی جی اور میرے والد کانگرس کے خیالات کی نمائندگی کر رہے تھے اور شاید مسٹر جناح، سر تیج بہادر سپرو اور پریسیڈنٹ پٹیل بھی موجود تھے۔ اس ملاقات سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ گفتگو کی کوئی مشترک بنیاد نہیں تھی اور دونوں بڑے فریقوں، یعنی حکومت اور کانگرس کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ غرض ابکانگرس کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ عملی کاروائی شروع کرے۔ کلکتے میں جو ایک سال کی مہلت دی گئی تھی وہ ختم ہو رہی تھی۔ اب قطعی طور پر اس کا اعلان کرنا تھا کہ کانگرس کا مقصد کامل آزادی ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے عملی تدابیر اختیار کرنی تھیں۔

لاہور کانگرس سے پہلے کے ہفتوں میں مجھے ایک اور اہم کام درپیش تھا۔ آل

انڈیا ٹریڈ یونین کا اجلاس ناگپور میں ہونے والا تھا اور مجھے اس میں صدارت کرنی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ ایک ہی شخص چند ہفتے کے اندر نیشنل کانگرس اور ٹریڈ یونین کانگرس کی صدارت کرے۔ مجھے یہ امید تھی کہ میں دونون کے درمیان ایک واسطے کا کام کروں گا اور انھیں ایک دوسرے سے قریب تر کردوں گا تا کہ کانگرس میں اشتراکیت اور مزدوروں کی حمایت کا جذبہ بڑھ جائے اور مزدور قومی تحریک میں شامل ہو جائیں۔

شاید یہ امید بالکل بے بنیاد تھی اس لئے کہ قومیت اشتراکیت کی راہ پر زادہ دور اسی وقت تک چل سکتی ہے جب وہ قومیت نہ رہے۔ پھر بھی میرا یہ خیال تھا کہ اگر چہ کانگرس پر متوسط طبقے کے لوگوں کا رنگ غالب ہے لیکن ملک میں وہی ایک موثر انقلابی قوت ہے۔ اس لئے مزدوروں کو چاہئے کہ اس سے اتحاد عمل کریں اور اس پر اثر ڈالیں مگر اپنی مستقل حیثیت اور اپنے خاص خیالات کو قائم رکھیں اور میں سمجھتا تھا کہ واقعات کی رفتار سے اور عملی جدوجہد کی شرکت کی وجہ سے کانگرس میں اور زیادہ انتہا پسندی پیدا ہو جائے گی اور وہ سماجی اور معاشی مسائل سے نبٹنے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ پچھلے چند سال میں کانگرس کی توجہ زیادہ تر کسان اور گاؤں کی طرف رہی تھی، اگر یہی رفتار جاری رہتی تو وہ رفتہ رفتہ ایک بہت بڑی کسانوں کی انجمن بن جاتی یا کم سے کم اس میں کسانوں کے نمائندوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ اگر چہ ان کے لیڈر اوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگ تھے۔

اس طرح اس بات کا امکان تھا کہ شہر اور گاؤں کی نزاع، جو ہمیشہ سی چلی آتی ہے نیشنل کانگرس اور ٹریڈ یونین کانگرس کے تعلقات پر اثر ڈالے گی۔ مگر یہ امکان بعید تھا کیونکہ موجودہ نیشنل کانگرس متوسط طبقے کے شہریوں کے ہاتھ میں ہے اور جب تک کہ قومی آزادی کا مسئلہ طے نہ ہوگا اس پر قومیت کا رنگ غالب رہے گا اور ملک میں اسی جذبے کا زور رہے گا۔ پھر بھی مجھے مناسب معلوم ہوا کہ کانگرس اور

مزدوروں کی جماعت کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی جائے اور صوبہ متحدہ میں ہم نے یہاں تک کیا کہ صوبے کی کانگرس کمیٹی میں ٹریڈ یونین کانگرس کی شاخ کے نمائندوں کو بھی دعوت دی۔ بہت سے کانگرسیوں نے بھی مزدوروں کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا۔

مگر مزدروں کا انتہا پسند فریق نیشنل کانگرس سے دور ہی دور رہنا چاہتا تھا۔ انھیں اس کے لیڈروں پر اعتبار نہ تھا اور وہ اس کے خیالات کو متوسط طبقے کے رجعت پسندانہ خیالات سمجھتے تھے۔ سچ پوچھئے تو مزدروں کے نقطہ سے یہ بات صحیح بھی تھی۔ نیشنل کانگرس جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر تھا قومیت پسندوں کی انجمن تھی۔

۱۹۲۹ء میں شروع سے آخر تک ہندوستان کے ٹریڈ یونین کے حلقوں میں ایک نئی چیز نے، یعنی اس رائل کمیشن نے جو ہندوستان کے مزدوروں کے تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا اور وھٹلے کمیشن کہلاتا تھا ایک ہنگامہ برپا کئے رکھا۔ انتہا پسند فریق کمیشن کا بائیکاٹ کرنا چاہتا تھا اور اعتدال پسند اتحاد عمل کرنے پر تیار تھا۔ اس میں شخصی عنصر بھی شامل ہو گیا تھا اس لئے کہ اعتدال پسند فریق کے بعض لیڈر کمیشن کے ممبر بنائے جا رہے تھے اور بہت سی باتوں کے طرح اس معاملے میں بھی میری ہمدردی انتہا پسند فریق کے ساتھ تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ نیشنل کانگرس کی پالیسی بھی یہی تھی۔ ایسی حالت میں جب ہم عمل جدوجہد کے لئے تیار تھے۔ سرکاری کمیشنوں سے اتحاد عمل کرنا مہمل سی بات معلوم ہوتی تھی۔

ناگپور کی ٹریڈ یونین کانگرس میں وھٹلے کمیشن کے بائیکاٹ کا مسئلہ سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اس میں اور بہت سے اور نزاعی مسائل میں انتہا پسند فریق کو کامیابی ہوئی۔ میرا حصہ اس کانگرس کی کاروائی میں محض برائے نام تھا۔ چونکہ میں اس میدان میں نیا نیا آیا تھا اور ابھی تک سے اچھی طرح واقف نہ تھا اس لئے دخل دیتے ہوئے ہچکچاتا۔ عام طور پر انتہا پسند فریق کے خیالات سے اتفاق کرتا رہا مگر جلسے کی

کاروائی میں میں نے کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا اور بجائے صدر کے ایک غیر اجنب دار مقرر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ چنانچہ ٹریڈ یونین کانگرس میں تفریق ہوگئی۔ اعتدال پسند جماعت نے ایکنئی انجمن بنالی اور میں کچھ بھی نہ کرسکا۔ ذاتی طور پر میرا یہ خیال تھا، کہ اعتدال پسند جماعت علیحدگی اختیار کرنے میں حق بجانب نہیں ہے مگر اس میں انتہاپسند جماعت کا بھی قصور تھا اور اس نے انھیں الگ ہونے پر ایک حد تک مجبور کردیا تھا۔ ان دونوں فریقوں کے بیچ میں ایک درمیانی فریق تھا مگر وہ بالکل لیے بس تھا۔ شاید اگر اس فریق کو اچھے لیڈر مل گئے ہوتے تو وہ ٹریڈ یونین کانگرس میں تفریق نہ پیدا ہونے دیتا اور اگر تفریق ہو جاتی تو اس کے اتنے افسوسناک نتائج نہ ہوتے جتنے آگے چل کر پیدا ہوئے۔

موجودہ صورت میں ہندوستان کی ٹریڈ یونین کی تحریک کو بہت سخت دھچکا پہنچا جس سے وہ بھی تک پنپنے نہیں پائی ہے۔ حکومت پہلے ہی مزدوروں کے انتہاپسند فریق کے خلاف اعلان جنگ کرچکی تھی اور میرٹھ کا مقدمہ اس کا پہلا نتیجہ تھا۔ جنگ برابر جاری رہی۔ کارخانے کے مالکوں نے بھی اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۲۹ء و ۱۹۳۰ء کے جاڑے سے دنیا میں کساد بازاری شروع ہوگئی تھی۔ ایک تو اس کا اثر مزدوروں پر پڑ رہا تھا، دوسرے ان پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے، تیسرے ان کی ٹریڈ یونین کی تحریک انتہائی پستی کو پہنچ گئی تھی۔ غرض ان کے لئے بڑی مصیبت کا سامنا تھا وہ اپنی حالت کو روز بروز بگڑتے ہوئے دیکھتے تھے اور کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ دو ایک سال کے بعد ٹریڈ یونین کانگرس میں ایک اور تفریق اور اشتمالیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت الگ ہوگئی۔ اب اصولی حیثیت سے ہندوستان میں تین ٹریڈ یونین تھیں۔ اعتدال پسند جماعت، اصل ٹریڈ یونین کانگرس اور اشتمالیوں کا گروہ۔ عملی حیثیت سے یہ سب کمزور اور بے اثر تھے اور ان کے آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے عام مزدور بہت بددل ہوگئے تھے۔ مجھے ۳۰ء کے

بعد سے ان تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں رہا اس لئے کہ میں زیادہ تر جیل میں رہا۔ رہائی کے مختصر اوقات میں مجھے معلوم ہوا کہ اتحاد کی کوششیں ہورہی ہیں مگر ان میں کامیابی نہیں ہوئی۔ (۲) اعتدال پسند جماعت کی قوت اس وجہ سے بڑھ گئی ہے کہ ریلوے کے مزدوران کے ساتھ مل گئے ہیں۔ انھیں دوسری جماعتوں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ حکومت ان کی انجمن کو تسلیم کرتی ہے اور جنیوا کی لیبر کانفرنس میں پیش کرنے کے لئے ان کی تجویزوں کو قبول کر لیتی ہے جینوا جانے کے شوق میں مزدوروں کے بعض لیڈران کے ساتھ شریک ہو گئے ہیں اور اپنی انجمنوں کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لائے ہیں۔

---

(۱) وہ شرطیں یہ تھیں:۔

۱۔ مجوزہ کانفرنس میں جتنی بحثیں ہوں وہ اس بنیاد پر ہوں کہ ہندوستان کو نو آبادیات کا درجہ دیا جائے۔

۲۔ کانفرنس میں کانگرس کے نمائندوں کے تعداد غالب ہو۔

۳۔ سیاسی قیدیوں کو عام معافی دی جائے۔

۴۔ ہندوستان کی حکومت اسی وقت سے جہاں تک موجودہ حالات میں ممکن ہو نو آبادیات کی حکومت کے اصول پر چلائی جائے۔

(۲) اس کے بعد ٹریڈ یونین کی تحریک کے اتحاد میں کچھ کامیابی ہوئی ہے اور مختلف جماعتیں ایک حد تک آپس میں اتحاد عمل کر رہی ہیں۔

کامل آزادی کا رزولیوشن اور اس کے نتائج

لاہور کانگرس کی جیتی جاگتی تصویر اب تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے یہ قدرتی بات ہے اس لئے کہ وہاں مجھے کچھ دن کے لئے بڑی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی میں ان جذبات پر غور کیا کرتا ہوں جو اس مصروفیت کے زمانے میں میرے دل میں موجزن تھے۔ لاہور کے لوگوں نے بہت بڑے پیانے پر اور بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں جانتا تھا کہ یہ جوش وخروش میری ذات میری ذات کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک اصول کے لئے ہے جس کا مظہر میں ہوں۔ پھر بھی ایک انسان کے لئے یہ بہت بڑی چیز تھی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے ہزارہا آدمیوں کی نظروں میں اور ان کے دلوں میں اس اصول کا مظہر بن جائے۔ مجھ پر عجیب بیخودی اور مسرت کا عالم طاری تھا مگر جو زبردست مسائل اس وقت درپیش تھے ان کے مقابلے میں میری ذاتی جذبات کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ ساری فضا میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑی ہوئی تھی اور موقع کی اہمیت کا خیال چھایا ہوا تھا۔ ساری فضا میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑی ہوئی تھی اور موقع کی اہمیت کا خیال چھایا ہوا تھا۔ ہم لوگ محض اظہار خیال یا نکتہ چینی یا احتجاج کے لئے جمع نہیں ہوئے تھے بلکہ عمل کی دعوت دینے کے لئے جس کے متعلق یقین تھا، کہ یہ سارے ملک کو ہلا دے گا، اور لاکھوں آدمیوں کی زندگی پر اثر ڈالے گا۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آگے چل کر ہمارا اور ہمارے ملک کا کیا انجام ہوگا۔ مگر اس وقت یہ ظاہر تھا کہ ہم کو اور ہمارے عزیزوں کو بڑی کش مکش اور مصیبت کا سامنا ہے۔ اس خیال نے ہمارے جوش وخروش میں ایک سنجیدگی کی شان پیدا کر دی تھی اور ہم اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔ ہر ووٹ کے ساتھ ہم آرام و آسائش کو، گھر کی خوشیوں کو اور دوستوں کی صحبت کو خیر باد کہہ رہے تھے اور دن رات کی تنہائی اور جسمانی اور روحانی تکلیف کو دعوت دے رہے تھے۔

کامل آزادی کا اصل رزولیوشن اور آزادی کی عملی تجویز تقریباً متفقہ طور پر پاس ہوگئی۔ ہزاروں میں سے صرف پندرہ بیس آدمیوں نے اس کے خلاف رائے دی۔ البتہ ایک ضمنی مسئلے پر جو ترمیم کی صورت میں پیش ہوا، واقعی ووٹ لینے کی نوبت آئی۔ یہ ترمیم کثرت رائے سے مسترد ہوگئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ رائے شماری کے نتیجے اور اصل رزولیوشن کی منظوری کا اعلان ۳۱ دسمبر کو ٹھیک بارہ بجے رات کو ہوا جب پرانا سال جا رہا تھا اور نیا سال آ رہا تھا۔ یعنی عین اس وقت جب کلکتہ کانگرس کی مقرر کی ہوئی ایک سال کی معیاد ختم ہوئی، نئی پالیسی کا فیصلہ کیا گیا اور لڑائی کی تیاری شروع ہوگئی۔ ریل نے سیٹی دے دی تھی مگر ہمیں ابھی تک یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کب چلے گی اور کیسے چلے گی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ لڑائی کا نقشہ بنائے اور اس پر عمل کرے مگر سب جانتے تھے کہ حقیقی فیصلہ گاندھی جی کے ہاتھ میں ہے۔

لاہور کانگرس میں صوبہ سرحد سے بھی بہت سے لوگ آئے تھے۔ صوبے کے تھوڑے بہت نمائندے کانگرس میں ہمیشہ شریک ہوا کرتے تھے چند سال سے خان عبدالغفار خان بھی آتے تھے اور ہمارے مشوروں میں حصہ لیتے تھے مگر لاہور میں پہلی بار سرحد کے پرجوش نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت کو کل ہندوستان کی سیاسی تحریک سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ ان کے صاف دلوں پر اس کا بہت اثر پڑا، اور وہ اپنے دلوں میں سارے ہندوستان کے ساتھ جنگ آزادی میں شریک ہونے کا احساس لئے ہوئے اور جوش میں بھرے ہوئے لوٹے۔ یہ سیدھے سادے عملی آدمی تھے اور انھیں ہندوستان کے اور صوبوں کے لوگوں کی طرح لفاظی اور سخن سازی نہیں آتی تھی۔ انھوں نے فوراً اپنی تنظیم اور نئے خیالات کی اشاعت شروع کردی۔ انھیں اس کوشش میں کامیابی ہوئی اور سرحد کے مردوں اور عورتوں نے جنھیں ہندوستان کی جنگ آزادی میں سب کے بعد شریک ہونے کا موقع ملا

تھا ۱۹۳۰ء سے اس میں بہت نمایاں اور حیرت انگیز حصہ لیا۔

لاہور کانگرس کے تھوڑے ہی دن بعد، اس کے حکم کے مطابق، میرے والد نے اسمبلی اور کونسلوں کی کانگریسی ممبروں کو ہدایت کی کہ وہ کونسلوں کی ممبر شپ سے استفادے دیں۔ قریب قریب سب نے ایک ساتھ استعفا دیدیا مگر چند حضرات نے انکار کردیا۔ حالانکہ یہ صریحاً اس وعدے کے خلاف تھا جو انھوں نے انتخاب کے وقت کیا تھا۔

ابھی تک ہم مستقبل کی طرف سے مطمئن نہیں تھے۔ باوجود اس جوش وخروش کے جس کا اظہار کانگرس کے اجلاس میں ہوا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ملک ہمارے مجوزہ پروگرام پر کس حد تک عمل کرے گا۔ ہم واپسی کی سب راہیں بند کر کے آگے بڑھے تھے۔ پیچھے ہٹنا ممکن نہ تھا مگر وہ جو منزل ہمارے سامنے تھی وہ بے جانی بے دیکھی منزل تھی۔ اپنی تحریک کا افتتاح کرنے اور ملک کے مزاج کا اندازہ کرنے کے لئے ہم نے ۲۶ جنوری کو ''یوم آزادی'' قرار دیا اور یہ طے کیا کہ اس روز سارے ملک میں آزادی کا عہدہ لیا جائے۔

ہمیں اپنے پروگرام کی کامیابی میں شبہ تھا۔ مگر ہمارے جوش کا یہی تقاضا تھا کہ کوئی موثر عملی قدم اٹھائیں۔ چنانچہ ہم واقعات کی رفتار کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں شروع جنوری میں الہ آباد میں تھا۔ والد زیادہ تر باہر رہتے تھے۔ غالباً اس سال کمبھ کا میلہ تھا اور لاکھوں مردوں عورتوں کے قافلے الہ آباد، جسے یاتری شری پریاگ کہتے ہیں چلے آرہے تھے۔ ان میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ زیادہ تر تو کسان تھے۔ مگر مزدوروں دکانداروں، کاریگروں، تاجروں اور تعلیم یافتہ پیشہ ور لوگوں کی خاصی تعداد تھی۔ اس عظیم الشان مجمع کو قطار در قطار دریا سے آتے جاتے دیکھ کر میں یہ سوچتا تھا کہ اگر ان لوگوں کو سول نافرمانی اور پرامن عملی جدوجہد کی دعوت دیجائے تو ان پر کیا اثر ہوگا۔ ان میں کتنے ہیں جنھیں لاہور کے فیصلوں کا علم

ہے یا ان کی کچھ پروا ہے کتنی عجیب وغریب قوت ہے اس عقیدے میں انھیں ہندوستان کے گوشے گوشے سے گنگا اشنان کے لئے کھینچ لاتا ہے! کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ اس زبردست جوش عمل کا رخ کسی حد تک سیاسی اور معاشی جدوجہد کی طرف پھیر دیں جس میں خود انھیں کی بھلائی ہے؟ یا ان کے دل مذہب کی ظاہری رسموں اور روایتوں سے اس قدر معمور ہیں کہ ان یں دوسرے خیالات کی گنجائش ہی نہیں؟ مجھے خوب معلوم تھا کہ یہ دوسرے خیالات بھی ان کے دلوں میں موجود ہیں اور صدیوں کے سکون اور خاموشی میں ہل چل پیدا کر رہے ہیں۔ انہی دھندلے سے خیالات اور خواہشات کے عام لوگوں میں پھیل جانے کی وجہ سے پچھلے بارہ سال میں یہ شورشیں برپا ہوئیں جنھوں نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں، کہ یہ خیالات دلوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ جن میں قوت کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ مگر پھر بھی مجھے شک تھا اور میرے دل میں بہت سے سوالات اٹھتے تھے جن کا اس وقت کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ خیالات کہاں تک پھیل چکے ہیں؟ ان کے ساتھ کس قدر طاقت ہے منظم عمل اور برداشت کی کتنی قوت ہے؟

بہت سے یاتری ہمارے یہاں بھی آتے تھے۔ ہمارے گھر ایک تیرتھ کے قریب تھا جو ''بہارودوج'' کہلاتا ہے اور جہاں پرانے زمانے میں ایک ابتدائی یونی ورسٹی تھی میلے کے دنوں میں ہمارے یہاں صبح سے شام تک لوگوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ میرے خیال میں ان میں سے اکثر محض اس شوق میں آتے تھے کہ ان مشہور لوگوں کو جن کا نام سنا کرتے ہیں۔ خصوصاً میرے والد کو دیکھ لیں۔ مگر بہت سے سیاسی احساس بھی رکھتے تھے اور کانگرس کے متعلق سوالات کرتے تھے کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے اور اب کیا ہونے والا ہے۔ وہ ہمارے سیاسی نعروں کو جانتے تھے اور دن بھر ہمارا گھر ان نعروں سے گونجتا رہتا تھا۔ پہلے تو میں بیس بیس، پچاس پچاس سو سو آدمیوں کی ٹولیوں سے جو باری باری سے آتی تھیں، دو چار باتیں کرتا تھا مگر

جب دیکھا کہ اس سلسلے کا جاری رکھنا ناممکن ہے تو یہ طریقہ اختیار کیا کہ جو ٹولی آتی اسے چپ چاپ سلام کر لیتا۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو میں نے چاہا کہ چھپ کر بیٹھ رہوں۔ مگر یہ کوشش بالکل بیکار تھی۔ نعروں کی گونج بڑھتی جاتی تھی۔ مکان کے برآمدے ان مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے، اور ہر کھڑکی اور دروازے سے لوگ اندر جھانک رہے تھے۔ گھر والوں کو چلنا پھرنا، کام کرنا، باتیں کرنا، کھانا کھانا دشوار تھا۔ اس سے نہ صرف الجھن بلکہ کوفت ہوتی تھی۔ مگر یہ لوگ کسی طرح نہیں مانتے تھے۔ ان کی آنکھیں پریم کی روشنی سے چمک رہی تھیں۔ صدیوں کے افلاس اور مصیبت کے بوجھ سے دبے ہوئے دل شکر گذاری اور محبت کے دریا بہا رہے تھے اور اس کے بدلے میں انسانی ہمدردی اور دلسوزی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے تھے۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ الفت وعقیدت کے اس سیلاب کو دیکھ کر دل پر عجز اور رعب نہ چھا جائے۔

ان دنوں ہماری ایک دوست ہمارے ہاں ٹھیری ہوئی تھیں۔ ان سے باتیں کرنا مشکل تھا۔ کیونکہ چار چار پانچ پانچ منٹ کے بعد مجھے باہر جا کر ان لوگوں سے جو وہاں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ دو چار باتیں کرنی پڑتی تھیں اور بیچ بیچ میں ان کے شور وغل اور نعروں کی آواز چین نہیں لینے دیتی تھی۔ وہ میری یہ مصیبت دیکھ رہی تھیں اور اس سے لطف اٹھا رہی تھیں اور ان پر ایک حد تک اس ہر دلعزیزی کا رعب پڑ رہا تھا جو وہ میری طرف منسوب کرتی تھیں (حالانکہ اصل میں یہ کشش میرے والد کی تھی اور مجھے ان کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں نے گھیر لیا تھا) وہ یکایک مجھ سے پوچھ بیٹھیں کہ تمہیں یہ اظہار عقیدت پسند نہیں؟ کیا تم اس پر فخر نہیں کرتے؟ مجھے جواب دینے میں تامل ہوا جس سے وہ یہ سمجھیں کہ شاید اس ذاتی سوال سے مجھے حجاب آتا ہے اور معذرت کرنے لگیں۔ حجاب تو مجھے نہیں تھا مگر اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ میں کچھ کھو سا گیا اور اپنے احساسات

پر غور کرنے لگا۔

میرے دل میں اس وقت طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قریب قریب اتفاقی طور پر میں عام لوگوں میں بہت دلعزیز ہو گیا تھا۔ تعلیم یافتہ لوگ بھی میری قدر کرتے تھے اور نوجوان مردوں اور عورتوں کی نظر میں تو میں ہیرو بن گیا تھا اور ایک رومان کیہالے میں گرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میری شان میں گیت گائے جاتے تھے اور عجیب بے سروپا کہانیاں مشہور تھیں۔ میرے مخالف تک میری تعریف کرتے تھے اور مربیانہ انداز میں فرماتے تھے کہ اس شخص میں قابلیت اور خلوص کی کمی نہیں ہے۔

ان سب باتوں سے متاثر نہ ہونا یا تو ولی کا نام یا شیطان کا اور میں دونوں میں سے ایک بھی نہ تھا۔ مجھ پر ان کا بڑا اثر ہوا۔ یعنی ایک فخر و مسرت کا نشہ سا چھا گیا اور میرے دل میں اعتماد نفس اور قوت کا احساس ابھر آیا۔ اپنے آپ کو دوسروں کی نظر سے دیکھنا بہت مشکل کام ہے مگر میرا خیال ہے کہ مجھ میں کسی قدر خودداری اور تحکم پسندی پیدا ہو گئی۔ پھر بھی میں کچھ زیادہ مغرور نہیں تھا، مگر یہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھ سے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اور مجھے اپنی خامیوں کا پورا پورا احساس تھا۔ غالباً مشاہدہ نفس کی عادت کی وجہ سے میرے دماغ کا توازن قائم تھا اور میں بہت سے واقعات پر، جو میری ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ بے لاگ نظر سے غور کر سکتا تھا۔ قومی زندگی کے تجربے سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ہردلعزیزی اکثر برے آدمیوں کو بھی حاصل ہو جاتی ہے اور یہ نیکی یا قابلیت کی لازمی نشانی نہیں ہے اب سوال یہ تھا کہ مجھے یہ ہردلعزیزی اپنی خوبیوں کی وجہ سے حاصل ہے یا اپنی خامیوں کی وجہ سے؟ آخر اس کا راز کیا ہے؟

اس کا سبب ذہنی قابلیت تو ہو نہیں سکتی تھی اس لئے کہ نہ مجھ میں کوئی خاص علمی لیاقت تھی اور نہ علمی لیاقت سے ہردلعزیزی حاصل ہوا کرتی ہے۔ اب رہیں میری

نام نہاد قربانیاں، تو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں سیکڑوں، ہزاروں آدمیوں نے مجھ سے کہیں زیادہ تکلیفیں اٹھائیں یہاں تک کہ اپنی جان و مال ملک پر قربان کر دیا۔ ہیرو یا سورما کی حیثیت سے میری شہرت محض فرضی ہے مجھ میں سورمائی کا جذبہ مطلق نہیں ہے بلکہ لوگ جو ناٹک کا سا رستمانہ انداز اختیار کر لیا کرتے ہیں وہ مجھے ایک احمقانہ حرکت معلوم ہوتی ہے۔ اور رومان تو مجھے چھو بھی نہیں گئی ہے۔ کس قدر جسمانی اور ذہنی جرات مجھ میں ضرور ہے مگر یہ غالباً میرے ذاتی، خاندانی اور قومی غرور اور خودرائی کی عادت پر مبنی ہے جس کی وجہ سے میں دوسروں کے دباؤ سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔

میں نے بہت سوچا مگر اس سوال کا کوئی جواب سمجھ میں نہیں آیا۔ اب میں نے ایک پہلو سے غور کرنا شروع کیا۔ لوگوں کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی، کہ میرے اور میرے والد کے کپڑے دھلنے کے لئے ہر ہفتے پیرس بھیجے جاتے ہیں۔ ہم نے لاکھ تردید کی مگر اس روایت کی شہرت کم نہ ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے بڑھ کر لغو حرکت اور کیا ہو سکتی ہے اور اگر کوئی ریاست کی شان دکھانے کے لئے ایسی فضول خرچی کرے تو وہ اول درجے کی حماقت کے تمغے کا مستحق ہے۔

اس طرح ایک اور روایت مشہور تھی کہ میں اسکول میں شاہزادہ دبلس کے ساتھ ساتھ پڑھتا تھا اور اور جب وہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان آئے تو انھوں نے مجھ سے ملنا چاہا مگر میں جیل میں تھا۔ حالانکہ ان کا ہم جماعت ہونا تو درکنار مجھے آج تک ان سے ملاقات یا گفتگو کرنے کا شرف بھی حاصل نہیں ہوا۔

میں نے کہا کہ میری شہرت یا ہر دلعزیزی اس قسم کی روایتوں پر منحصر ہے ممکن ہے کہ اس کی بنیاد زیادہ مضبوط ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ لوگوں نے اس بنیاد پر امارات اور ریاست کی ان کہانیوں کی عمارت کھڑی کر دی ہے۔ کم سے کم یہ خیال ضرور ہے کہ اعلےٰ طبقے کے لووں سے ملنے جلنے اور عیش و عشرت میں بسر کرنے کا عادی ہوتے

ہوئے میں نے ان سب چیزوں کو ترک کر دیا اور اس بات کی ہندوستانیوں کے دل میں بڑی قدر ہے۔ مگر مجھے یہ شہرت کی کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ میں فاعلی خوبیوں کا انفعالی خوبیوں پر ترجیح دیتا ہوں اور ترک لذات اور قربانی میرے نزدیک بجائے خود کوئی بڑی خوبی نہیں ہے۔ البتہ ایک ذہنی اور روحانی تربیت کی حیثیت سے یہ قابل قدر چیز ہے اور اسی قدر ضروری ہے جیسے ایک ورزشی کے لئے سادہ اور باقاعدہ زندگی بسر کرنا۔ ان لوگوں کے لئے جو بڑے بڑے کاموں میں دخل دیتے ہیں، تکلیف برداشت کرنے اور ہر طرح کی سختیوں کے باوجود مستقل مزاج رہنے کی قوت ناگریز ہے، مگر مجھے رہبانیت کا اصول یعنی زندگی کی نفی کرنا اور اور اس کی لذتوں اور مسرتوں کو ڈر کر چھوڑ دینا ہرگز پسند نہیں۔ میں نے جان بوجھ کر کسی چیز کو جس کی میں واقعی قدر کرتا ہوں ترک نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ انسان کا قدر کا پیمانہ ہی بدل جائے۔

میری دوست نے جو سوال کیا تھا کہ تمہیں لوگوں کے اظہار عقیدت پر فخر ہے یا نہیں اس کا ابھی تک کوئی جواب نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اسے ناپسند کرتا تھا اور اس سے بھاگنا چاہتا تھا مگر اس کی عادت سی پڑ گئی تھی اور جب یہ نہ ہو تو اس کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ غرض دونوں طرح مشکل تھی مگر مجموعی طور پر لوگوں کا یہ جوش میری ایک اندرونی ضرورت کو پورا کرتا تھا۔ یہ خیال کہ میں ان پر اثر ڈال سکتا ہوں اور ان میں عمل کا ولولہ پیدا کر سکتا ہوں، میرے دل میں ان کے دل و دماغ پر حکومت کا احساس پیدا کرتا تھا اور ایک حد تک میری قوت پسندی کو تسکین دیتا تھا۔ دوسری طرف ان لوگوں کو بھی مجھ پر ایک غیر محسوس حکومت حاصل تھی اس لئے کہ ان کے اعتماد اور محبت سے میرے دل کی گہرائیوں میں ایک ہیجان اور میرے جذبات میں ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا۔ باوجود میری انفرادیت پسندی کے کبھی کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ انفرادیت کے بند ٹوٹ گئے ہیں اور میں یہ محسوس کرتا تھا کہ ان غریبوں

کے ساتھ مصیبت کے بھنور میں ڈوب جانا اس سے بہتر ہے کہ میں اکیلا کنارے پر پہنچ جاؤں۔ مگر اصل میں یہ بند اس قدر مضبوط تھے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹتے تھے۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔

غرور کا قاعدہ ہے کہ مٹاپے کی طرح آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے اور انسان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ خوش قسمتی سے دنیا کی سختیاں اسے کم کر دیتی ہیں بلکہ کچل دیتی ہیں۔ گذشتہ (چند سال سے ہم لوگ ہندوستان میں ایسی بہت سی سختیاں اٹھاتے رہے ہیں۔ ''طوفان حوادث'' کے مکتب میں موجوں کے تھپیڑے ہمارے لئے ''سیلسی استاد'' کا کام دیتے رہے ہیں۔

یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ میرے عزیزوں، دوستوں اور رفیقوں کی بہت بڑی تعداد ہے جن کی وجہ سے میری نظر کا توازن اور دماغ کا تناسب قائم رہا۔ عام جلسوں اور میونسپلٹی ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ کے ایڈرسوں سے میرے اعصاب پر بہت زور پڑتا تھا اور مجھے یہ چیزیں مہمل اور اصلیت سے خالی معلوم ہوتی تھیں۔ ان ایڈرسوں کی عبارت اتنی پر تکلف اور مبالغہ آمیز ہوتی تھی اور لوگوں کے چہروں پر اس قدر تقدس اور سنجیدگی برستی تھی کہ بعض اوقات میرا بے اختیار جی چاہتا تھا کہ زور سے قہقہہ لگاؤں، یا زبان نکال دوں، یا سر کے بل کھڑا ہو جاؤں تا کہ اس باوقار مجلس کی گھبراہٹ اور ان کے چہروں کی کیفیت دیکھ کر لطف آئے مگر میری شہرت اور ہندوستان کی قومی زندگی کی متانت اور ثقاہت کے حق میں یہ اچھا ہوا کہ میں نے اس قسم کی کوئی پاگل پن کی حرکت نہیں کی اور عموماً ادب قاعدے کا لحاظ رکھا مگر کبھی کبھی کسی جلسے میں یا زیادہ تر جلوس میں نے عاجز آ کر اپنے جذبات کا اظہار بھی کر دیا۔ کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ میرے اعزاز میں جلوس نکالا گیا اور میں اپنی بیوی یا کسی اور شخص کو بگھی یا موٹر میں بٹھا کر اور خود مجمعے میں گھس کر غائب ہو گیا۔

عام مجمعوں میں ہمیشہ جذبات کو روکنے اور آداب مجلس کا خیال رکھنے سے

طبیعت پر بہت زور پڑتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ انسان ایسے موقعوں پر کچھ کھری اور روٹھی ہوئی سے شکل بنالیتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ہندوؤں کے ایک رسالے میں مجھے ہندو بیوہ سے تشبیہ دی گئی تھی، اگرچہ میں پرانی وضع کی ہندو بیواؤں کو بہت قابل قدر سمجھتا ہوں، مگر سچ پوچھئے تو اس بھبتی سے مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ مضمون لکھنے والے کو بہ ظاہر میری تعریف مقصود تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھے میں حلم، صبر اور ایثار کی صفات موجود ہیں اور میں افسردگی اور اداسی کے ساتھ دن رات اپنے فرض کے انجام دینے میں مصروف رہتا ہوں۔ حالانکہ میں اپنے خیال میں خاصا تیز، جنگجو اور ہنسنے ہنسانے والا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہندو بیوائیں بھی ایسی ہی ہو جائیں۔ ایک بار گاندھی جی نے ایک شخص سے کہا تھا کہ اگر ان میں ظرافت کا مادہ نہ ہوتا تو وہ خودکشی کر لیتے۔ میں اس حد تک تو نہیں جا سکتا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر کچھ لوگوں کی بدولت زندگی میں ظرافت کی چاشنی نہ ہوتی تو مجھے زندگی اجیرن ہو جاتی۔

میرے خاندان والے اور بے تکلف دوست میری ہر دلعزیزی کی اور ان شاندار ایڈریسوں کی ہنسی اڑاتے تھے جو میرے سامنے پیش ہوا کرتے تھے اور جن میں (ہندوستان کے دستور کے مطابق) نہایت رنگین بیانی اور مبالغے سے کام لیا جاتا تھا، میری بیوی اور بہنیں چھانٹ چھانٹ کر پر تکلف اور شاندار الفاظ اور خطاب جو قومی تحریک کے لیڈروں کے لئے وضع کئے گئے تھے بے ادبی سے ہر وقت میرے لئے استعمال کیا کرتی تھیں۔ کبھی مجھے ''بھارت بھوشن'' (گوہر تابان ہند) کہہ کر پکارتی تھیں، کبھی ''تیاگ مورتی'' (ایثار مجسم) کہتی تھیں۔ اس طرح کی چہل سے دل بہل جاتا تھا اور پر وقار جلسوں میں متین اور سنجیدہ بن کر بیٹھنے سے جو بوجھ طبیعت پر پڑتا تھا وہ ہلکا ہو جاتا تھا۔ میری چھوٹی سی اندرا بھی ان شرارتوں میں شریک ہو جاتی تھی۔ صرف میری والدہ میرے ساتھ سنجیدگی کا برتاؤ کرتی تھیں اور انھیں

یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ ان کے پیارے بیٹے پر فقرے کسے جائیں۔ والدان باتوں سے محفوظ ہوتے تھے۔ انھیں چپ چاپ دلجوئی اور ہمدردی کرنے کا ڈھب خوب آتا تھا۔

مگر بڑے بڑے مجمعوں کے نعرے۔ بے لطف اور پریشان کن جلسے، اور سیاسی زندگی کے ہنگامے میرے قلب کی سطح کو چھوتے ہوئے گذر جاتے تھے اگرچہ کبھی کبھی ان کی خلش دیر تک محسوس ہوتی تھی۔ اصلی کش مکش میرے نفس کے اندر تھی۔ یہ خیالات کی، خواہشات کی، متضاد عقیدوں کی، داخلی نیم شعوری عناصر اور خارجی واقعات کی کش مکش تھی۔ دل کی گہرائیوں میں جس چیز کی طلب تھی وہ کہیں نہیں ملتی تھی۔ میرا نفس ایک میدان جنگ بن گیا تھا جس میں مختلف قوتیں نبرد آزما تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ کس طرح اس کش مکش سے نجات ملے۔ توازن اور ہم آہنگی کی جستجو مجھے میدان عمل میں کھینچ لائی۔ عمل سے مجھے کسی قدر سکون حاصل ہوا۔ خارجی جنگ وجدل سے داخلی کش مکش کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

آخر میں جیل میں بیٹھا یہ رام کہانی کیوں لکھ رہا ہوں؟ بات یہ ہے کہ قید ہو یا آزادی، جستجو اسی ایک چیز کی ہے۔ میں اپنے پرانے احساسات اور تجربات اس امید پر قلم بند کر رہا ہوں کہ شاید اسی سے کچھ اطمینان قلب میسر آجائے۔

سول نافرمانی کا آغاز

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو یوم آزادی منایا گیا اور اس سے ہمیں دفعتاً یہ اندازہ ہو اکہ ملک میں کس قدر جوش اور خلوص ہے۔ ہندوستانی کے ہر حصے میں بڑے بڑے مجمعوں کو نہایت پر امن اور پر اثر طریقے سے آزادی کا عہد کرتے ہوئے دیکھنا نہایت ہی شاندار نظارہ تھا، گاندھی جی کو جس محرک کی ضرورت تھی وہ حاصل ہو گیا وہ لوگوں کی نبض خوب پہچانتے تھے۔ انھوں نے اندازہ کر لیا کہ اب کام شروع کرنے وقت آ گیا ہے۔ اب واقعات کا سلسلہ بڑی تیزی سے شروع ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ٹانک کے پردے ایک ایک کر کے اٹھ رہے ہیں اور رفتہ رفتہ آخری سین کی باری آ رہی ہے۔

جب سول نافرمانی کا وقت قریب آیا اور ساری فضا میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑنے لگی تو ہمیں ۲۲۔۱۹۲۱ء کے واقعات اور چوراچوری کے ہنگامے کے بعد تحریک کا ملتوی کیا جانا یاد آ گیا۔ اب ملک زیادہ منضبط ہو چکا تھا اور لوگ لڑائی کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ وہ طریق کار سے کسی حد تک واقف ہو گئے تھے اور گاندھی جی کہ نقطہ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات تھی کہ لوگوں کو اس کا پورا پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ عدم تشدد پر بہت سختی سے عمل کرنا چاہتے ہیں، اب سے دس سال پہلے غالباً لوگوں کو اس میں کچھ شک تھا، مگر اب شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش نہ تھی، پھر بھی گاندھی جی کو کیونکہ یقین ہو سکتا تھا کہ ملک کسی حصے میں بھی گنجائش نہ تھی۔ پھر بھی گاندھی جی کو کیونکر یقین ہو سکتا تھا کہ ملک کے کسی حصے میں بھی لوگ خود بخود یا کسی کے اکسانے سے تشدد کے مرتکب نہیں ہوں گے اگر ایسا کوئی واقعہ ہوا تو اس کا سول نافرمانی کی تحریک پر کیا اثر پڑے گا؟ کیا پہلے کی طرح اب بھی تحریک یکا یک بند کر دی جائے گی؟ ان باتوں کو سوچ کر بڑی الجھن ہوتی تھی۔

غالباً گاندھی جی بھی اپنے طور پر اس پر غور کر رہے تھے مگر جہاں مجھے ان کی گفتگو

سے اندازہ ہوا ان کو جو مشکل درپیش تھی وہ کچھ اور تھی۔

ان کے نزدیک معاملات کی اصلاح کے لئے صرف ایک ہی صحیح طریقہ ہو سکتا تھا۔ اور وہ عدم تشدد کا طریقہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر اس سے مناسب طور پر کام لیا جائے تو اس میں ہرگز ناکامیابی نہیں ہو سکتی، اگر کوئی یہ کہے، کہ اس طریقہ کے کامیاب ہونے کے لئے ایک مناسب فضا کی ضرورت ہے اور جب تک واقعات سازگار نہ ہوں اس سے کام نہیں لینا چاہئے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عدم تشدد کا طریقہ ہر موقع پر کام نہیں دے سکتا یعنی یہ کوئی عالم گیر اور حکمی طریقہ عمل نہیں ہے۔ اس نتیجے کا گاندھی جی کسی طرح نہیں مان سکتے تھے۔ اس لئے کہ وہ اسے عالمگیر اور حکمی طریقہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کے نزدیک نامناسب حالات میں بلکہ تشدد اور بدامنی کی فضا میں بھی یہ طریقہ کام دے سکتا تھا۔ مختلف حالات میں اس کی صورت تو بدلی جا سکتی ہے مگر اسے چھوڑنا ممکن نہیں کیونکہ یہ اس کی ناکامیابی کا اعتراف ہوگا۔

غالباً وہ کچھ اس قسم کی باتیں سوچ رہے تھے مگر میں ان کے خیالات کا اندازہ یقینی طور پر نہیں کر سکتا۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ ان کا خیال کچھ خفیف سا بدلا ہے اور سول نافرمانی کے شروع ہونے کے بعد اگر اتفاقی طور پر ایک آدھ تشدد کا واقعہ پیش آجائے تو وہ تحریک کا بند کرنا ضروری نہیں سمجھیں گے۔ البتہ اگر تشدد خود تحریک بن جائے تو پھر وہ پرامن سول نافرمانی نہیں رہے گی اور اس کی جدوجہد کو روکنا یا بدلنا پڑے گا۔ اس بات سے ہم لوگوں کو بہت کچھ تسکین ہوئی۔ اب سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ تحریک شروع کیونکہ کی جائے؟ سول نافرمانی کی کونسی صورت اختیار کی جائے جو موثر بھی ہو، قرین مصلحت بھی ہو اور لوگوں میں مقبول بھی ہو سکے؟ مہاتما جی نے ایک ذرا سے اشارے سے اس مشکل کو حل کر دیا۔

نمک کا لفظ یکا یک ایک جادو کا منتر بن گیا۔ گاندھی جی کی رائے تھی کہ نمک

کے محصول کی ادائیگی بند کر دی جائے اور نمک سازی کے قوانین کے خلاف ورزی کی جائے۔ ہم لوگ یہ سن کر چکر میں آ گئے کہ کہاں قومی جنگ اور کہاں نمک۔ ایک اور عجیب بات یہ ہوئی کہ گاندھی جی نے اپنی گیارہ شرطوں کا اعلان کر دیا۔ ہماری سمجھ میں نے آیا کہ جب ہم آزادی کا مطالبہ کر رہے ہے تو چند سیاسی اور سماجی اصلاحوں کی (گو وہ اپنی جگہ پر کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں) فہرست بنانے کے کیا معنی؟ کیا گاندھی جی کے نزدیک اس کا وہی مفہوم تھا جو ہمارے ذہن میں تھا یا وہ اس کے کچھ اور معنی سمجھتے تھے؟ مگر اب بحث اور گفتگو کا موقع نہ تھا اس لئے کہ واقعات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا ادھر ہندوستان میں ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سیاسی تحریک زور پکڑ گئی تھی اور ادھر (اگر چہ ہمیں اس وقت اس کا احساس نہ تھا) ساری دنیا میں کساد بازاری نے ایک ہل چل مچا رکھی تھی۔ چیزوں کی قیمتیں گر رہی تھیں اور گو شہر والے اسے خوش حالی کی علامت سمجھ کر خوش ہو رہے تھے مگر کسان بہت ڈر رہے تھے۔

گاندھی جی نے وائسرائے سے خط و کتابت کرنے کے بعد سابرمتی کے آشرم سے ڈنڈی کی طرف ''نمک کا دھاوا'' شروع کر دیا۔ لوگ یاتریوں کی اس فوج کے کوچ کے حالات کو روز بروز غور سے دیکھ رہے تھے۔ شروع کر دیا۔ لوگ یاتریوں کی اس فوج کے کوچ کے حالات کو روز بروز غور سے دیکھ رہے تھے۔ اور ملک کو جوش بڑھتا جاتا تھا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ احمد آباد میں کیا گیا کہ لڑائی کیونکر قریب شروع ہو گئی تھی مکمل تیاریاں کی جائیں۔ ہمارا سپہ سالار موجود نہ تھا اس لئے کہ وہ اپنی چھوٹی فوج کو لئے ہوئے پا پیادہ سمندر کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اس کی تدبیریں سوچیں کہ جب ہم لوگ گرفتار ہو جائیں تو کیا کرنا چاہئے اور پریزیڈنٹ کو بہت وسیع اختیارات دئے گئے کہ اگر کمیٹی کا اجلاس نہ ہو سکے تو وہ اس کی طرف سے ورکنگ کمیٹی کے گرفتار شدہ ممبروں کی جگہ دوسرے ممبر نامزد کر دے اور اگر خود گرفتار ہو جائے تو اپنا

جانشین نامزد کر کے اپنے اختیارات اس کے سپرد کرے۔ اسی قسم کے اختیارات ہر صوبہ دار اور مقامی کمیٹی نے بھی اپنے اپنے پریزیڈنٹ کو دے دئے۔

اس طرح وہ ''ڈکٹیٹروں'' کا سلسلہ شروع ہوا جو کانگرس کی طرف سے اس تحریک کو چلاتا رہا وزیر ہند، وائسرائے اور گورنر اس پر بہت کراہت کا اظہار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو کانگرس کتنی بری اور ذلیل ہے کہ وہ ڈکٹیٹر کی حکومت کی قائل ہے! ظاہر ہے کہ یہ لوگ خود تو دل و جان سے جمہوریت کا کلمہ پڑھتے تھے! کبھی کبھی ہندوستان کے اعتدال ہو سکتی تھی۔ ادھر ہندوستان میں استبدار اور مطلق العنانی کی حکومت تھی۔ آرڈیننس کے حکمراں بڑی دینداری اور پرہیز گاری کے انداز سے جمہوریت کا وعظ کہہ رہے تھے، حالانکہ شورش کا زمانہ تو ایک طرف، معمولی حالات میں بھی ہندوستان میں جمہوریت کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی۔ یہ سچ ہے کہ برطانوی حکومت کے لئے ہندوستان میں اپنی قوت اور اغراض کی حفاظت کرنا اور اپنے مخالفوں کو دبانا ایک قدرتی بات تھی مگر اس کا یہ دعوی کہ وہ جمہوری طریقے سے حکومت کر رہی ہے اس قابل ہے کہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہے اور آئندہ نسلیں اس کی داد دیں اور اس سے عبرت حاصل کریں۔

کانگرس کو ایسے موقع کا سامنا تھا جس میں اس کا معمولی طریقے سے کام کرنا ناممکن تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ وہ ایک خلاف قانون جماعت قرار دے دی جائے گی اور اس کی کمیٹیاں کھلم کھلا اپنا جلسہ نہیں کر سکیں گی۔ خفیہ کاروائی کو ہم لوگ پسند نہیں کرتے تھے اس لئے کہ ہم اپنی تحریک کو علانیہ چلانا چاہتے تھے تا کہ ہمارا وقار اور اثر لوگوں کے دلوں میں قائم رہے اور پھر خفیہ کاروائی سے کام بھی نہیں چل سکتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ ہماری مرکزی جماعت اور مقامی کمیٹیوں کے تمام لیڈر قید ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں تحریک کو کون چلاتا؟ ہمارے لئے اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں تھا کہ لڑنے والی فوج کی طرح ایسا انتظام کر دیں کہ جب پرانے

سپہ سالار نہ رہیں تو ان کی جگہ نئے لوگ مقرر ہو جائیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم میدان جنگ میں بیٹھ کر کمیٹیاں کرتے رہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوا بھی مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ساری کمیٹی ایک ساتھ گرفتار کر لی گئی اور یہی ہمارا مقصد بھی تھا۔ ہمیں یہ آسانی نہیں تھی کہ ہمارا فوج کا جنرل اسٹاف محاذ جنگ کے پیچھے اطمینان سے بیٹھا ہو یا غیر فوجی مجلس وزرا اور بھی زیادہ محفوظ مقام پر اپنا اجلاس کر رہی ہو۔ ہماری لڑائی اس قسم کی تھی کہ ہمارے جنرل اسٹاف اور مجلس وزرا کو عین میدان جنگ میں سب سے آگے رہنا پڑتا تھا اور وہ سب شروع ہی میں گرفتار ہو جاتے تھے اور پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہم نے اپنے ''ڈکٹیٹروں'' کو اختیارات کیا دئے تھے؟ ان کو یہ عزت ضرور حاصل تھی کہ وہ قوم کے عزم جنگ کے مظہر بن کر آگے بڑھیں۔ ان کا اختیار بس یہیں تک محدود تھا کہ خود اپنے حکم سے جیل خانے چلے جائیں۔ ان کا حکم اسی وقت تک چلتا تھا جب تک وہ کمیٹیاں جن کے وہ نمائندے تھے صریحی مجبوری کی وجہ سے اپنا اجلاس نہ کر سکیں۔ جہاں کہیں کمیٹی کا اجلاس ہو سکتا تھا ''ڈکٹیٹر'' مقرر کیا جائے کسی بنیادی معاملے یا مسئلے میں دخل نہیں دے سکتا تھا بلکہ اسکے کے اختیارات صرف تحریک کے جزوی پہلوؤں تک محدود تھے۔ اصل میں کانگرس کی ''ڈکٹیٹری'' جیل خانے کی ایک منزل تھی اور جو لوگ گرفتار ہوتے جاتے تھے ان کی جگہ نئے آدمی آتے جاتے تھے۔

غرض احمد آباد میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اپنی تیاریوں کی تکمیل کی اور ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا، کیونکہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم پھر کبھی ایک جگہ جمع ہو سکیں گے یا نہیں۔ اس کے بعد ہم سب اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے تا کہ مقامی انتظامات کی تکمیل کریں یا آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی نئی ہدایات کے مطابق بقول سروجنی نائیڈو کے جیل جانے کے لئے بستر باندھ رکھیں۔

احمد آباد سے واپسی میں، میں اور میرے والد گاندھی جی سے ملنے گئے۔ وہ

اپنے یاتریوں کی فوج کے ساتھ جمبوسر کے مقام پر تھے۔ہم چند گھنٹے ان کے ساتھ رہے،اور ہمارے سامنے ہی وہ نمک کے سمندر کے سفر پر روانہ ہو گئے۔آخری منظر جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا، کہ وہ ہاتھ میں لاٹھی لیے ہوئے اپنے پیروؤں کے آگے آگے مضبوطی سے قدم رکھتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ان کے چہرے سے امن اور سکون،مگر اسی کے ساتھ استقلال،اور بے خوفی ظاہر ہو رہی ہے۔بڑا پر اثر منظر تھا۔

جمبوسر میں والد نے گاندھی جی کے مشورے سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے آلہ آباد والے گھر کو قوم کی خدمت میں پیش کر دیں گے،اور اس کا نام سوراج بھون رکھیں گے،الہ آباد واپس آ کر انہوں نے اس کا اعلان کر دیا۔اور مکان کو کانگرس کے حوالے کر دیا۔اس وسیع عمارت کا ایک حصہ ہسپتال بنا دیا گیا۔اس وقت وہ قانونی ضابطوں کی تکمیل نہیں کر سکتے تھے۔ڈیڑھ سال کے بعد میں نے ان کی وصیت کے مطابق باقاعدہ وقف قائم کر دیا۔

اپریل کا مہینہ آ گیا۔گاندھی جی سمندر کے قریب پہنچ چکے تھے۔اور ہم ان کے حکم کے منتظر تھے، کہ نمک سازی کے قوانین کی خلاف ورزی کر کے سول نافرمانی کا آغاز کر دیں گے۔کئی مہینہ سے ہم والنٹیر وں کو قواعد کرا رہے تھے۔کملا اور کرشنا (میری بیوی اور بہن) بھی والنٹیر وں میں داخل ہو گئی تھیں،ظاہر ہے کہ ان والنٹیر وں کے پاس ہتھیار کیا چھڑی تک نہ تھی۔انھیں قواعد کرانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے کام میں مشاق ہو جائیں۔اور بڑے بڑے مجمعوں کا انتظام کر سکیں۔اپریل قومی ہفتہ کا پہلا دن تھا،جو 1919 کے واقعات (یعنی ستیاگرہ کے دن سے لے کر جلیانوالہ باغ کے دن تک) کی یادگار میں منایا جاتا ہے۔اس روز گاندھی جی نے ڈانڈی کے ساحل پر نمک سازی کے قانون کی خلاف ورزی شروع کی،اور تین چار دن کے بعد کانگرس کی شاخوں کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے اپنے حلقے میں سول نافرمانی شروع کر دیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے کھٹکا دبا کر ایک مشین چلا دی ہے۔ سارے ہندوستان کے ایک ایک شہر اور ایک، ایک گاؤں میں نمک بنانے کا چرچا تھا۔ اور اس کے عجیب، عجیب طریقے اختیار کیے جاتے تھے، ہم بالکل نہیں جانتے تھے کہ نمک کیسے بنایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم نے کتابوں سے اس کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اشتہار کے ذریعے سے لوگوں کو ہدایات دیں، اور کڑھاؤ وغیرہ جمع کیے۔ غرض کسی نہ کسی طرح ایک نقصان دہ کڑوی چیز تیار کر لی، جسے ہم بڑے فخر سے لیے پھرتے تھے، اور کبھی، کبھی بڑی قیمتوں پر نیلام کرتے تھے، اس سے کچھ مطلب نہ تھا کہ نمک اچھا ہے یا برا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ نمک کے تکلیف دہ قوانین کی خلاف ورزی کی جائے۔ ہمارا نمک برا سہی، مگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ لوگوں کے جوش کو بڑھتے ہوئے، اور نمک سازی کو آگ کی طرح پھیلتے ہوئے دیکھ کر ہمیں اس بات پر شرمندگی ہوئی کہ جب گاندھی جی نے پہلی بار یہ تجویز پیش کی تھی، تو ہم نے اس پر اعتراض کیا تھا۔ ہمیں حیرت تھی کہ اس شخص کو عام لوگوں پر اثر ڈالنے اور منظم طریقے سے کام کرنے کا عجیب وغریب ڈھب آتا تھا۔

۱۴، اپریل کو میں رائے پور (صوبہ متوسط) میں جہاں میں کانفرنس میں شریک ہونے جا رہا تھا، ریل سے اترتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اسی روز جیل خانے کے اندر میرے مقدمے کی تحقیقات ہوئی، اور نمک سازی کے قانون کے مطابق مجھے چھ مہینے کی سزا دی گئی۔ مجھے پہلے ہی گرفتاری کی توقع تھی۔ اس لئے میں نے (ان نئے اختیارات کی رو سے جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے دیے تھے) اپنی غیر موجودگی میں گاندھی جی کو کانگرس کا پریذیڈنٹ نامزد کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ انکار کر دیں گے، اس لئے دوسرا نام اپنے والد کا تجویز کیا تھا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، گاندھی جی راضی نہیں ہوئے، اور والد کانگرس کے قائم مقام پریذیڈنٹ ہو گئے۔ ان کی صحت بہت خراب تھی، مگر اس کے باوجود انہوں نے تحریک کو بڑے زور شور سے

چلایا، اور پہلے چند مہینوں میں ان کی زبردست رہنمائی اور سختی سے انضباط قائم رکھنے کی وجہ سے تحریک کو بہت فائدہ پہنچا۔ مگر ان کی جو تھوڑی بہت صحت باقی تھی برباد ہو گئی۔

ان دنوں ہر طرف سے بڑی ہیجان انگیز خبریں آیا کرتی تھیں جلوس نکلتے تھے، لاٹھیاں اور گولیاں برسائی جاتی تھیں، مشہور لیڈروں کی گرفتاری کی وجہ سے اکثر ہڑتال ہوتی رہتی تھی اور خاص خاص واقعات کی یادگار میں پشاور کا دن، گڑھ والیوں کا دن وغیرہ منائے جاتے تھے۔ بدیسی کپڑے اور برطانیہ کے ہر قسم کے مال کا قریب قریب مکمل بائیکاٹ ہو گیا تھا۔ جب میں نے یہ سنا کہ میری بوڑھی ماں اور بہنیں گرمیوں کی دھوپ میں بدیسی کپڑے کی دوکانوں کے سامنے پکٹنگ کے لئے کھڑی رہتی ہیں تو مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اور کملا نے صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر کیا۔ اس نے الہ آباد شہر اور ضلع کی تحریک میں اس مستعدی اور استقلال سے کام کیا کہ جو اپنے خیال میں اسے برسوں سے جانتا تھا، حیرت میں رہ گیا۔ وہ اپنی بیماری کو بھول گئی اور دن دن بھر دھوپ میں دوڑتی پھرتی تھی، اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ تنظیم کی غیر معمولی قابلیت رکھتی ہے۔ مجھے جیل خانے میں ان باتوں کی مجمل سی خبریں پہنچتی تھیں۔ آگے چل کر جب میرے والد بھی جیل میں میرے پاس آ گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ کملا کے کام کے خصوصاً اس کی تنظیمی قابلیت کے کس قدر مداح ہیں۔ وہ اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے کہ والدہ اور لڑکیاں دھوپ میں دوڑتی پھریں۔ مگر ایک آدھ بار سمجھانے کے سوا انھوں نے اس معاملے میں دخل نہیں دیا۔

سب سے بڑی خبر ہو اس ابتدائی زمانے میں ہم تک پہنچی وہ ان واقعات کی تھی جو ۲۳ اپریل کو پشاور میں اور اسکے بعد سارے سرحدی صوبے میں پیش آئے۔ ہندوستان میں کہیں بھی لوگ مشین گن کی گولہ باری کا مقابلہ اس قدر انضباط امن اور

بہادری سے کرتے تب بھی سارے ملک میں جوش پھیل جاتا۔ سرحدی صوبے میں یہ چیز اور بھی اہمیت رکھتی تھی اس لئے کہ پٹھان بہادری میں تو بہت مشہور واقعہ پیش آیا کہ گڑھ والی سپاہیوں نے شہر والوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کچھ تو اس وجہ سے انکار کیا کہا نھیں مجمع سے ہمدردی تھی۔ مگر ہمدردی کا جذبہ بھی عموماً اس کے لئے کافی نہیں ہوتا کہ سپاہی اتنی بڑی رجات کرے کہ اپنے افسر کے حکم کی تعمیل سے انکار کیا کہ انھیں مجمع سے ہمدردی تھی۔ مگر ہمدردی کا جذبہ بھی عموماً اس کے لئے کافی نہیں ہوتا کہ اس نتیجہ کیا ہوگا۔ غالباً گڑھ والی (بعض اور رجمنٹوں کی طرح جن کی عدول حکمی مشہور نہیں ہونے پائی) اس دھوکے میں تھے کہ برطانوی حکومت ختم ہو رہی ہے۔ سپاہی کو اپنی خواہش اور ہمدردی کے مطابق کام کرنے کی جرات اسی وقت ہوسکتی ہے جب اس کے دل میں اس قسم کا خیال بیٹھ جائے۔ غالباً ملک کی عام بے چینی اور سول نافرمانی کی وجہ سے چند روز یا چند ہفتے کے لئے بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ برطانوی حکومت کے خاتمہ کے دن قریب آ گئے ہیں اور اس کا اثر ہندوستانی فوج کے کچھ حصہ پر پڑا۔ بہت جلد یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مستقبل قریب میں اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے اس لئے اس کے بعد فوج میں عدول احتیاط برتی جانے لگی۔

اس زمانے میں بہت سے عجیب واقعات پیش آئے مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز وہ خدمت تھی جو عورتوں نے قومی تحریک میں انجام دی۔ وہ بہت بڑی تعداد میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر نکل آئیں اور اگرچہ انھیں قومی کاموں سے پہلے کبھی سابقہ نہیں، پڑا تھا، انھوں نے اس لڑائی میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا۔ بدیسی کپڑے اور شراب کی دکانوں کی پکٹنگ انھوں نے اپنے لئے مخصوص کر لی۔ بڑے بڑے جلوس جن میں صرف عورتیں ہی عورتیں ہوتی تھیں تمما شہروں میں نکلتے تھے اور عام طور پر عورتیں مردوں سے زیادہ ثابت قدمی کا ثبوت دیتی تھیں۔ ان

میں سے اکثر صوبوں میں اور مقامی حلقوں میں ''ڈکٹیٹر'' بھی بنائی گئیں۔

تھوڑے دن میں نمک سازی کے قانون کیخلاف ورزی کے علاوہ سول نافرمانی کے دوسرے طریقے بھی اختیار کئے جانے لگے۔ اس میں اس وجہ سے اور بھی آسانی ہوگئی کہ وائسرائے نے کئی آرڈیننس نافذ کئے جن کی رو سے مختلف قسم کے کاموں کی ممانعت کردی گئی۔ جوں جوں آرڈیننس میں ممانت ہو وہی کام کئے جائیں۔ کانگرس اور قوم کی جدوجہد روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور جب ایک آرڈیننس سے کام نہیں چلتا تھا تو وائسرائے کو دوسرا آرڈیننس جاری کرنا پڑتا تھا۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے بہت سے ممبر گرفتار ہو چکے تھے مگر انکی جگہ نئے ممبر مقرر ہوگئے تھے اور حکومت کے ہر آرڈیننس کے جواب میں ورکنگ کمیٹی ایک نیا رزولیوشن پاس کرتی تھی جس میں لوگوں کو ہدایتیں دی جاتی تھیں کہ آرڈیننس کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہئے۔ ان ہدایات پر سارے ملک میں حیرت انگیز ہم آہنگی کے ساتھ عمل ہو رہا تھا۔ البتہ اخباروں کی اشاعت کے متعلق اس کی ہدایات کی تعمیل نہیں کی گئی۔

جب پریس آرڈیننس کی رو سے اخباروں پر مزید سختیاں عائد کی گئیں اور ان سے ضمانت مانگی جانے لگی تو ورکنگ کمیٹی نے قومیت پسند اخباروں کو ہدایت کی کہ وہ ضمانت داخل نہ کریں بلکہ اخبار کی اشاعت موقوف کردیں۔ یہ اخباروں کے لئے بڑی ٹیڑھی کھیر تھی کیونکہ اس زمانے میں اخباروں کی مانگ خاص طور پر بڑھ گئی تھی۔ پھر بھی بہت سے اخباروں نے جن میں اعتدال پسند اخبار شامل نہ تھے اپنی اشاعت بند کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں مگر ان اخباروں سے زیادہ دن تک صبر نہیں ہوسکا اس لئے کہ ایک تو اشاعت کے بڑھنے کا لالچ تھا اور دوسرے ان سے یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ ان اعتدال پسند حریف ان کے کاروبار پر قبضہ کرلیں۔ چنانچہ ان میں سے اکثر نے اپنی اشاعت دوبارہ شروع کردی۔

۵ مئی کو گاندھی جی گرفتار ہو گئے۔ ان کی گرفتاری کے بعد مغربی ساحل پر نمک سازی کے مرکزوں پر بہت بڑے پیمانے پر حملے شروع کر دئے گئے۔ ان حملوں میں پولیس کی وحشیانہ بے رحمی کے بہت افسوسناک واقعات رونما ہوئے۔ بمبئی ان دنوں تحریک کا مرکز تھا اور وہاں بڑی زبردست ہڑتالیں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے جلوس نکلتے تھے اور آئے دن لاٹھی چارج ہوا کرتے تھے۔ لاٹھی چارج کے مجروحوں کی خبر گیری کے لئے کئی ہنگامی ہسپتال قائم ہو گئے۔ بمبئی نے اس زمانے میں بہت نمایاں کام کئے اور بڑا شہر ہونے کی وجہ سے ان کاموں کو شہرت بھی خوب حاصل ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے شہروں اور دیہات میں بھی اس قدر اہم واقعات رونما ہوئے مگر مشہور نہ ہو سکے۔

جون کے نصف آخر میں میرے والد بمبئی گئے اور والدہ اور کملا کو بھی ساتھ لے گئے۔ ان کا نہایت شاندار استقبال ہوا اور ان کے قیام کے زمانے میں پولیس نے بہت شدید لاٹھی چارج کئے۔ لاٹھی چارج بمبئی میں روزمرہ کی چیز ہو گئی تھی۔ کوئی دو ہفتے کے بعد وہاں ایک رات کو لوگوں کو بڑی سخت آزمائش کا سامنا ہوا۔ مالوی جی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر ایک بہت بڑے جلوس کو لے کر نکلے۔ پولیس نے ان کا راستہ روک دیا مگر وہ رات بھر اس کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

بمبئی سے واپس آنے کے بعد ۳۰ جون کو والد اور ان کے ساتھ سید محمود گرفتار کر لئے گئے اس لئے کہ ورکنگ کمیٹی خلاف قانون قرار دی جا چکی تھی اور والد اس کے قائم مقام پریزیڈنٹ اور سید محمود اس کے سکرٹری تھے۔ دونوں کو چھ چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔ میرے والد کی گرفتاری کی وجہ غالباً یہ تھی کہ انھوں نے ایک بیان شائع کیا تھا جسمیں یہ بتایا گیا تھا کہ جب فوج بالکل قانون کے مطابق تھا اور اس میں صرف اس بات کی تصریح کی گئی تھی کہ ہندوستان کا موجودہ برطانوی قانون اس معاملے کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اس کے باوجود یہ بیان اشتعال انگیز اور خطرناک قرار دیا

گیا۔

بمبئی جانے کی وجہ سے میرے والد کی صحت پر بہت بار پڑا۔ وہ صبح تڑکے سے لے کر رات گئے تک ہر وقت مصروف رہتے تھے اور ہر اہم معاملے کے فیصلے کی ذمہ داری انھیں پر تھی۔ یوں تو ان کی طبیعت ایک عرصے سے ناساز تھی مگر بمبئی سے لوٹنے کے بعد بہت ہی مضمحل ہو گئے تھے۔ اور ڈاکٹروں کی سخت تاکید سے انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ کامل آرام کریں گے۔ انھوں نے مسوری جانے کا انتظام کیا اور سفر کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ مگر جس روز انکی روانگی تھی اس سے ایک دن پہلے وہ یکا یک نینی سنٹرل جیل میں ہماری بارک میں پہنچ گئے۔

نینی جیل میں

اب میں کوئی سات برس کے بعد قید ہوا تھا اور جیل کی زندگی کی یاد میرے دل سے کچھ مٹ گئی تھی۔ اس بار میں نینی سنٹرل جیل میں بھیجا گیا تھا جو اس صوبے کے بڑے جیل خانوں میں سے ہے، اور سب قیدیوں سے الگ رکھا گیا، جو میرے لئے بالکل نیا تجربہ تھا۔ میرا احاطہ جیل کے بڑے احاطے سے، جس میں سب ملا کر بائیس تیئس سو آدمی رہتے تھے، الگ تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گول احاطہ تھا جس کا قطر تقریباً سو فٹ ہوگا اور دیوار کوئی پندرہ فٹ اونچی ہوگی۔ اس کے بیچ میں ایک بھدی بدنما عمارت تھی اور اسمیں چار کوٹھریاں تھیں، مجھے ان میں سے دو کوٹھریاں جن کے بیچ میں دروازہ تھا دی گئیں، ایک رہنے کے لئے اور دوسری غسل خانے اور پاخانے کے طور پر استعمال کرنے کے لئے۔ باقی دو کوٹھریاں کچھ عرصے تک خالی رہیں۔

اس مصروفیت اور ہل چل کی زندگی کے بعد جو میں نے پچھلے دنوں گذاری تھی میں تنہائی اور اداسی محسوس کر رہا تھا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اور دو تین دن تک نیند بھر سوتا رہا۔ گرمی شروع ہوگئی تھی اس لئے مجھے رات کو صحن میں جو مکان کے اور احاطے کی دیوار کے بیچ میں تھا سونے کی اجازت تھی۔ میرا پلنگ زنجیروں سے جکڑ دیا گیا تھا کہ کہیں میں اس کو لیکر بھاگ نہ جاؤں یا شاید اس لئے کہ اس سے سیڑھی کا کام لیکر دیوار پر نہ چڑھ سکوں۔ رات کو عجیب عجیب آوازیں آیا کرتی تھیں۔ قیدی چوکیدار جو رات بھر بڑے احاطے کے گرد پہرا دیتے تھے اکثر ایک دوسرے کو طرح طرح کے سروں میں پکارتے تھے اور کبھی کبھی ایسی تان لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا دور سے آندھی چلنے کی آواز آرہی ہے۔ بارکوں کے پہرے والے زور زور سے قیدیوں کو گنتے رہتے تھے اور چیخ چیخ کر خیریت کی اطلاع دیتے تھے۔ رات میں کئی بار جیل کا کوئی افسر رونڈ پھرتا ہوا ہمارے احاطے کے پاس سے گذرتا تھا اور پہرے والے کو پکارتا تھا۔ چونکہ میرا احاطہ اور احاطوں سے کسی قدر فاصلے پر تھا اس لئے

اکثر آوازیں صاف طور پر سنائی نہیں دیتی تھیں اور ابتدا میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسا شور برپا ہے۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ کوئی جنگل قریب ہے اور کسان جنگلی جانوروں کو کھیتوں سے ہنکا رہے ہیں، اور کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود جنگل کی صدا درندوں کی آواز میں ملی جلی آ رہی ہے۔

معلوم نہیں یہ صرف میرا وہم ہے یا واقعہ ہے کہ گول دیوار چوکور دیوار سے زیادہ قید کا احساس پیدا کرتی ہے۔ کونوں اور زاویوں کے نہ ہونے سے آدمی اور بھی دم گھٹا ہے۔ دن کو یہ دیوار آسمان تک کو چھپا لیتی تھی۔ بس اس ایک ذرا سے ٹکڑے کی جھلک نظر آتی تھی اور میں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا۔

"اس چھوٹے سے نیلے خیمے کو
جسے قیدی آسمان کہتے ہیں،
اور بادل کے ہر تیرتے ہوئے ٹکڑے کو
جو روپہلے بادبان لگائے اڑا چلا جاتا ہے"

رات کو یہ دیوار مجھے اور زیادہ سختی سے گھیر لیتی تھی اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں کنویں میں پڑا ہوا ہوں۔ تاروں بھرے آسمان کا وہ حصہ جو مجھے دکھائی دیتا تھا سچ مچ کا آسمان نہیں بلکہ اس کا ایک مصنوعی نقشہ معلوم ہوتا تھا۔

میری بارک سارے جیل میں "کتا گھر" کے نام سے مشہور تھی۔ یہ نام میری وجہ سے نہیں ہوا بلکہ پہلے سے تھا۔ ابتدا میں یہ ان خطرناک مجرموں کے لئے بنائی گئی تھی۔ جنھیں قید تنہائی کی سزا ملتی تھی مگر آگے چل کر اس میں سیاسی قیدی اور نظر بند رکھے جانے لگے تاکہ وہ جیل کے اور حصوں سے الگ رہیں۔ اس احاطے کے سامنے کچھ دور پر ایک عجیب قسم کی چیز تھی۔ جب میں نے پہلی بار اپنی بارک سے اس کی جھلک دیکھی تو مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک بڑا سا پنجرا ہے جس میں آدمی کولھو کے بیل کی طرح پھر رہے ہیں۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ یہ

پانی کا پمپ ہے جو انسانوں کی قوت سے چلایا جاتا ہے اور اس میں ایک وقت میں سولہ آدمی لگتے ہیں۔ انسانوں کو ہر چیز کی عادت ہو جاتی ہے۔ میں کچھ دن میں اس منظر کا عادی ہو گیا مگر میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ یہ انسانی قوت کے استعمال کا نہایت احمقانہ اور وحشیانہ طریقہ ہے۔ جب کبھی میں ادھر سے گذرتا ہوں مجھے چڑیا خانے کا دھیان آتا ہے۔

چند روز تک مجھے ورزش وغیرہ کے لئے بھی اپنے احاطے سے باہر نکلنے کی ممانعت رہی مگر بعد میں اجازت ہو گئی کہ صبح تڑکے جھٹپٹے وقت آدھ گھنٹے کے لئے باہر جا سکتا ہو اور بڑی دیوار کے نیچے نیچے ٹہل یا دوڑ سکتے ہو۔ اتنے سویرے کا وقت اس لئے مقرر کیا گیا کہ اور قیدی مجھ سے نہ مل سکیں بلکہ مجھے دیکھ بھی نہ سکیں۔ مجھے یہ سر بہت پسند تھی اور اس سے بڑی تفریح ہوتی تھی۔ میں اس تھوڑے سے وقت کے اندر کھلی ہوا میں زیادہ سے زیادہ ورزش کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے دوڑنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ روزانہ دو میل سے اوپر دوڑنے لگا۔

میں صبح بہت تڑکے کوئی ساڑھے تین بجے اٹھتا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں سویرے سو جاتا تھا اس لئے کو جو روشنی مجھے ملتی تھی وہ پڑھنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ میں بڑے شوق سے تاروں کو دیکھا کرتا تھا اور ان کی جانی بوجھی صورتوں سے مجھے وقت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ جہاں میں لیٹا تھا وہاں سے قطب تارا دیوار سے ملا ہوا نظر آتا تھا اور اسکے ہر وقت سامنے رہنے سے مجھے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ گھومتے ہوئے آسمان کے بیچ میں یہ ثبات و استقلال کا نمونہ کھڑا مسکراتا رہتا تھا۔

ایک مہینے تک میرا کوئی ساتھی نہیں تھا مگر میں بالکل اکیلا بھی نہ تھا اس لئے کہ میرے احاطے میں ایک وارڈر، ایک قیدی باورچی اور چند قیدی نگراں رہتے تھے۔ کبھی کبھی دوسرے قیدی بھی کسی کام سے آجاتے تھے۔ ان میں سے اکثر وہ قیدی تھے جو لمبی سزائیں بھگت رہے تھے اور دوسروں کے نگراں بنا دئے گئے تھے۔ بہت

سے عمر قیدی بھی تھے۔ عام طور پر عمر قید کے میعاد بیس سال سمجھی جاتی ہے مگر وہاں ایسے لوگ بھی تھے جنہیں بیس سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ان میں مجھے ایک عجیب مثال نظر آئی۔ قیدیوں کے کرتوں میں کندھے پر ایک تختی لگی رہتی ہے جس میں سزا کی کیفیت اور رہائی کی تاریخ درج ہوتی ہے، ایک قیدی کی تختی میں میں نے رہائی کی تاریخ ۱۹۹۶ء لکھی ہوئی دیکھی! ۱۹۳۰ء میں اس میں سے کئی سال ختم ہو چکے تھے اور وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ غالباً اسے کئی سزائیں ملی تھیں اور ان سب کی معیاد جوڑ دی گئی تھی۔ میرے خیال میں ان کا مجموعہ پچھتر برس تھا۔

ان عمر قیدیوں کو برسوں تک عورت یا بچوں کی صورت بلکہ جانور کی شکل تک دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ باہر کی دنیا سے الگ اور نوع انسانی سے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ ہر وقت دل میں کڑھا کرتے ہیں اور خوف، انتقام اور نفرت کے خیالات میں ڈوبے رہتے ہیں۔ انھیں یاد نہیں رہتا کہ دنیا میں نیکی، سلوک اور خوشی بھی ہوتی ہے اور ان کی طبیعت میں بدی سما جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ نفرت کا جوش بھی کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ زندگی ایک بے روح مشین بن جاتی ہے۔ وہ بے جان پتلوں کی طرح حرکت کرتے ہیں بس ایک ہی چیز کا احساس رہ جاتا ہے۔ یعنی خوف کا۔ وقتاً فوقتاً قیدیوں کا جسم تولا جاتا ہے مگر ان کے نفس اور ان کی روح کو کیونکہ تول سکتے ہیں جو اس جبر و تشدد کی فضا میں سوکھتی اور مرجھاتی چلی جاتی ہے؟ لوگ موت کی سزا کی مخالفت میں بحث کرتے ہیں اور ان کی دلیلیں میرے دل کو لگتی ہیں۔ مگر جب میں قیدیوں کی عمر بھر کی مصیبت کو دیکھتا ہوں تو یہ خیال ہوتا کہ اس طرح گھسٹ گھسٹ کر مرنے سے تو موت کی سزا ہی اچھی ہے۔ ایک بار ایک عمر قیدی نے مجھ سے پوچھا'' ہمارے جیسے قیدیوں کا کیا ہوتا ہے کیا سوراج ہمیں اس جہنم سے چھڑا دے گا؟''

آخری یہ عمر قیدی ہیں کون؟ ان میں سے بہت سے ڈکیتی کے الزام میں جیل

بھیجے جاتے ہیں اکثر پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ کے گروہ اکٹھے سزا پاتے ہیں۔ ان میں سے بعض مجرم ہوں گے مگر عجب نہیں کہ بہت سے بے گناہ بھی ہوں۔ ایسے مقدموں میں لوگوں کو پھانسی دینا آسان ہے۔ ایک سرکاری گواہ کی شہادت اور دو ایک آدمیوں کی سرسری شناخت بہت کافی ہے۔ آج کل ڈکیتوں کا زور ہے اور قیدیوں کی تعداد ہر سال بڑھتی جاتی ہے۔ آخر جب لوگ بھوکوں مریں تو پھر اور کیا کریں؟ جج اور مجسٹریٹ جرائم کے بڑھنے کا راگ تو گاتے رہتے ہیں مگر اس کے کھلے ہوئے معاشی اسباب انھیں نہیں سوجھتے۔

پھر وہ کاشتکار ہیں جن میں زمین کے بارے میں معمولی سے جھگڑے پر لاٹھی چلی جاتی ہے اور ایک آدھ آدمی مارا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ عمر بھر کو یا ایک لمبی میعاد کے لئے جیل بھیج دئے جاتے ہیں۔ اکثر ایک خاندان کے سارے مرد اس طرح سے قید ہو جاتے ہیں اور عورتیں رہ جاتی ہیں جو کسی نہ کسی طرح گھر بار کو چلاتی ہیں۔ ان میں سے ایک شخص بھی مجرموں کی سی طبیعت کا نہیں اکثر گبھرو جوان ہیں جو جسم اور دماغ کے لحاظ سے گاؤں والوں کی عام سطح سے بہت اونچے ہیں۔ اگر ان کی تھوڑی سی تربیت ہو اور ان کی توجہ دوسرے کاموں کی طرف پھیر دی جائے تو اپنے ملک کے لئے بہت مفید ثابت ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے جیل خانوں میں بعض عادی مجرم بھی پائے جاتے ہیں جو غیر معاشرت پسند اور سماج کے لئے خطرناک ہوتے ہیں مگر میں نے تعجب اور خوشی کے ساتھ دیکھا کہ بہت بڑی تعداد میں اچھی قسم کے لڑکے اور بڑی عمر کے لوگ ہیں جن پر میں بے تکلف بھروسہ کر سکتا ہوں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ مجرمانہ طبیعت اور غیر مجرمانہ طبیعت کے لوگوں میں تعداد کا تناسب کیا ہے۔ شاید جیل کے محکمے والوں نے تو کبھی اس طرق پر غور ہی نہیں کیا ہوگا۔ نیو یارک کے سنگ سنگ جیل کے وارڈن لیوئس۔ اے۔ لائس نے اس کے متعلق دلچسپ اعداد شمار شائد کئے ہیں وہ

اپنے قیدیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ جہاں تک انھیں معلوم ہوا۔ ۵۰ فیصدی مجرمانہ رجحان طبع سے بالکل پاک ہیں ۲۵ فیصدی گردوپیش کے حالات کی بدولت مجرم بن گئے ہیں اور بقیہ ۲۵ میں سے شائد آدھے یعنی ساڑھے ۱۲ فیصدی پکے غیر معاشرت پسند ہوں گے۔ سب جانتے ہیں کہ اصلی مجرم بڑے شہروں اور جدید تمدن کے مرکزوں میں غیر ترقی یافتہ ملکوں سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ امریکا کے ڈاکو مشہور ہیں اور سنگ سنگ کے جیل میں خاص طور پر بدترین مجرم بھیجے جاتے ہیں۔ اس پر بھی خود اس کے وارڈن کے قول کے مطابق ساڑھے ۱۲ فیصدی قیدی ایسے ہیں جو واقعی بری طبیعت رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں اس سے یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان کے جیلوں میں ایسے قیدیوں کا تناسب اور بھی کم ہوگا۔ اگر ہمارا معاشی نظام معقول ہو تعلیم پھیل جائے اور روزگار بڑھ جائے تو تھوڑے دن میں ہمارے جیل خانے بالکل خالی ہو جائیں گی۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہماری معاشرت کا سارا نظام ایک سرے سے بدل جائے۔ دوسری صورت وہی ہے جو برطانوی حکومت نے اختیار کی ہے کہ پولیس کے تعداد اور جیل خانوں کی عمارت بڑھاتی جاتی ہے۔ ہندوستان کے جیلوں میں قیدیوں کی تعداد سن کر دل ہلتا ہے۔ قیدیوں کی امداد کے لئے جو انجمن قائم ہوئی ہے اس کے سکرٹری نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ۱۹۳۳ء میں صرف بمبئی پریزیڈنسی میں ایک لاکھ اٹھائیس ہزار اور بنگال میں ایک لاکھ چوبیس (۱) ہزار آدمی بھیجے گئے۔ مجھے سب صوبوں کے قیدیوں کی تعداد نہیں معلوم ہو سکی لیکن جب دو صوبوں میں ڈھائی لاکھ سے زیادہ قیدی ہیں تو سارے ہندوستان میں کوئی دس لاکھ ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعداد مستقل طور پر جیل میں رہنے والوں کی نہیں ہے بلکہ ان میں سے بہت کم سہی مگر پھر بھی بہت ہوگی۔ ہندوستان کے بعض بڑے صوبوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے جیل کے محکمے اس قدر وسیع ہیں کہ دنیا کے کسی ملک میں نہ ہوں گے۔ صوبہ متحدہ کو

بھی یہ عزت، جس کا عزت ہونا مشتبہ ہے، حاصل ہے اور غالباً اس کا جیل کا محکمہ سب سے پیچھے اور سب سے زیادہ رجعت پسند بھی ہے۔ یہاں قیدی انسان نہیں سمجھا جاتا اور اس کی طبیعت کو پہچاننے یا اس کی اصلاح کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی جاتی۔ البتہ ایک چیز میں یہ صوبہ سب سے آگے ہے کہ اپنے قیدیوں کی نگرانی بڑی سختی سے کرتا ہے۔ فرار کی کوشش بہت ہی کم ہوتی ہے اور مشکل سے دس ہزار میں ایک قیدی جیل سے بھاگتا ہوگا۔

جیل خانوں میں ایک افسوس ناک بات یہ نظر آتی ہے کہ قیدیوں میں پندرہ برس یا اس سے زیادہ عمر کے لڑکے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہونہار معلوم ہوتے ہیں اور اگر انھیں موقع دیا جائے تو کام کے آدمی بن سکتے ہیں۔ کچھ دن سے انھیں لکھنے پڑھنے کی ابتدائی تعلیم دینے کی کوشش شروع ہوئی ہے۔ مگر اس کا انتظام بھی بہت ناقص ہے کھیل تفریح کا موقع انھیں بہت ہی کم ملتا ہے۔ اخبار پڑھنے نہیں پاتے اور کتابوں کی اجازت بھی مشکل سے دی جاتی ہے۔ بارہ گھنٹے بلکہ اس سے بھی زیادہ قیدی اپنی بارکوں یا کوٹھریوں میں بند رہتے ہیں اور شام سے صبح تک ان کے لئے کوئی شغل نہیں ہوتا۔

عزیزوں وغیرہ سے ملنے کی اور انہیں خط لکھنے کی اجازت تین مہینے میں ایک بار ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وقفہ حد سے زیادہ بڑھے ہوں، جیسے کہ ان میں سے اکثر ہوتے ہیں تو انہیں جیل کے عہدیداروں سے خط لکھوانا پڑتا ہے اور یہ لوگ اسے بیگار سمجھ کر ٹالتے رہتے ہیں۔ یا اگر خط لکھوا بھی لیا تو پتہ ٹھیک نہیں ہوتا اور وہ پہنچتا نہیں۔ ملاقات کا معاملہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ عام طور پر جب تک جیل کے کسی عہدے دار کی مٹھی نہ گرمائی جائے، کام نہیں چلتا۔ اکثر قیدی ایک جیل سے دوسرے جیل بھیج دئے جاتے ہیں اور ان کے عزیز ان کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ میں نے ایسے قیدیوں کو دیکھا ہے جنہیں برسوں سے گھر کی خیر خبر نہیں معلوم ہوئی۔

اور جب یہ ملاقاتیں تین مہینے یا اس سے زیادہ عرصے کے بعد ہوتی بھی ہیں تو عجیب طریقے سے ہوتی ہے۔ بہت سے قیدی اور ان کے ملاقاتی آمنے سامنے کھڑے کردئے جاتے ہیں اور بیچ میں کہٹرہ ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ ایک ساتھ بولتے ہیں اور ہر شخص کو چیخ چیخ کر باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ غرض اس ملاقات سے انسانی محبت کا جو تھوڑا بہت اثر پڑنا چاہئے تھا وہ غائب ہو جاتا ہے۔

چند ایک قیدیوں کے ساتھ خاص رعایت ہوتی ہے یعنی کھانا کچھ اچھا دیا جاتا ہے اور کم وقفے کے بعد ملاقات کرنے اور خط لکھنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ ان کی تعداد (فرنگیوں کو چھوڑ کر) ہزار میں ایک سے زیادہ نہیں ہوتی۔ سول نافرمانی کی بڑی تحریکوں کے زمانے میں، جب جیل میں سینکڑوں سیاسی قیدی بھرے ہوتے ہیں ان رعایت پانے والے قیدیوں کی تعداد کچھ خفیف سی بڑھ جاتی ہے۔ مگر مجموعہ پھر بھی بہت کم ہوتے ہیں۔ ان سیاسی قیدیوں (مردوں اور عورتوں) میں سے ۲۵ فیصدی کے ساتھ معمولی قیدیوں کا سا برتاؤ ہوتا ہے اور انہیں یہ سہولتیں بھی نہیں دی جاتیں۔

بعض اشخاص جنہیں انقلابی جدوجہد کے جرم میں عمر قید، یا لمبی میعاد کی سزائیں دی جایت ہیں مدتوں قید تنہائی میں پڑے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں صوبہ متحدہ میں تو بندھا ہوا قاعدہ ہے کہ ایسے مجرم کال کوٹھری میں رکھے جائیں۔ عام مجرموں کو قید تنہائی جیل کے اندر کوئی جرم کرنے کے بعد لے مزید سزا کے طور پر ہوتی ہے۔ مگر یہ سیاسی مجرم جو عموماً کم سن لڑکے ہوتے ہیں جیل میں انتہائی قابل تعریف رویہ رکھیں، تب بھی کال کوٹھری میں رکھے جاتے ہیں۔ جیل میں انتہائی قابل تعریف رویہ رکھیں، تب بھی کال کوٹھری میں رکھے جاتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جیل کا محکمہ بغیر کسی وجہ کے عدالت کی دی ہوئی سزا میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ بات بڑی عجیب اور بالکل خلاف قانون معلوم ہوتی ہے۔ قید

تنہائی میں خواہ تھوڑے ہی دن کی کیوں نہ ہو، سخت اذیت ہوتی ہے اور جب یہ سزا برسوں تک کھنچ جائے تو نہایت ہی ہولناک چیز بن جاتی ہے یہاں تک کہ جنون کی نوبت آجاتی ہے اور چہرے سے کچھ عجیب وحشت برسنے لگتی ہے جیسے کوئی سہما ہوا جانور ہو۔ یہ جان کو ریت ریت کر مارنا، روح کو کند چھری سے حلال کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر آدمی اس سے بچ بھی نکلا تو ایک غیر طبعی مخلوق بن کر رہ جاتا ہے اور دنیا میں کہیں نہیں کھپ سکتا۔ یہ سوال ہمیشہ پیدا ہوتا ہے کہ دراصل اس کا کوئی قصور بھی نہ تھا؟ پولیس کے طور طریقے یوں بھی ہندوستان میں مدت سے مشتبہ ہیں اور پھر سیاسی معاملات میں تو اور بھی زیادہ۔

فرنگی یا کرانی قیدیوں کے لئے بندھا ہوا دستور ہے کہ وہ اونچے درجے میں شمار ہوتے ہیں۔ انہیں اچھا کھانا ملتا ہے، ہلکا کام کرنا پڑتا ہے اور ملاقات اور خط و کتابت میں سہولتیں دی جاتی ہیں۔ ہفتے میں ایک بار پادری آتا ہے اور اسکے ذریعے سے ان کا تعلق باہر کی دنیا سے قائم رہتا ہے۔ وہ ان کے لئے غیر ملکوں کے باتصویر اور ظریفانہ اخبار لاتا ہے اور جب ضرورت پڑتی ہے ان کے عزیزوں سے ملاقات یا خط و کتابت بھی کرتا ہے۔

اس کی کوئی شکایت نہیں کہ فرنگی قیدیوں کو یہ سہولتیں حاصل ہیں اس لئے کہ اصل میں یہ کچھ زیادہ رعائتیں نہیں ہیں۔ افسوس تو اس کا ہے کہ دوسرے قیدیوں، مردوں اور عورتوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ انسانیت کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ یہ لوگ سرے سے انسان ہی نہیں سمجھے جاتے اس لئے ان کے ساتھ ویسا برتاؤ بھی نہیں ہوتا۔ جیل خانے میں حکومت کے انتظامی تشدد کا بدترین نمونہ نظر آتا ہے۔ یہ ایک مشین ہے جو بے دردی اور بے خیالی سے چلتی رہتی ہے اور جو اس کے داب میں آجائے اس کچل کر رکھ دیتی ہے۔ جیل کے قواعد خاص کر کے ایسے بنائے گئے ہیں جس سے اس کا مشین ہونا ظاہر ہو۔ زود حس مردوں اور عورتوں

کے لئے یہ بے روح ضابطہ سوہان روح ہو جاتا ہے۔ میں دیکھا ہے کہ لمبی میعا دکے قیدی بعض اوقات اس بے رنگ زندگی سے اس قدر عاجز آجاتے ہیں کہ ان کا جی چھوٹ جاتا ہے اور وہ بچوں کی طرح رونے لگتے ہیں۔ ایک ذرا سی ہمدردی اور دلدہی سے جو اس فضا میں اس قدر کمیاب ہے، ان کا چہرہ خوشی اور احسان مندی سے چمک اٹھتا ہے۔

مگر خود ان قیدیوں میں اکثر دیا اور بھائی چارے کی ایسی مثالیں دیکھنے میں آئیں جن سے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ایک بار ایک اندھا عادی قیدی تیرہ برس کے بعد رہا کیا گیا۔ اتنی مدت کے بعد وہ بالکل خالی ہاتھ اس دنیا میں جا رہا تھا۔ جس میں اس کا کوئی نہ تھا۔ اس کے ساتھی قیدی اس کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر ان بیچاروں کے پاس کیا تھا۔ ایک نے اپنا کرتہ جو جیل کے دفتر میں امانت تھا اسے دے دیا۔ دوسرے نے کچھ اور کپڑا دیا۔ تیسرے کو اسی دن صبح نئی چپل ملی تھی جو اس نے مجھے بڑے فخر کیساتھ دکھائی تھی جیل میں یہ بڑی دولت تھی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کا اندھا ساتھی ننگے پاؤں جا رہا ہے تو اس نے بڑی خوشی سے اپنی نئی چپل اسے دے دی۔ مجھے اس وقت یہ خیال آیا کہ جیل کے اندر جتنی دیا ہے اتنی باہر نہیں۔

اس سال یعنی ۱۹۳۰ء میں ملک کی آنکھوں نے بہت سے ٹانک کے سے منظر اور جوش دلانے والے واقعات دیکھے۔ مجھے سب سے بڑھ کر حیرت یہ تھی کہ گاندھی جی قوم کی قوم کو ابھارنے اور جوش میں لانے کی کتنی بڑی قوت رکھتے ہیں۔ اس میں کچھ مسمریزم کی سی شان نظر آتی تھی اور ہم لوگوں کو گوکھلے کے وہ الفاظ یاد آگئے جو انہوں نے گاندھی جی کے بارے میں کہے تھے کہ ان میں وہ طاقت ہے جو مٹی کے پتلوں کو سورما بنا دیتی ہے۔ یہ ثابت ہو گیا کہ بامن سول نافرمانی بڑے بڑے قومی مقصد حاصل کرنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے اور سارے ملک میں خاموشی کے ساتھ یہ خیال پھیل گیا جس میں دوست دشمن سب شریک تھے، کہ ہندوستان کی فتح

ہونے والی ہے۔ جولوگ تحریک میں عملی حصہ لے رہے تھے ان کے دل میں ایک عجیب ولولہ تھا جس کا کچھ اثر جیل کے اندر بھی پہنچ گیا۔ معمولی قیدی تک یہ کہتے تھے کہ ''سوراج آرہا ہے!'' وہ بے صبری سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس خودغرضی کی امید میں کہ شاید انہیں بھی اس سے کچھ فائدہ پہنچے۔ پہرے والے بھی بازاری خبریں سن کر، یہ سمجھتے تھے کہ سوراج قریب ہے۔ جیل کے چھوٹے چھوٹے عہدیدار کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے۔

ہمیں جیل میں روزانہ اخبار پڑھنے کو نہیں ملتا تھے۔ صرف ایک ہندی کے ہفتہ وار اخبار سے تھوڑی بہت خبریں بھی ہمارے تخیل کو ایڑ لگانے کے لئے کافی تھیں۔ روزانہ لاٹھی چارج، کبھی کبھی گولی چلن۔ شولاپور کا مارشل لاء، قومی جھنڈا اٹھانے والوں کو دس دس سال کی سزا۔ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ہماری قوم خصوصاً عورتیں جو کچھ کر رہی تھیں اسے سن کر ہم ان پر فخر کرتے تھے۔ مجھے خاص طور پر خوشی تھی کہ میری والدہ، بیوی، سگی بہنیں اور ان کی سہیلیاں بڑا کام کر رہی ہیں۔ اگرچہ میں ان سے جدا تھا اور قید میں تھا، لیکن ایک اعلیٰ مقصد کی خدمت نے ہمارے دلوں میں رفاقت کا ایک نیا رشتہ قائم کر کے دوری کے پردے اٹھا دئے تھے اور ہم ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ خاندان قوم میں گھل مل گیا ہے مگر آپس کی محبت کو وہی مزا ہے جو پہلا تھا۔ مجھے کملا پر تعجب آتا تھا۔ اس کو جوش عمل بیماری پر غالب آ گیا اور کم سے کم کچھ دن تک سخت محنت اور مصروفیت کے باوجود وہ بالکل اچھی رہی۔

مجھے یہ فکر ستا رہی تھی کہ میں ایک حد تک آرام سے بیٹھا ہوں اور جو لوگ باہر ہیں وہ اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہیں اور تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ میرا دل بے چین تھا کہ کس طرح میں بھی وہاں پہنچ جاؤں۔ مگر یہ تو ممکن نہ تھا۔ اس لئے میں نے جیل میں زیادہ سے زیادہ کام کرنا شروع کیا کہ کچھ تو سختی کا مزا آئے۔

کوئی تین گھنٹے روز چرخا کاتتا تھا اور تین گھنٹے نواڑ بننے کا کام کرتا تھا۔ یہ شغل مجھے پسند تھا ان میں کچھ زیادہ محنت اور توجہ کی ضرورت نہیں تھی اور ان کی وجہ سے جی بہل جاتا تھا اور دل کی بے چینی کچھ کم ہو جاتی تھی۔ کتب بینی بھی بہت کرتا تھا اور اس کے علاوہ جھاڑے پوچھنے، اپنے کپڑے دھونے اور اس قسم کے اور کاموں میں مصروف رہا کرتا تھا۔ یہ ساری مشقت میں اپنی خوشی سے کرتا تھا ورنہ میری قید اصل میں ''قید محض'' تھی۔

غرض باہر کے واقعات کے خیال میں، اور جیل کے کاموں کے شغل میں، میری زندگی نیمی میں کٹتی رہی۔ ہندوستان کے جیل کے طریقوں کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اس میں اور ہمارے ملک کی برطانوی حکومت میں بہت مشابہت ہے۔ حکومت کا نظام بہت پکا اور گٹھا ہوا ہے جس کی وجہ سے ملک اس کی مٹھی میں ہے مگر ملک کے باشندوں کی کوئی پرواہ نہیں۔ جیل کا انتظام بھی دیکھنے میں بہت باقاعدہ معلوم ہوتا ہے اور ایک حد تک ہے بھی، مگر کسی کو اس کا احساس نہیں کہ جیل کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو بے چارے اس میں آتے ہیں ان کی مدد اور اصلاح کرے۔ وہاں تو بس ایک ہی خیال ہے کہ انہیں کوٹ پیٹ کر سارا کس بل نکال دو تا کہ جب وہ باہر جائیں تو ان میں ذرا بھی جان نہ باقی رہے۔ اور یہ بھی دیکھئے کہ جیل کا انتظام اور قیدیوں کی روک تھام اور تنبیہہ کس طرح ہوتی ہے؟

زیادہ تر خود انہیں قیدیوں کی مدد سے جن میں قیدی پہریدار اور قیدی جمعدار بنائے جاتے ہیں اور سزا کے خوف سے یا انعام اور تخفیف میعاد کے لالچ میں جیل کے عہدیداروں سے اتحاد عمل پر آمادہ کئے جاتے ہیں انکے مقابلے میں تنخواہ پانے والے پہرے دار بہت کم ہیں۔ جیل کے اندر نگرانی کا کام زیادہ تر یہی قیدی پہریدار اور قیدی جمعدار کرتے ہیں۔ ان کو ایک جگہ جمع ہونے یا مل کر کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے جب تک وہ الگ نہ رکھے جائیں ان

پر قابو نہیں رہ سکتا۔

جیل کے باہر ملک کی حکومت میں یہی طریقے ایک بڑے پیمانے پر نظر آتا ہے۔ اگرچہ اتنا کھلا ہوا نہیں ہے۔ وہاں قیدی پہریداروں اور قیدی جمعداروں کے نام دوسرے ہیں۔ ان کے القاب اور خطاب زیادہ شاندار، اور وردیاں زیادہ بھڑکدار ہوتی ہیں اور ان کے پیچھے (اسی طرح جیسے جیل میں) مسلح گارڈ سنگینیں لئے کھڑا رہتا ہے کہ وہ حکم سے سرتابی نہ کرنے پائیں۔

اس زمانے کی سلطنت میں جیل خانے کس قدر اہم چیزیں ہیں! کم سے کم قیدی یہی سمجھتا ہے اور اس کی نظر میں حکومت کے اور سب شعبے، جیل، پولیس اور فوج کے سامنے بالکل حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ جیل ہی میں مارکس کا یہ نظریہ سمجھ میں آتا ہے کہ سلطنت یا ریاست وہ جبر و تشدد کا آلہ ہے جس کے ذریعے سب لوگ حکومت کرنے والے طبقے کی مرضی کے آگے سر جھکانے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔

ایک مہینے تک میں اپنی بارک میں اکیلا رہا۔ اس کے بعد ایک ساتھ نربدا پرشاد سنگھ آ گئے اور ان کے آنے سے بڑی تسکین ہوئی۔ ڈھائی مہینے بعد جون ۱۹۳۰ء کی آخری تاریک کو ہمارے چھوٹے سے احاطے میں غیر معمولی ہلچل مچ گئی۔ صبح تڑکے کیا دیکھتے ہیں کہ میرے والد اور ڈاکٹر سید محمود چلے آ رہے ہیں۔ یہ دونوں کو آنند بھون میں سو رہے تھے کہ ایک دم سے گرفتار کر کے یہاں بھیج دئے گئے۔

---

(۱) اخبار اسٹیٹسمین ۱۱ دسمبر ۱۹۳۴ء

یرودمیں صلح کی بات چیت

میرے والد کے گرفتار ہوتے ہی یا شاید اس کے کچھ دن پہلے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی خلاف قانون جماعت قرار دے دی گئی۔ اس سے ایک نئی صورت یہ پیدا ہوئی کہ جب کبھی کمیٹی کا اجلاس ہوتا تھا اس کے سب ممبر ایک ساتھ گرفتار کر لئے جاتے تھے۔ قائمقام ممبروں کو جو اختیارات حاصل تھے ان کی رو سے ان ممبروں کی جگہ دوسرے ممبر منتخب کئے جاتے تھے اور اس طرح کئی عورتیں بھی ممبر مقرر ہوئیں جن میں سے ایک کملا بھی تھی۔

جس وقت میرے والد جیل میں آئے ان کی صحت بہت خراب تھی اور جس طریقے سے وہ وہاں رکھے گئے اس سے انہیں سخت تکلیف پہنچی۔ حکومت نے خاص کر کے ایسا نہیں کیا اس لئے کہ جہاں تک ممکن نہ تھا۔ بارک کی تنگ چار دیواری کے اندر ہم چار آدمی ٹھونس دئے گئے تھے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے یہ تجویز کیا کہ والد جیل کے کسی اور حصے میں رکھے جائیں، جہاں ذرا زیادہ جگہ ہو مگر ہم نے ساتھ ہی رہنا پسند کیا تا کہ ہم لوگ خود ان کی خدمت کر سکیں۔

برسات شروع ہو گئی تھی اور کوٹھری کے اندر بھی پانی سے محفوظ رہنا مشکل تھا اس لئے کہ چھت جگہ جگہ سے ٹپکتی تھی۔ رات کو یہ فکر ہوتی تھی کہ دس فٹ لمبے اور پانچ فٹ چوڑے برآمدے میں جو ہماری کوٹھری کے آگے تھا والد کا پلنگ کہاں بچھایا جائے کہ وہ بھیگنے سے محفوظ رہیں۔ ان کی طبیعت بہت مضمحل تھی، اور کبھی کبھی بخار بھی آجاتا تھا۔ آخر میں جیل کے حکام نے یہ یہ فیصلہ کیا کہ ہماری کوٹھری کے متصل ایک اور برآمدہ جو کافی وسیع ہو بنوا دیا جائے۔ چنانچہ یہ برآمدہ بن گیا اور اس سے گنجائش بہت بڑھ گئی مگر والد کو اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ اس لئے کہ اس کے تیار ہونے کے چند ہی روز بعد وہ رہا کر دئے گئے۔ البتہ ہم لوگوں نے جو وہاں رہ گئے تھے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔

جولائی کے آخر میں ہر طرف یہ چرچا ہو رہا تھا کہ سر تیج بہادر سپرو اور م۔ رجیکار صاحب حکومت اور کانگرس میں صلح کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں اس کی اطلاع ایک روزانہ اخبار سے ہوئی جو والد کے لئے خاص رعایت کے طور پر آتا تھا۔ اسی میں ہم نے وہ خطوط پڑھے جو لارڈ ارون اور سپرو اور جیکار صاحبان نے ایک دوسرے کو لکھے تھے اور اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں جو "صلح کے پیامبر" کہلاتے تھے گاندھی جی سے ملنے گئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان حضرات نے یہ پیش قدمی کس وجہ سے کی ہے اور کیا چاہتے ہیں۔ آگے چل کر انہوں نے ہمیں بتایا کہ انہیں اس کاروائی کی جرات اس مختصر بیان کی وجہ سے ہوئی تھی جس کے شائع کرنے پر میرے والد نے بمبئی میں اپنی گرفتاری سے چند روز پہلے رضامندی ظاہر کی تھی۔ اس بیان کا مسودہ مسٹر سولوکوسب (لندن کے ڈیلی ہیرلڈ کے نامہ نگار جوان دونوں ہندوستان میں تھے) نے والد سے گفتگو کرنے کے بعد تیار کیا تھا اور والد نے اسے پسند کیا تھا۔ اس بیان (۱) میں اس کا امکان ظاہر کیا گیا تھا کہ اگر حکومت چند شرائط کا مان لے تو کانگرس سول نافرمانی کی تحریک کو روک دے گی۔ یہ ایک مبہم اور مشروط بیان تھا مگر اسمیں یہ بات بالکل صاف کر دی گئی تھی کہ ان شرائط پر اس وقت تک غور نہیں کیا جا سکتا جب تک والد کو گاندھی جی سے اور مجھ سے مشورہ کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ میرا نام اس وجہ سے لیا گیا تھا کہ میں اس سال کانگرس کا صدر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ والد نے اپنی گرفتاری کے بعد نینی میں مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا اور انہیں افسوس تھا کہ انہوں نے جلدی میں ایسا مبہم بیان دے دے اجس سے غلط فہمی ک ا اندیشہ ہے۔ چنانچہ واقعی اس سے غلط فہمی پیدا ہوئی۔ اور اسی پر کیا موقوف ہے ہر بیان سے خواہ وہ کتنا ہی صاف اور واضح کیوں نہ ہو ان لوگوں کو جن کا طرز خیال ہم سے بالکل مختلف ہے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

۲۷ جولائی کو یکا یک سر تیج بہادر سپرو اور جے کار صاحب گاندھی جی کا خط لے

کرنینی جیل میں ہمارے پاس آن پہنچے۔ اس روز اور دوسرے دن ہم میں اروان میں طویل گفتگو ہوتی رہی جس سے والد کو بہت سخت تکان ہوئی۔ اس لئے کہ ان دنوں انہیں حرارت رہا کرتی تھی، ہم میں گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ مگر لوٹ پھیر کہ اسی جگہ آجاتے تھے جہاں سے ہمارے اور ان کے سیاسی خیالات میں اس قدر اختلاف تھا کہ ہم ایک دوسرے کے خیالات اور الفاظ کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہمارے خیال میں یہ کھلی ہوئی بات تھی۔ کہ موجودہ حالات میں کانگرس اور حکومت میں صلح کا مطلق امکان نہیں ہے۔ ہم نے صاف کہہ دیا کہ جب تک ہم اپنے ورکنگ کمیٹی کے رفیقوں خصوصاً گاندھی جی سے مشورہ نہ کرلیں کوئی تجویز پیش نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ہم نے گاندھی جی کو اس مضمون کا خط لکھ دیا۔

گیارہ دن کے بعد یعنی ۸ اگست کو ڈاکٹر سپرو وائسرے کا جواب لے کر ہم سے ملنے کے لئے دوبارہ تشریف لائے۔ معلوم ہوا۔ کہ وائسرائے کو ہمارے یرودا جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر وہ اور ان کی کونسل ہمیں اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ ہم سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں سے ملیں جو جیل کے باہر ہیں اور حکومت کے خلاف عملی جدوجہد کررہے ہیں۔ ڈاکٹر سپرو نے ہم سے پوچھا کہ تم لوگ اس صورت میں یرودا جانے پر تیار ہو یا نہیں۔ ہم نے جواب دیا کہ ہم گاندھی جی سے ملنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں مگر جب تک ہم اپنے دوسرے رفیقوں سے نہ ملیں ہمارے لئے کوئی قطعی فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ اس روز (یا شاید اس سے ایک دن پہلے) اخبار سے یہ خبر معلوم ہوئی تھی کہ بمبئی میں سخت لاٹھی چارج ہوا اور ولبھ بھائی پٹیل مالوی جی، تصدیق شیروانی اور دوسرے لوگ جو ورکنگ کمیٹی کے مستقل یا قائم مقام ممبر تھے گرفتار کرلئے گئے۔ ہم نے ڈاکٹر سپرو سے کہا کہ اس سے معاملہ اور زیادہ خراب ہوگیا ہے اور ان سے درخواست کی کہ وائسرائے کو صورت حال اچھی طرح سمجھا

دیں۔ مگر ڈاکٹر سپرو کو اس پر اصرار تھا کہ گاندھی جائیں تو ڈاکٹر سید محمود کو بھی جو نینی میں ہمارے ساتھ تھے کانگرس کے سیکرٹری کی حیثیت سے ضرور جانا چاہئے۔

اس کے تیسرے دن یعنی ۱۰ اگست کو ہم تینوں (والد محمود اور میں) اسپیشل ٹرین پر نینی سے پونا بھیجے گئے۔ ہماری گاڑی بڑے اسٹیشنوں پر ٹھہرائی جاتی تھی۔ پھر بھی ہمارے جانے کی خبر پھیل گئی تھی اور جن اسٹیشنوں پر ہم ٹھہرے اور جن پر نہیں ٹھہرے سب پر لوگوں کے بڑے بڑے مجمعے اکٹھا ہو گئے تھے۔ ۱۱ کو رات گئے ہم کرکی اسٹیشن پر جو پونا کے قریب ہے پہنچ گئے۔

ہمیں یہ توقع تھی کہ ہم گاندھی جی کے ساتھ ٹھہرائے جائیں گے یا کم سے کم ان سے بہت جلد مل سکیں گے۔ یرودا جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے یہی انتظام کیا بھی تھا مگر عین وقت پر انہیں اس پولیس افسر کے ذریعے سے جو نینی سے ہمارے ساتھ آیا تھا کچھ ایسی ہدائتیں ملیں جن کی وجہ سے انہیں اپنا انتظام بدلنا پڑا۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ لفٹننٹ کرنل مارٹن یہ راز ہم پر نہیں ظاہر کرنا چاہتے تھے مگر والد نے چپکے چپکے پوچھ گچھ کر کے معلوم کر لیا کہ اصل مدعا یہ ہے کہ ہم (کم سے کم پہلی بار) گاندھی جی سے اس وقت تک نہ ملنے پائیں جب تک سپرو اور جیکار صاحبان وہاں موجود نہ ہوں کیونکہ اندیشہ تھا کہ اگر ہم ان سے پہلے سے مل لئے تو ہمارا رویہ اور زیادہ سخت ہو جائے گا یا ہمارے خیالات میں اور زیادہ اتفاق ہو جائے گا۔ چنانچہ اس رات کو اور دوسرے دن اور دوسری رات کو ہم ایک الگ بارک میں رکھے گئے جس پر والد کو بہت غصہ آیا۔ ہمیں سخت تکلیف اور قلق تھا کہ ہم گاندھی جی سے ملنے نہیں پاتے۔ ۱۳ کی سہ پہر کو یہ اطلاع آئی کہ سر تیج بہادر سپرو اور جیکار صاحب آ گئے ہیں۔ گاندھی جی بھی ان کے ساتھ جیل کے دفتر میں ہیں اور ہم لوگوں کی وہیں طلبی ہے۔ والد نے جانے سے انکار کر دیا۔ جب بہت کچھ عذر معذرت کی گئی تو وہ اس شرط پر راضی ہوئے کہ پہلے ہم لوگ تنہائی میں گاندھی جی سے ملیں گے۔ اس کے بعد ہم

سب کی متفقہ درخواست پر ولبھ بھائی پٹیل، جیرام داس دولت رام (جو یروداجیل میں تھیں) کو بھی ہمارے مشورے میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ اس دن شام کو والد، محمود اور میں گاندھی جی کے احاطے میں منتقل کر دئے گئے اور یرودا کے مختصر دوران قیام میں یہیں رہے۔ ولبھ بھائی پٹیل اور جیرام داس دولت رام بھی اس عرصے میں ہمارے ساتھ ہی رکھے گئے تاکہ ہم آپس میں مشورہ کر سکیں۔

تین روز یعنی ۱۳، ۱۴، ۱۵ اگست کو ہماری سپرو اور جیکار صاحبان سے جیل کے دفتر میں گفتگو ہوتی رہی اور ہم نے انہیں چند خطوط کے ذریعے سے اپنے خیالات کی اطلاع دی اور وہ کم سے کم شرطیں بتائیں جن پر ہم سول نافرمانی اخباروں میں شائع ہو گئے۔

ان طویل مشوروں میں شریک ہونے کا میرے والد کی صحت پر اس قدر بوجھ پڑا کہ ۱۶ کو انہیں بہت تیز بخار ہو گیا۔ اس کی وجہ سے ہماری واپسی میں کچھ دیر ہوئی۔ ۱۹ کو ہم پھر اسپیشل ٹرین سے نینی روانہ ہوئے۔ بمبئی کی حکومت نے ہر طرح سے کوشش کی کہ والد آرام سے سفر کر سکیں اور یرودا کے مختصر قیام کے زمانے میں بھی ان کے آرام کا خاص طور پر خیال رکھا گیا جس رات کو ہم یرودا پہنچے ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ کرنل مارٹن سپرنٹنڈنٹ جیل نے والد سے پوچھا کہ آپ کس قسم کا کھانا پسند کریں گے والد نے کہا کہ میں بہت سادہ اور ہلکی غذا کھاتا ہوں اور اس کی بعد صبح کی چائے سے لے کر رات کے کھانے تک اپنی کل ضروریات کی فہرست بتانی شروع کی (نینی میں ہمارے لئے روز گھر سے کھانا آیا کرتا تھا) یہ فہرست جو والد نے بہت ہی سادگی اور بھولے پن سے بتائی تھی، تھی تو ہلکی غذاؤں کی، مگر بڑی زبردست فہرست تھی۔ اس میں شک نہیں کہ رٹز ہوٹل ے اسوائے ہوٹل میں یہ بہت سادے اور معمولی کھانے سمجھے جاتے جیسا کہ والد انہیں سمجھتے تھے مگر کہاں یرودا

جیل اور کہاں یہ چیزیں۔ جب کرنل مارٹن والد کی مہنگی ضرورتوں کی لمبی چوڑی فہرست سن رہے تھے تو ان کے چہرے کی کیفیت کے قابل تھی اور میں اور محمود اسے دیکھ کر لطف اٹھا رہے تھے۔ ایک مدت سے ہندوستان کا سب سے بڑا اور سب سے مشہور لیڈر ان کے جیل میں تھا اور اسے کھانے کے لئے صرف بکری کے دودھ کھجور یا کبھی کبھی ایک آدھ سنترے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اب جس سے انہیں سابقہ پڑا یہ کچھ اور ہی قسم کا تھا۔

پونا سے نینی واپس جاتے ہوئے پھر ہماری گاڑی بڑے اسٹیشنوں کو چھوڑتی گئی اور چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر ٹھہری۔ مگر مجمع پہلے سے بھی زیادہ تھا۔ پلیٹ فارم کھچا کھچ بھر جاتے تھے بلکہ کہیں کہیں خصوصاً ہردا، اٹارسی اور سہاگ پور میں لوگ ریل کی پٹریوں پر پل پڑتے تھے۔ کئی بار حادثے ہوتے ہوتے رہ گئے۔

والد کی حالت روز بروز بگڑتی جاتی تھی۔ بہت سے ڈاکٹر خود ان کے بلائے ہوئے اور صوبے کی حکومت کے بھیجے ہوئے انہیں دیکھنے آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جیل میں رہنا ان کے لئے سخت مضر تھا اور وہاں ٹھیک طور پر علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی جب کسی دوست نے اخبار میں یہ تجویز پیش کی کہ وہ بیماری کی وجہ سے رہا کر دئے جائیں تو انہیں بہت ناگوار ہوا اس لئے کہ انہیں اندیشہ تھا لوگ یہ سمجھیں گے کہ اس میں خود ان کا اشارہ ہے بلکہ انہوں نے لارڈ ارون کو اس مضمون کا تار بھی بھیجا کہ مجھے خاص رعایت کے طور پر رہا کیا جانا منظور نہیں۔ مگر ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ وزن بہت تیزی سے گھٹ رہا تھا اور اس قدر دبلے ہو گئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا وہ خود نہیں بلکہ ان کی پرچھائیں رہ گئی ہے۔ ۸ ستمبر کو وہ دس ہفتے جیل میں رہنے کے بعد رہا کر دیئے گئے۔

ان کے جانے سے ہماری بارک سونی ہو گئی۔ جب تک وہ تھے ہمیں بہت سے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کے لئے کہا کرتے تھے اور ہم سب یعنی محمود، نربدا پرشاد

اور میں بڑی خوشی سے ان کی خدمت میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ میں نے نواڑ بننا چھوڑ دیا تھا اور چرخا بھی بہت کم کاتتا تھا۔ اب ہم نے بادل ناخواستہ پھر وہی پرانا ڈھرا اختیار کرلیا۔ والد کی رہائی کے بعد روزانہ اخبار تک بند ہوگیا چار پانچ روز کے بعد میرے بہنوئی رنجیت۔ س۔ پنڈت بھی گرفتار ہوکر ہماری بارک میں پہنچ گئے۔

ایک مہینے بعد یعنی ۱۱ اکتوبر کو میری چھ مہینے کی قید کی میعاد ختم ہوگئی اور میں رہا کردیا گیا۔ میں جانتا تھا کہ زیادہ دن آزاد نہیں رہنے پاؤں گا، اس لئے کہ لڑائی جاری تھی اور اس کی شدت بڑھتی جاتی تھی۔ ''صلح کے پیامبر'' سپرو اور بیکار صاحب کی کوششیں ناکامیاب ثابت ہوئی تھیں۔ میری رہائی کے دو تین دن بعد نئے آرڈیننس جاری کئے گئے۔ میں خوش تھا کہ آزادی کے مختصر زمانے میں کچھ مفید کام کرلوں گا۔

کملا ان دنوں الہ آبادی میں کانگرس کا کام کررہی تھی۔ والد علاج کے لئے مسوری گئے ہوئے تھے اور والدہ اور انہیں ان کے ساتھ تھیں۔ کملا کے ساتھ مسوری روانہ ہونے سے پہلے میں ڈیڑھ دن الہ آباد میں بہت مصروف رہا۔ اس وقت ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ دیہات میں محصول نہ دینے کی تحریک شروع کی جائے یا نہیں، لگان اور مالگذاری کی ادائیگی کا زمانہ قریب آگیا تھا اور اس کی وصولی بہرحال مشکل تھی اس لئے کہ زراعتی پیداوار کی قیمت بہت گرگئی تھی۔ عالمگیر کساد بازاری کا اثر اب ہندوستان میں صاف نظر آرہا تھا۔

محصول نہ دینے کی تحریک شروع کرنے کے لئے یہ بہت اچھا موقع تھا یہ چیز سول نافرمانی کی عام تحریک کا ایک جز بن سکتی تھی اور بجائے خود بھی ضروری تھی۔ زمینداروں اور کاشتکاروں دونوں کے لئے اس سال کی پیداوار میں سے پورا مطالبہ ادا کرنا صریحی طور پر ناممکن تھا۔ زمینداروں میں سے تو اکثر کے پاس تھوڑا بہت

سرمایہ بھی تھا اور انہیں قرض بھی آسانی سے مل سکتا تھا۔ مگر کاشتکار عموماً اس قدر محتاج تھے کہ انہیں یوں بھی فاقے کا سامنا رہتا تھا اور ان کے لئے روپیہ حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کسی جمہوری ملک میں یا ایسی جگہ جہاں کاشتکاروں میں تنظیم ہوتی ہے اور ان کا کچھ اثر ہوتا ہے ان حالات میں لگان وصول کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ ہندوستان میں ان چند حصوں کے علاوہ جن میں کانگرس ان کی حمایت کرتی ہے، ان کا کوئی اثر نہیں۔ البتہ اس کا اندیشہ ضرور رہتا ہے کہ جب ان کی حالت ناقابل برداشت ہو جائے گی تو وہ شورش پر آمادہ ہو جائیں گے۔ مگر انہیں پشت ہا پشت سے اس کے عادت ڈال دی گئی ہے کہ ہر طرح کی سختیاں چپ چاپ برداشت کریں۔

گجرات میں اور بعض اور حصوں میں اس وقت محصول نہ دینے کی تحریک جاری تھی مگر یہ سب تقریباً سیاسی تحریکیں تھیں جو سول نافرمانی کے سلسلے میں ہو رہی تھیں۔ بعض میں علاقوں رعیت داری طریقہ رائج تھا اور کسانوں کو بلاواسطہ حکومت سے سابقہ تھا۔ ان کے محصول نہ دینے کا اثر براہ راست سلطنت پر پڑتا تھا مگر صوبہ متحدہ کی حالت دوسری تھی اس لئے کہ یہاں زمینداری اور تعلق داری کا رواج تھا اور کاشتکاروں اور سلطنت کے بیچ میں درمیانی لوگ موجود تھے۔ اگر کاشتکار لگان دینا موقوف کر دیں تو اس کا اثر براہ راست زمیندار پر پڑتا تھا اور اس طرح طبقوں کے مخالفت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ کانگرس مجموعی طور پر خالص قومی جماعت تھی اور اس میں بہت سے اوسط درجے کے اور بعض بڑے بڑے زمیندار بھی شامل تھے اس کے لیڈر اس بات سے بہت ڈرتے تھے کہ کہیں طبقوں کی مخالفت کا سوال نہ اٹھ کھڑا ہوا اور زمیندار نہ بگڑ جائیں۔ اس لئے سول نافرمانی کے پہلے چھ مہینے میں وہ دیہات میں محصول نہ دینے کی تحریک شروع کرنے سے بچتے رہے، حالانکہ موقع بہت اچھا تھا۔ مجھے اس صورت میں بلکہ کسی صورت میں بھی طبقوں کی مخالفت کا

مسئلہ چھیڑنے میں مطلق تامل نہ تھا مگر میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کانگرس کی جو نوعیت ہے اس کی وجہ سے وہ اس وقت طبقوں کی جنگ کی سرپرستی نہیں کر سکتی۔ البتہ ہو سکتا تھا کہ وہ زمینداروں اور کاشتکاروں دونوں کو لگان اور مالگذاری ادا نہ کرنے کی ہدایت کرے۔ یہ خیال ضرور تھا کہ غالباً اکثر زمیندار حکومت کو مالگذاری ادا کریں مگر ایسا کرتا تو خود انہیں کا قصور تھا۔

اکتوبر میں جب میں جیل سے چھوٹا تو مجھے یہ نظر آیا کہ سیاسی اور معاشی حالات کا شدید تقاضا ہے کہ دیہات میں محصول نہ دینے کی تحریک شروع کر دی جائے۔ کسانوں کی معاشی مشکلات تو ظاہر ہی تھیں اور سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو اگرچہ ہماری سکول نافرمانی کی تحریک اب بھی سارے ملک میں چل رہی تھی مگر ذرا پھیکی پڑتی جاتی تھی۔ شہروں میں اوسط طبقے کے لوگ ہڑتالوں اور جلوسوں سے کچھ اکتا سے گئے تھے۔ صریحی طور پر کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جو لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دے اور ان کی رگوں میں تازہ خون دوڑا دے۔ یہ نئی چیز صرف کاشتکاروں ہی سے حاصل ہو سکتی تھی۔ یہ ہماری محفوظ قوت کا زبردست خزانہ تھا جس سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا تھا۔ اس طرح یہ امید تھی کہ ہماری تحریک عام لوگوں کی اہم اغراض سے وابستہ ہو کر نئے سرے سے ایک عام تحریک بن جائے گی اور میرے نزدیک اس سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ اس کی وجہ سے سماجی مسائل چھڑ جائیں گی۔

میرے ڈیڑھ دن کے الہ آباد کے قیام میں مجھ میں اور میرے رفیقوں میں انہیں معاملات پر بحث ہوتی رہی۔ فوری اطلاع کے ذریعے سے ہم نے اپنے صوبے کی کانگرس کمیٹی کا جلسہ کیا اور طویل بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ صرف لگان نہ دینے کی تحریک کی منظوری دے دی جائے اور ہر ضلعے کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ چاہے تو اس تحریک کو شروع کر دے۔ خود ہم نے صوبے کے کسی حصے میں اس

تحریک کا اعلان نہیں کیا۔ ہماری مجلس منتظمہ نے اس تجویز میں کاشتکاروں اور زمینداروں دونوں کو شامل کرلیا تا کہ جہاں تک ہو سکے طبقوں کی مخالفت کا مسئلہ نہ چھڑنے پائے۔ مگر یہ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ اصل میں اس پر صرف کاشتکار ہی عمل کریں گے۔

اس اجازت کے ملتے ہی ہمارا الہ آباد کا ضلع پہلا قدم اٹھانے کو تیار ہو گیا۔ ہم نے یہ طے کیا کہ ایک ہفتے کے بعد ضلعے کے کسانوں کی ایک نمائندہ کانفرنس منعقد کی جائے تا کہ نئی تحریک شروع کی جا سکے۔ میں سمجھتا تھا کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد ایک ہی روز میں میں کافی کام کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ اسی دن میں الہ آباد شہر کے ایک بہت بڑے عام جلسے میں شریک ہوا اور وہاں ایک طویل تقریر کی۔ اسی تقریر کی وجہ سے مجھے کچھ دن کے بعد دوبارہ قید کی سزا دی گئی۔

۱۳ اکتوبر کو کملا اور میں دونوں روانہ ہو گئے تا کہ تین دن والد کی خدمت میں رہیں۔ انہیں کسی قدر افاقہ معلوم ہوتا تھا اور میں یہ سمجھ کر بہت خوش ہوا کہ اب ان کی طبیعت سنبھل گئی اور اچھے ہو جائیں گے۔ مجھے وہ سکون اور مسرت کے دن اب تک یاد ہیں۔ اتنے عرصے کے بعد اپنے خاندان میں واپس آنا کیا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ میری لڑکی اندرا اور میری بہن بچیاں بھی وہاں موجود تھیں میں ان بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور کبھی کبھی ہم ایک شاندار جلوس بنا کر گھر کے آس پاس چکر لگاتے تھے۔ سب سے چھوٹی بچی جس کی عمر تین چار سال کی تھی ہاتھ میں جھنڈا لئے آگے آگے ہوتی تھی اور سب مل کر ''جھنڈا اونچا رہے ہمارا'' گاتے جاتے تھے یہ آخری تین دن تھے جو میں نے اپنے والد کے ساتھ اطمینان سے گذارے۔ اس لئے کہ اس کے بعد ان پر اس مہلک بیماری کا حملہ ہوا جس نے انہیں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

چونکہ میرے والد کو یہ اندیشہ تھا کہ میں بہت جلد دوبارہ گرفتار ہو جاؤں گا اور وہ

چاہتے تھے کہ کچھ دن اور میرے ساتھ رہ لیں اس انہوں نے یکا یک یہ فیصلہ کیا کہ وہ دبھی الہ آباد واپس چلیں گے۔ کملا اور میں ۱۷ کو مسوری سے جارے تھے تا کہ ۱۹ کو الہ آباد میں کسانوں کی کانفرس میں شریک ہوسکیں۔ والد نے کہا کہ میں ۱۸ کو سب کو لے کر روانہ ہو جاؤں گا۔

واپسی میں میرا اور کملا کا سفر خاصہ ہنگامہ خیز رہا۔ وہرہ دون سے روانہ ہوتے وقت مجھے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا نوٹس دیا گیا۔ لکھنؤ میں ہمیں چند گھنٹے کی مہلت مل گئی۔ معلوم ہوا کہ وہاں بھی دفعہ ۱۴۴ کو نوٹس میرے لئے تیار تھا مگر اس کی تعمیل نہ ہوسکی۔ کیونکہ پولیس کا افسر مجمع کی زیادتی کی وجہ سے مجھ تک پہنچ نہیں پایا۔ وہاں میونسپلٹی نے مجھے ایڈریس دیا اور اس کے بعد ہم موٹر کار میں الہ آباد روانہ ہو گئے۔ راستے میں کئی جگہ ٹھہر کر کسانوں کے مجمعوں میں تقریریں کیں اور ۱۸ کو رات کے وقت الہ آباد پہنچ گئے۔

۱۹ کی صبح کو میرے لئے دفعہ ۱۴۴ کا ایک اور نوٹس آن پہنچا۔ معلوم ہوتا تھا کہ حکومت میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور میں چند گھنٹے سے زیادہ آزاد نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ دوبارہ گرفتار ہونے سے پہلے کسانوں کی کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع مل جائے۔ ہم اسے پرائیویٹ کانفرنس کہتے تھے اور وہ واقعی پرائیویٹ کانفرنس تھی اس لئے کہ اس میں صرف کسانوں کے نمائندے شریک کئے گئے تھے۔ باہر والوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ کانفرنس الہ آباد کے ضلعے کی پوری نمائندگی کر رہی تھی اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس میں ۱۶۰۰ ڈیلی گیٹ موجود تھے۔ کانفرنس نے بہت جوش وخروش سے یہ فیصلہ کیا کہ ضلعے میں محصول نہ دینے کی تحریک شروع کر دی جائے۔ ہمارے خاص خاص کارکنوں کو کسی قدر تامل تھا اور اس تحریک کی کامیابی میں شبہ تھا، کیونکہ بڑے زمیندار، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ حکومت ان کی پشت پناہ تھی، کسانوں کو دھمکانے اور ستانے کی بہت بڑی قوت

رکھتے تھے۔ اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کسان کس حد تک اس کا مقابلہ کر سکیں گے۔ مگر چھوٹے بڑے کسانوں کے ۱۶۰۰ نمائندوں کو جو وہاں موجود تھے مطلق تامل اور شبہ نہیں تھا یا کم سے کم وہ اسے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ میں نے بھی اس کانفرنس میں تقریر کی معلوم نہیں کہ یہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی تھی یا نہیں۔

وہاں سے میں والد اور دوسرے عزیزوں کو لینے اسٹیشن گیا۔ گاڑی دیر سے آئی اور ان لوگوں کے پہنچے کے بعد ہی مجھے ایک جلسے میں شریک ہونے کی لئے جانا پڑا جو کسان اور شہر والے مل کر رہے تھے۔ کملا اور میں آٹھ بجے رات کے بعد جلسے سے تھکے تھکائے واپس آرہے تھے۔ میں خوش تھا کہ گھر جا کر والد سے باتیں کروں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے اس لئے کہ ان کے واپس آنے کے بعد میری ان کی بات چیت نہیں ہونے پائی تھی۔ ہم گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے کہ ہماری موٹر روک لی گئی اور میں گرفتار کر کے جمنا پار اپنی پرانی بارک میں پہنچا دیا گیا۔ کملا اکیلی آنند بھون پہنچی۔ اس نے سارے خاندان کو جو ہمارا انتظار کر رہا تھا یہ نئی خبر سنائی۔ ادھر میں ٹھیک نو بجے نینی جیل کے بڑے پھاٹک میں داخل ہوا۔

---

(۱) وہ بیان جو ۲۵ جون ۱۹۳۰ء کو بمبئی میں پنڈت موتی لال نہرو کی رضامندی سے مرتب کیا گیا۔ ''گو یہ ظاہر ہے کہ حکومت ہند اور حکومت برطانیہ پہلے سے یہ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ گول میز کانفرنس جو اپنی رائے میں بالکل آزاد ہے، کیا تجاویز پیش کرے گی اور یہ کہ برطانوی پارلیمنٹ کا رویہ ان تجاویز کے متعلق کیا ہوگا۔ پھر بھی اگر کسی صورت سے یہ دونوں حکومتیں اپنی طرف سے یہ وعدہ کر لیں کہ وہ ہندوستان کو کامل خود اختیاری حکومت، دئے جانے کی حمایت انتقال اختیارات کی ان شرائط کے ماتحت کرنے پر تیار ہیں جو ہندوستان کے مخصوص خیالات اور ضروریات اور اس کے اور برطانیہ کے قدیم تعلقات کے لحاظ سے ان کے باہمی معاملات کے تصفیے کے لئے ضروری ہیں اور گول میز کانفرنس میں طے کی جائیں گی، تو پنڈت موتی لال نہرو حکومت کے اس وعدے کی (یا کسی ذمہ دار فریق ثالث کے اس بیان کی کہ حکومت ایسا وعدہ

کرنے والی ہے) اطلاع خود جا کر مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کو دیں گے۔ اگر یہ وعدہ کیا جائے اور فریق ثانی اسے قبول کر لے تو آپس میں اس حد تک مصالحت ہو سکتی ہے کہ ایک ہی وقت میں سول نافرمانی موقوف کر دی جائے۔ حکومت کی موجودہ تشدد کی پالیسی ختم ہو جائے اور سیاسی قیدیوں کو عام معافی مل جائے اور اس کے بعد کانگرس ان شرطوں کے ساتھ جنہیں فریقین منظور کر لیں گول میز کانفرنس میں شرکت کرے۔"

وہ خط جس میں یہ کم سے کم شرطیں بتائی گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ (ب) میں درج ہیں۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

صوبہ متحدہ میں محصول نہ دینے کی تجویز

آٹھ روز کے بعد میں پھر نینی جیل میں پہنچ گیا اور اپنی اسی پرانی بار میں سید محمود نربدا پرشاد اور نجیت پنڈت سے آن ملا۔ چند روز کے بعد جیل ہی میں میرے مقدمے کی تحقیقات ہوئی۔ مجھ پر کئی الزام لگائے گئے تھے اور وہ سب اس تقریر کے مختلف حصوں پر مبنی تھے جو میں نے رہائی کے دوسرے دن الہ آباد میں کی تھی۔ جیسا کہ ہم لوگوں کا قاعدہ ہے میں نے جواب دہی نہیں کی بلکہ عدالت میں صرف ایک مختصر سا بیان دے دیا۔ مجھے دفعہ ۱۴۴ الف کے ماتحت چھ مہینے قید اور سو روپے جرمانے اور آرڈیننس نمبر ۱۹۳۰ء (مجھے یاد نہیں کہ اس آرڈیننس کا منشا کیا تھا) کہ ماتحت بھی چھ مہینے قید اور سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ چونکہ آخری دو سزائیں اتھ ساتھ چلنے والی تھیں اس لئے مجموعی طور پر مجھے دو سال قید سخت اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں پانچ مہینے کی مزید قید کی سزا ہوئی۔ اب میں پانچویں بار گرفتار ہوا تھا۔

میرے دوبارہ گرفتار ہونے اور سزا پانے کا سول نافرمانی کی رفتار پر تھوڑے دن کے لئے کچھ اثر پڑا۔ اس کا زور اور سرگرمی کسی قدر بڑھ گئی۔ یہ زیادہ تر میرے والد کی وجہ سے ہوا۔ جب کملا نے انہیں میری گرفتاری کی خبر پہنچائی تو انہیں ایک دھچکا سا لگا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور میز پر جو ان کے سامنے رکھی تھی زور سے ہاتھ مار کر کہا کہ اب مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ بستر علالت پر پڑا رہوں۔ میں مردوں کا کام کروں گا اور بیماری کو نہیں مانوں گا۔ یہ ایک بہادرانہ عزم تھا مگر بدقسمتی سے بڑی سے بڑی قوت ارادی بھی اس روگ کو دور نہیں کرسکتی تھی جس نے ان کے جسم میں گھن لگا دیا تھا۔ پھر بھی کچھ دن کے لئے ان کے حالت میں اس قدر نمایاں تغیر ہوگیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے کئی مہینے سے یعنی جب سے وہ یرودا گئے تھے ان کے تھوک میں خون آنے لگا تھا۔ یہ ارادہ کرتے ہی خون بند ہوگیا۔ اور کئی روز تک نہیں آیا۔

وہ بہت خوش ہوئے اور جیل میں مجھ سے ملنے آئے تو یہ بات بڑے فخر سے بیان کی مگر بدقسمتی سے یہ افاقہ بہت مختصر تھا۔ کیونکہ چند ہی روز کے بعد خون اور زیادہ آنے لگا اور بیماری پھر زور پکڑ گئی۔ اس وقفے میں انہوں نے پرانے جوش عمل کے ساتھ کام لیا اور سارے ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک کا زور بڑھا دیا۔ انہوں نے مختلف مقامات کے لوگوں سے مشورہ کر کے مفصل ہدایتیں جاری کیں اور نومبر کے مہینے میں ایک خاص دن مقرر کیا (جو میری سالگرہ کا دن تھا) جس میں سارے ہندوستان میں میری تقریر کے وہ حصے عام جلسوں میں پڑھے گئے جن کی وجہ سے مجھے سزا دی گئی تھی۔ اس روز بہت سے مقامات پر لاٹھی چارج ہوئے۔ جلسے اور جلوس زبردستی منتشر کئے گئے اور ایک دن کے اندر سارے ہندوستان میں پانچ ہزار آدمی گرفتار ہو گئے۔ یہ میری سالگرہ کے منانے کا انوکھا طریقہ تھا۔

اس بیماری کی حالت میں ذمہ داری کو بوجھ اٹھانا اور اس قدر قوت کرنا والد کے لئے بہت برا تھا اس لئے میں نے ان سے التجا کی کہ آپ کامل آرام کیجیے۔ میں جانتا تھا کہ ہندوستان میں ان کے لئے چین سے بیٹھنا ممکن نہیں کیونکہ وہ ہر وقت تحریک کے نشیب و فراز پر غور کرتے رہیں گے اور لوگ لامحالہ ان سے مشورہ لینے آئیں گے۔ اس لئے میں نے یہ تجویز کی آپ رنگون، سنگاپور اور شرقی جزیروں کا ایک چھوٹا سے بحری سفر کر ڈالئے۔ انہیں یہ بات پسند آئی۔ یہ انتظام کیا گیا کہ ان کے ایک دوست اس سفر میں ان کے ساتھ جائیں۔ اسی غرض سے وہ کلکتے گئے مگر ان کی حالت روز بروز بگڑتی گئی اور ان میں اتنے بڑے سفر کی طاقت نہیں رہی۔ وہ سات ہفتے تک کلکتے کے مضافات میں مقیم رہے اور سارا خاندان وہیں ان کے پاس پہنچ گیا۔ صرف کملا الہ آباد میں رہ گئی اور کانگرس کا کام کرتی رہی۔

غالباً میرے اس قدر جلد اور دوبارہ گرفتار ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے محصول نہ دینے کی تحریک میں حصہ لیا تھا۔ مگر سچ پوچھئے تو اس تحریک کے حق میں اس سے

اچھی کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی کہ میں کسانوں کی کانفرنس کے بعد ہی جبکہ ان کے نمائندے الہ آباد میں موجود تھے گرفتار کرلیا گیا۔ اس سے ان کا جوش بہت بڑھ گیا اورانہوں نے قریب قریب ضلعے کے ہر گاؤں میں کانفرنس کے فیصلے کی اطلاع پہنچا دی۔ دو دن کے اندر اندر سارے ضلعے کو خبر ہوگئی کہ محصول نہ دینے کی تحریک شروع ہوگئی ہے اور سب کہیں لوگ خوشی خوشی اس کی تعمیل کرنے لگے۔

اس زمانے میں ہمیں سب سے بڑی مشکل پیام رسانی کی تھی، سمجھ میں نہیں آتا تھا لوگوں کو کس طرح اطلاع دی جائے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ان سے کیا چاہتے ہیں۔ اخبار ہماری خبریں سزا اور ضبطی کے ڈر سے شائع نہیں کرتے تھے۔ پریس ہمارے اشتہار اور نوٹس چھاپنے پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ خطوں اور تاروں کی نگرانی ہوتی تھی۔ اور اکثر روک دئے جاتے تھے۔ ہمارے لئے پیام رسانی کا قابل اعتماد طریقہ صرف یہی رہ گیا تھا کہ قاصدوں کے ہاتھ خط بھیجیں مگر یہ کبھی کبھی گرفتار ہو جاتے تھے۔ اس طریقے میں بہت صوبوں کے مرکزوں، ضلعوں کے مرکزوں اور کانگرس کے صدر مقام کے درمیان خبر رسانی کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ شہروں میں خبر پھیلانے تو کچھ مشکل نہ تھا وہاں خلاف قانون خبر کے کی بڑی مانگ تھی۔ عام اعلان کرنے کے لئے شہر میں ڈھنڈوار بھی پیٹا جاتا تھا جس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا تھا کہ ڈھنڈورے والا گرفتار ہو جاتا تھا۔ اس میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ اس لئے کہ لوگ گرفتاری سے ڈرتے نہیں تھے بلکہ خود چاہتے تھے کہ گرفتار کئے جائیں۔ یہ کے بعض بڑے بڑے مرکزوں سے قاصدوں اور اسکلو اسٹائل کے پرچوں کے ذریعے سے خبر رسانی کا تھوڑا بہت سلسلہ قائم تھا مگر یہ قابل اطمینان نہیں تھا اور ہماری ہدایتوں کو دور دراز گاؤں تک پہنچتے پہنچتے بہت دن لگ جاتے تھے۔

الہ آباد کی کسنا کانفرنس کے لئے یہ مشکل آسان ہوگئی۔ اس میں ضلعے کے قریب قریب ہر اہم گاؤں سے نمائندے آئے تھے اور جب یہ واپس گئے تو انہوں

نے کانفرنس کے فیصلے اور میری گرفتاری کی خبر سارے ضلعے میں پھیلا دی۔ یہ سولہ سو آدمی سب کے سب محصول نہ دینے کی تحریک کے پرجوش مبلغ بن گئے۔ اس طرح تحریک کی ابتدائی کامیابی کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس علاقے کے کسان شروع میں لگان ادا نہیں کریں گے اور اگر تخویف سے کام نہ لیا گیا تو آخر تک نہیں دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ زمینداروں نے یا حکومت نے تشدد اور تخویف شروع کر دی تو ان کی قوت برداشت کہاں تک کام دے گی۔

ہم نے کاشتکاروں اور زمینداروں دونوں سے محصول ادا نہ کرنے کا اپیل کیا تھا۔ اس لئے اصولی طور پر اس میں کسی طبقے کی طرف داری نہیں تھی مگر عملی صورت یہ ہوئی کہ اکثر زمینداروں نے جن میں بعض قوم پرست بھی شامل تھے مالگذاری ادا کر دی۔ ان پر زیادہ دباؤ پڑ رہا تھا اور انہیں زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ مگر کاشتکار ثابت قدم رہے اور انہوں نے لگان ادا نہیں کیا۔ اس طرح ہماری تحریک اصل میں لگان نہ دینے کی تحریک بن گئی۔ الہ آباد کے ضلعے سے یہ تحریک صوبہ متحدہ کے چند اور ضلعوں میں بھی پھیل گئی۔ اکثر جگہ اس کا باقاعدہ اعلان نہیں ہوا مگر عملی طور پر کسانوں نے لگان نہیں دیا اور ان میں سے اکثر قیمتیں گر جانے کی وجہ سے واقعی دے بھی نہیں سکتے تھے۔ اتفاق سے کئی مہینے تک حکومت اور بڑے زمینداروں نے عام طور پر سرکش کسانوں کے خلاف کوئی تخویفی کاروائی بھی نہیں کی۔ انہیں اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی اس لئے کہ ایک طرف تو سیاسی تحریک اور سول نافرمانی کا زور تھا اور دوسری طرف عالمگیر کساد بازاری کی وجہ سے کسانوں کی حالت بہت ابتر تھی۔ یہ دونوں چیزیں مل گئی تھیں اور حکومت کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں کسانوں میں یہ شورش برپا نہ ہو جائے لندن میں گول میز کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا اور حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس زمانے میں ہندوستان میں اور بے چینی

پھیلے اور اسے اور زیادہ استبداد سے کام لینا پڑے۔

صوبہ متحدہ میں محصول نہ دینے کی تحریک کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری جدوجہد کا مرکز شہروں سے دیہات میں منتقل ہوگیا جس کی وجہ سے تحریک میں نئے سرے سے جان پڑ گئی اور اس کی بنیاد زیادہ وسیع اور پائدار ہوگئی۔ اگرچہ ہمارے شہر والے تھک گئے تھے اور ہمارے اوسط طبقے کے کارکن پست ہو چلے تھے مگر ہمارے صوبے میں تحریک کا زور کم نہیں ہونے پایا تھا بلکہ اور بڑھ گیا تھا۔ دوسرے صوبوں میں یہ تغیر یعنی شہر کے سیاسی مسائل کی جگہ دیہات کے معاشی مسائل پر زور دینا اس حد تک واقع نہیں ہوا تھا اس لئے وہاں جدوجہد کا مرکز بدستور شہروں میں تھا اور اوسط طبقے کے لوگوں کے تھک جانے کی وجہ سے تحریک کمزور ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ بمبئی بھی جس نے اس سارے عرصے میں سب سے نمایاں حصہ لیا تھا کسی قدر پست ہو چلا تھا۔ وہاں اور دوسرے مقامات پر قانون کی خلاف ورزی جاری تھی اور گرفتاریاں بھی ہو رہی تھیں مگر اب ان چیزوں میں کچھ بناوٹ سی معلوم ہوتی تھی۔ تحریک میں وہ روح نہیں رہی تھی۔ یہ قدرتی بات تھی اس لئے کہ عام لوگوں میں انقلابی جوش زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہ سکتا، عموماً یہ جوش چند دن تک رہتا ہے۔ مگر سول نافرمانی میں یہ غیر معمولی صفت تھی کہ اس نے اسے کئی مہینے تک باقی رکھا اور اس کے بعد بھی اس کا تھوڑا بہت سلسلہ مدتوں چلتا رہا۔

حکومت نے اور زیادہ تشدد سے کام لینا شروع کیا۔ مقامی کانگرس کمیٹیاں جو اب تک حیرت انگیز طریقے سے کام کر رہی تھیں، خلاف قانون قرار دے کر توڑ دی گئیں۔ جیل خانوں میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ اور بھی برا برتاؤ ہونے لگا۔ حکومت کو زیادہ غصہ اس پر آتا تھا کہ لوگ جیل سے رہا ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد دوبارہ سزا پا کر جیل میں پہنچ جاتے تھے۔ اس بات سے کہ لوگ سزا پانے پر بھی حکومت کا دباؤ نہیں مانتے تھے، اس کا اخلاقی توازن بگڑ گیا۔ نومبر یا شروع دسمبر

۱۹۳۰ء میں صوبہ متحدہ کے کئی جیلوں میں سیاسی قیدیوں کو جیل کے قواعد کی خلاف ورزی کے بہانے سے کوڑے لگائے گئے۔ ہمیں نینی جیل میں یہ خبر ملی اور اس سے سخت صدمہ پہنچا (اب تو ہم ہندوستان میں اس کے اور اس سے بدتر چیزوں کے عادی ہو گئے ہیں) میرے خیال میں کوڑے مارنے کے سزا بدترین عادی مجرموں کے لئے بھی جائز نہیں۔ نوعمر زود حس لڑکوں کو محض ضابطے کی خلاف ورزی کے بدلے یہ سزا دینا سخت وحشیانہ فعل تھا۔ ہم چاروں نے جو ایک ہی بارک میں رہتے تھے حکومت کو اس کے متعلق ایک خط لکھا۔ جب دو ہفتے تک کوئی جواب نہیں آیا تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ کوڑے کی سزا کے خلاف احتجاج کرنے اور ان مظلوموں سے جنہیں یہ وحشیانہ سزا دی گئی تھی اظہار ہمدردی کرنے کے لئے ہمیں کوئی خاص طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ ہم نے تین دن یعنی بہتر گھنٹے کا پورا فاقہ شروع کر دیا۔ یہ کوئی بڑا فاقہ نہیں تھا مگر ہم میں سے کوئی بھی فاقے کرنے کا عادی نہیں تھا اور ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہم اسے کہاں تک برداشت کر سکیں گے۔ میں نے اس سے پہلے جو بیس گھنٹے سے زیادہ کا فاقہ کبھی نہیں کیا تھا۔

ہمیں اس فاقے میں کوئی خاص مشکل نہیں پیش آئی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہ اتنی سخت آزمائش نہیں ہے جتنی میں سمجھتا تھا۔ میں بڑی حماقت کی کہ اس عرصے میں سخت ورزشیں (دوڑنا، کسرت کرنا، وغیرہ) جو میں کیا کرتا تھا بدستور جاری رکھیں۔ مجھے اس سے نقصان پہنچا خصوصاً اس وجہ سے کہ میری طبیعت پہلے ہی سے خراب تھی۔ ان تین دن میں ہم میں سے ہر شخص کا وزن سات آٹھ پونڈ گھٹ گیا۔ اس سے پہلے نینی جیل میں چند مہینے کے اندر ہم میں سے ہر ایک کا وزن پندرہ سے لے کر چھبیس پونڈ تک کم ہو گیا تھا۔

ہمارے فاقے کے علاوہ جیل کے باہر بھی لوگوں نے کوڑے کی سزا کے خلاف بہت کچھ احتجاج کیا اور غالباً صوبہ متحدہ کی حکومت نے جیل نے کے محکمے کو حکم دیا کہ

آئندہ یہ سزا نہ دی جائے مگر یہ حکم زیادہ دن قائم نہیں رہا اور کوئی سوا سال کے بعد صوبہ متحدہ اور دوسرے صوبوں کے جیلوں میں قیدیوں کو بار بار کوڑے کی سزائیں دی گئیں۔

اس قسم کے واقعات سے جو کبھی کبھی پیش آتے تھے قطع نظر کر کے ہماری زندگی جیل میں بہت سکون سے گزرتی تھی۔ موسم اچھا تھا اس لئے کہ الہ آباد کا جاڑا بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ رنجیت پنڈت ہماری بارک کے لئے ایک نعمت تھے اس لئے کہ انھیں باغبانی خوب آتی تھی اور تھوڑے دن میں ہمارے اجاڑ احاطے میں رنگ برنگ کے پھول لہلانے لگے۔ اور انھوں نے یہ کمال کیا کہ اتنی سی جگہ میں ایک چھوٹا سا گولف کورس بھی بنالیا۔

نینی جیل کی زندگی میں ایک دلچسپی یہ تھی کہ ہمارے سر پر سے طیارے گزرا کرتے تھے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان جتنے بڑے ہوائی راستے ہیں وہ سب الہ آباد سے ہو کر جاتے ہیں اور آسٹریلیا، جاوا، فرانسیسی چینی ہند جانے والے بڑے بڑے طیارے ٹھیک ہمارے سر پر سے گزرتے تھے۔ سب سے زیادہ شاندار ڈچ ہوائی جہاز تھے جو بٹاویا آتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی خوش قسمتی سے ہمیں صبح تڑکے جب خوب اندھیرا ہوتا تھا اور آسمان پر تارے چھٹکے ہوتے تھے طیارے اڑتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ڈچ جہاز میں خوب روشنی ہوتی تھی اور دونوں سروں پر سرخ لیمپ دہکتے تھے۔ اس جہاز کو صبح کے جھٹپٹے میں گزرتے ہوئے دیکھنا بڑا خوش نما منظر تھا۔

پنڈت مدن موہن مولوی بھی کسی اور جیل سے نینی بھیج دئے گئے۔ وہ ہماری بارک میں نہیں بلکہ ہم سے الگ رکھے گئے مگر ان سے روز ملاقات ہوتی تھی۔ مجھے یہاں ان سے ملنے کا جتنا موقع ملا شاید جیل سے باہر کبھی نہیں ملا تھا۔ ان میں بڑی زندگی اور زندہ دلی تھی اور نوجوانوں کی طرح ہر چیز کا شوق تھا اس لئے ان کی صحبت

میں بہت لطف آتا تھا۔ انھوں نے رنجیت سے جرمن پڑھنا شروع کی اور حیرت انگیز قوت حافظہ کا ثبوت دیا۔ جب کوڑوں کی سزا کی خبر آئی تو وہ نینی ہی میں تھے۔ انھیں بھی سخت صدمہ ہوا اور انھوں نے صوبے کے قائم مقام گورنر کو خط لکھا۔ کچھ دن کے بعد وہ بیمار پڑ گئے۔ وہ سردی برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ اور جیل میں سردی سے محفوظ رہنے کا کافی انتظام نہیں تھا۔ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ اس لئے وہ شہر کے ہسپتال میں بھیج دئے گئے اور اور کچھ دن کے بعد میعاد سے پہلے رہا کر دئے گئے خوش قسمتی سے ان کی طبیعت ہسپتال ہی میں سنبھل گئی۔

سال نو کے دن یعنی یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو کملا کی گرفتاری کی خبر آئی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی اس لئے کہ اس کی بہت سی سہیلیاں جو اس کے ساتھ کام کرتی تھیں جیل میں تھیں اور وہ خود بھی ان کی طرح جیل جانے کے لئے بے چین تھی۔ میری بیوی اور بہن جو کام کر رہی تھیں اگر مرد کرتے تو کب گرفتار ہو چکے ہوتے۔ مگر اس زمانے میں حکومت جہاں تک ہو سکتا تھا۔ عورتوں کو گرفتار نہیں کرتی تھی۔ اس لئے وہ اب تک بچی ہوئی تھیں مگر اب خدا خدا کر کے کملا کے دل کی آرزو پوری ہوئی۔ میں سوچتا تھا کہ وہ کسی قدر خوش ہوگی۔ مگر مجھے یہ تشویش تھی کہ اس کی صحت ہمیشہ سے کمزور ہے جیل میں اسے بڑی تکلیف ہوگی۔

جب وہ گرفتار ہوئی تو کسی اخبار کے نمائندے سے جو وہاں موجود تھا اس ایک پیام کی درخواست کی اور اس نے فوراً بے سوچے ہوئے ایک مختصر سا پیام اپنے خاص انداز میں لکھوا دیا۔ ''مجھے فخر ہے کہ میں اپنے شوہر کے نقش قدم پر چل رہی ہوں اور امید ہے کہ لوگ لڑائی جاری رکھیں گے۔'' شاید اگر اسے سوچنے کا موقع ملتا تو وہ یہ الفاظ نہ کہتی اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو عورتوں کے حقوق کا حامی اور مردوں کے استبدار کا مخالف سمجھتی ہے۔ مگر اس وقت تو وہ جذبہ جو ہر ہندو بیوی کے دل میں ہوتا ہے، اس پر غالب آ گیا اور اسے مردوں کے استبدار کا بھی خیال نہیں رہا۔

میرے والد کلکتے میں تھے اور ان کی طبیعت بہت خراب تھی مگر کملا کی گرفتاری اور سزایابی کی خبر کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ الہ آباد آنے کو تیار ہو گئے۔ میری بہن کرشنا کو انھوں نے فوراً الہ آباد بھیج دیا اور چند روز کے بعد خود بھی بقیہ خاندان کو لے کر روانہ ہو گئے۔ ۱۲ جنوری کو وہ مجھ سے ملنے نینی آئے۔ میں نے انھیں تقریباً دو مہینے کے بعد دیکھا تھا اور ان کی حالت دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا، جسے میں مشکل سے چھپا سکا۔ بظاہر انھیں اس کا اندازہ نہیں ہونے پایا اور انھوں نے کہا کہ میری صحت کلکتے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے، ان کے سارے چہرے پر ورم تھا مگر وہ سمجھتے تھے کہ یہ کسی عارضی سبب سے ہو گیا۔

ان کے چہرے کی یہ ہیئت میرے دل میں کھٹکتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ان کی صورت نہیں کسی اور کی ہے۔ پہلی بار میرے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ ان کی حالت واقعی خطرناک ہے۔ میں انھیں صحت اور قوت کا مجسمہ سمجھا کرتا تھا، اور انکی موت کا تصور کرنا میرے لئے دشوار تھا۔ وہ موت کے ذکر پر ہنسا کرتے تھے اور ہمیں تسکین دیتے تھے کہ ابھی میں بہت دن تک زندہ رہوں گا۔ مگر کچھ عرصے سے میں دیکھتا تھا کہ جب ان کا کوئی بچپن کا دوست مر جاتا ہے تو انھیں تنہائی کا احساس رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اجنبیوں کے مجمع میں بالکل اکیلے ہیں ہیں بلکہ اشارتاً اپنی موت کا ذکر بھی کر دیتے تھے۔ مگر عموماً یہ کیفیت کچھ دیر کے بعد جاتی رہتی تھی اور ان کی زندگی اور زندہ دلی کی قوت پھر ابھر آتی تھی ہمارا سارا خاندان کی جامع شخصیت کا اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ ہم ان کے بغیر دنیا کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر میں بہت پریشان ہو گیا اور میرے دل میں طرح طرح کے وہم آنے لگے۔ پھر بھی میں یہ نہیں جانتا تھا کہ خطرہ اس قدر قریب ہے۔ میری صحت تھی نہ معلوم کیوں اس زمانے میں بہت خراب رہتی تھی۔

پہلی گول میز کانفرنس ختم ہو رہی تھی اور اس کے فیصلوں کی بڑی دھوم دھام تھی۔ ہمیں اس پر ہنسی آتی تھی اور شاید اس ہنسی میں کسی قدر حقارت بھی شامل تھی۔ یہ ساری تقریریں اور بحثیں بالکل بیکار حقیقت سے خالی معلوم ہوتی تھیں، البتہ ایک حقیقت بالکل ظاہر تھی کہ اس وقت جب ہمارا ملک انتہائی مصیبت کے دور سے گزر رہا تھا اور ہماری عورتیں اور مرد حیرت انگیز بہادری کا ثبوت دے رہے تھے۔ ہمارے بعض وطن پرست ان سب چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ہمارے حریفوں کو اخلاقی مدد پہنچا رہے تھے۔ ہم پر یہ بات اور بھی واضح ہو گئی کہ قوم پرستی کے پردے میں متضاد معاشی اغراض کام کر رہے ہیں اور وہ لوگ جو مستقل حقوق کے مالک ہیں اسی قوم پرستی کے نام سے آئندہ کے لئے اپنے حقوق کی حفاظت کا انتظام کر رہے ہیں۔ گول میز کانفرنس صریحی طور پر ان ہی لوگوں کی ایک جماعت تھی۔ ان میں سے اکثر نے ہماری تحریک کی مخالفت کی تھی اور بعض دور سے تماشا دیکھا کرتے تھے اور کبھی کبھی ہمیں جتا دیتے تھے کہ ''ان لوگوں کی خدمت بھی کچھ کم نہیں جو موقع کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔'' مگر یہ انتظار کا زمانہ لندن کی نگاہ ناز کے ایک اشارے میں ختم ہو گیا۔ اور یہ سب حضرات وہاں دوڑے گئے کہ اپنے اپنے حقوق کی حفاظت کریں اور جو کچھ مال غنیمت ہاتھ آ جائے اس میں حصہ بٹائیں۔ لندن میں یہ صف بندی کرنے میں اس خیال سے اور بھی عجلت کی گئی کہ کانگرس کی انتہا پسندی بڑھتی جاتی ہے اور اس پر عام لوگوں کا اثر غالب آتا جاتا ہے۔ مستقل حقوق کے مالکوں میں خود بخود یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اگر ہندوستان میں کوئی بنیادی سیاسی تبدیلی ہوئی تو عام لوگوں کا طبقہ حاوہ ہو جائے گا یا کم سے کم اس کی اہمیت بڑھ جائے گی اور وہ یقیناً بنیادی سماجی تبدیلیوں پر زور دے گا جس سے ان کے مستقل حقوق خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اس خطرے کو دیکھ کر یہ حضرات گھبرائے اور انھوں نے یہ کوشش شروع کر دی کہ کوئی اہم سیاسی تبدیلی نہ ہونے

پائے۔ وہ چاہتے تھے انگریز ہندوستان میں پنچ بنے بیٹھے رہیں۔ تاکہ وہ موجودہ سیاسی نظام کو قائم رکھیں اور ان کے مستقل حقوق کی حفاظت کرتے رہیں۔ نوآبادیات کے درجے پر زور دینے میں اصل مصلحت یہی تھی۔ ایک بار ایک مشہور اعتدال پسند لیڈر مجھ سے اس بات پر خفا ہو گئے۔ کہ میں نے برطانوی حکومت سے معاملہ کرنے کے لئے یہ لازمی شرط قرار دی کہ برطانوی فوج ہندوستان سے فوراً ہٹالی جائے اور ہندوستانی فوج جمہور ہند کی نگرانی میں دے دیجائے۔ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر خود برطانوی حکومت بھی اسے منظور کرلے تب بھی میں اس کی انتہائی مخالفت کروں۔ وہ قومی آزادی کی اس لازمی شرط کے مخالف کچھ اس وجہ سے نہیں تھے کہ موجودہ حالات میں اس کا پورا ہونا ناممکن ہے، بلکہ وہ سرے سے اسے ناپسند کرتے تھے۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ انھیں بیرونی حملے کا خوف تھا اور وہ چاہتے تھے کہ برطانوی فوج ہماری حفاظت کے لئے موجود رہے۔ قطع نظر اسے بحث کے کہ بیرونی حملے کا امکان ہے یہ نہیں، یہ بات بجائے خود ہر غیرت مند ہندوستانی کے لئے باعث شرم ہے کہ اپنی حفاظت کی درخواست دوسروں سے کی جائے۔ مگر میرے خیال میں ہندوستان میں برطانوی قوت قائم رکھنے کی خواہش بیرونی حملے کے خوف پر مبنی نہیں بلکہ اس کی ضرورت اس وجہ سے محسوس کی جاتی ہے کہ وہ مستقل حقوق کے مالکوں کو خود ہندوستانیوں سے، یعنی خالص جمہوریت سے اور عام لوگوں کے غلبے سے بچائے۔

غرض گول میز کانفرنس کے ہندوستانی نمائندے یعنی نہ صرف وہ لوگ جو کھلے ہوئے رجعت پسند اور فرقہ پرست تھے بلکہ وہ بھی جو اپنے آپ کو ترقی پسند اور قوم پرست کہتے تھے، برطانوی حکومت کے ساتھ بہت سی مشترک اغراض رکھتے تھے۔ ہم حیران تھے کہ لفظ قوم پرستی کا مفہوم کس قدر وسیع ہے کہ اس کے دائرے میں ان لوگوں کے علاوہ وہ جو جنگ آزادی میں شریک ہو کر جیل بھیجے گئے وہ لوگ بھی

آجاتے ہیں جو ہمارے قید کرنے والوں سے مصافحہ کرکے ان کی صف میں شامل ہوگئے اور ان کے ساتھ مل کر ایک متحدہ پالیسی پر غور کرنے لگے۔ ان کے علاوہ ہمارے ملک میں بہادر اور لسان قوم پرستوں کا ایک اور گروہ تھا جو دل و جان سے سودیشی کی حمایت میں مصروف تھے اور ہم سے کہتے تھے کہ یہی سوراج کی جان ہے اور اپنے ہم وطنوں سے درخواست کرتے تھے کہ وہ اس کی خاطر قربانی نہیں کرنی پڑی بلکہ ان کے کاروبار کو اور انھیں خوب منافع ہوا۔ دوسرے لوگ جیل جارہے تھے یا لاٹھیاں کھارہے تھے اور وہ اپنی دکانوں میں بیٹھے روپے گن رہے تھے۔ آگے چل کی جب جارحانہ قوم پرستی ذرا خطرناک چیز ہوگئی تو انھوں نے اپنی تقریروں کی لی دھیمی کردی۔ ''انتہاپسندوں'' کو برا بھلا کہنے لگے اور حکومت سے معاہدے کرنے لگے۔

سچ پوچھئے تو ہمیں اس کی کچھ پروانہ تھی کہ گول میز کانفرنس کیا فیصلہ کرتی ہے۔ یہ ہم سے بہت دور ایک بے اصل اور بے جان چیز تھی۔ اصل کش مکش ہمارے شہروں اور گاؤں میں ہورہی تھی۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ ہماری کوشش جلد ختم ہونے والی نہیں اور ہمیں بہت سے خطروں کو سامنے ہے۔ پھر بھی ۱۹۳۰ء کے واقعات کو دیکھ کر ہمیں یہ بھروسا ہوگیا تھا کہ ہماری قوم میں بڑی قوت اور بڑا دم ہے اور یہ بھروسا دل میں لئے ہوئے ہم مستقبل کا مقابلہ کررہے تھے۔

آخر دسمبر یا شروع جنوری میں ایک بات ایسی ہوئی جس سے ہمیں سخت صدمہ پہنچا۔ سری نواس شاستری صاحب نے اڈنبرا میں (جہاں انھیں غالباً اعزازی شہریت پیش کی گئی تھی) اپنی تقریر کے دوران میں کسی قدر حقارت کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر کیا جو ہندوستان میں سول نافرمانی کے سلسلے میں قید ہورہے تھے۔ ان کی یہ تقریر خصوصاً اس موقع پر ہمارے دل میں نشتر کی طرح چبھ گئی اس لئے کہ سیاسی اختلافات کے باوجود ہم ان کی عزت کرتے تھے۔

مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے گول میز کانفرنس کو برخواست کرتے ہوئے حسب معمول ایک برادرانہ تقریر کی اور اس میں اشارتاً کانگرس سے اپیل کی کہ اپنی بدعنوانیوں کو چھوڑ کر اس مبارک برادری میں شامل ہو جائے۔ اس زمانے میں یعنی وسط جنوری ۱۹۳۱ء میں الہ آباد میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور دوسرے مسائل کے سلسلے میں مسٹر میکڈانلڈ کی اس تقریر اور اس پر بھی غور کیا گیا۔ میں ان دنوں نینی جیل میں تھا اور رہا ہونے کے بعد مجھے اس جلسے کی کاروائی کا حال معلوم ہوا۔ والد ابھی کلکتے سے واپس آئے ہوئے تھے اور اگرچہ ان کی طبیعت بہت خراب تھی، لیکن ان کے اصرار سے بس ممبران کے بستر کے گرد جمع ہو کر اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ کسی نے یہ رائے دی کہ مسٹر میکڈانلڈ کی دلجوئی کی لئے ہمیں سول نافرمانی کی تحریک دھیمی کر دینی چاہئے۔ اس سے والد کو غصہ آ گیا۔ وہ جوش میں اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے کہ جب تک ہمارا قومی مقصد حاصل نہ ہو جائے میں ہرگز صلح کے لئے تیار نہیں۔ اگر اور سب میدان سے ہٹ جائیں گے تو میں اکیلا لڑوں گا۔ یہ اشتعال ان کے لئے بہت مضر تھا اور ان کا بخار اور تیز ہو گیا۔ آخر ڈاکٹروں نے کسی نہ کسی طرح لوگوں کو ہٹایا کہ انھیں تنہائی میں کچھ سکون ہو۔

زیادہ تر ان کی وجہ سے ورکنگ کمیٹی نے ایک سخت رزولیوشن پاس کیا مگر اس کے شائع ہونے سے پہلے سر تیج بہادر سپرو اور سری نواس شاستری صاحب کا تار والد کے نام پہنچا جس میں ان کے ذریعہ سے کانگرس سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ ان دنوں حضرات سے گفتگو کرنے سے پہلے کوئی فیصلہ نہ کرے۔ وہ انگلستان سے روانہ ہو چکے تھے۔ اور عنقریب ہندوستان پہنچنے والے تھے۔ انھیں یہ جواب دیا گیا کہ کانگرس پہلے ہی ایک روزلیوشن (۱) پاس کر چکی ہے۔ مگر یہ اس وقت تک اخباروں میں شائع نہیں کیا جائے گا جب تک آپ آ کر ہم سے گفتگو نہ کر لیں۔

ہمیں جیل کے اندر خبر نہ تھی کہ باہر یہ کچھ ہو رہا ہے۔ البتہ اتنی سن گن مل گئی تھی

کہ کوئی نیا قصہ چھڑا ہوا ہے اور اس سے ہمیں کسی قدر تشویش تھی، مگر سب سے زیادہ فکر ہمیں اس کی تھی کہ ۲۶ جنوری یعنی یوم آزادی قریب ہے دیکھئے یہ کس طرح منایا جاتا ہے۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ اس دن سارے ملک میں عام جلسے ہوئے جس میں آزادی کے رزولیوشن کی توثیق کی گئی اور اسی مضمون کی ایک تجویز'' یادآوری کے روزولیوشن'' کے نام سے پاس کی گئی۔ اس سال یوم آزادی کے منانے کا انتظام کرنا'' ایک حیرت انگیز'' کارنامہ تھا اس لئے کہ نہ تو اخباروں اور مطبعوں سے کوئی مدد مل سکتی تھی اور نہ ڈاک اور تار سے کام لیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی سارے ملک میں بے شمار قصبوں اور دیہات میں قریب قریب ایک ہی وقت جلسے کئے گئے اور ان میں ایک ہی مضمون کا رزولیوشن پاس ہوا۔ ان میں سے اکثر جلسے قانونی ممانعت کے باوجود منعقد ہوئے اور پولیس نے انھیں زبردستی منتشر کر دیا۔

ہم ۲۶ جنوری کو بنی جیل میں بیٹھے، جانے والے سال کے واقعات اور آنے والے سال کی توقعات پر غور کر رہے تھے۔ دوپہر کے قریب یکا یک اطلاع ملی کہ والد کی حالت نازک ہے اور مجھے فوراً گھر جانا چاہیے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میری رہائی کا حکم ہو گیا ہے۔ رنجیت بھی میرے ساتھ روانہ ہوئے۔

اسی روز شام کو سارے ہندوستان کے جیلوں سے اور بہت سے لوگ بھی رہا کئے جا رہے تھے۔ یہ سب ورکنگ کمیٹی کے اصل یا قائم مقام ممبر تھے۔ حکومت انھیں موقع دے رہی تھی کہ ایک جگہ جمع ہو کر صورت حال پر غور کریں۔ چنانچہ میں بھی شام کو بہر حال رہا ہو جاتا۔ مگر والد کی حالت کے خراب ہو جانے کی وجہ سے چند گھنٹے پہلے چھوڑ دیا گیا تھا۔ کملا بھی ۲۶ دن قید رہنے کے بعد اس روز لکھنؤ جیل سے رہا کر دی گئی۔ اس لئے کہ وہ بھی ورکنگ کمیٹی کی قائم مقام ممبر تھی۔

---

(۱) یہ روزلیوشن کتاب کے آخر میں ضمیمہ (ج) میں درج ہے۔

میرے والد کی وفات

میں نے اپنے والد کو دو ہفتے کے بعد دیکھا، اس سے پہلے وہ ۱۲ جنوری کو مجھ سے ملنے نینی گئی تھے اور اس وقت میں ان کی صورت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اب ان کی حالت اور بھی خراب تھی، چہرہ پہلے سے بھی زیادہ سوج گیا تھا۔ ان سے بات نہیں کی جاتی تھی اور ان کے حواس بھی بعض وقت ٹھیک نہیں رہتے تھے مگر ان کے ارادے کی مضبوطی کا وہی حال تھا اور اسی کی وجہ سے ان کا جسم اور دماغ کام کرتا رہا۔

وہ مجھے اور رنجیت کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ دو ایک روز کے بعد رنجیت (جو ورکنگ کمیٹی کے زمرے میں نہیں آئے تھے) پھر نینی جیل بھیج دئے گئے۔ اس کا والد کو بہت قلق ہوا وہ بار بار انھیں پوچھتے اور شکایت کرتے کہ لوگ دور دور سے انھیں دیکھنے آتے ہیں مگر ان کا داماد ان سے چھڑا لیا گیا ہے۔ ڈاکٹروں کو ان کی اس بے چینی سے تشویش تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے لئے اچھا نہیں ہے۔ تین چار روز کے بعد غالباً ڈاکٹروں کی تحریک سے صوبہ متحدہ کی حکومت نے رنجیت کو رہا کر دیا۔

۲۶ جنوری کو جس دن میری رہائی ہوئی گاندھی جی بھی یروداجیل سے رہا کر دئے گئے۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ انہیں الہ آباد بلاؤں اور جب میں نے ان کی رہائی کا ذکر والد سے کیا تو انھوں نے بھی ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ دوسرے ہی دن گاندھی جی خیر مقدم کے ایک زبردست جلسے کے بعد، جیسا بمبئی میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، بمبئی سے روانہ ہو گئے۔ وہ رات گئے الہ آباد پہنچے مگر والد انکے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کے آنے سے اور تسلی کے چند کلموں سے جو انھوں نے کہے والد کو بہت سکون ہوا اور میری والدہ کو بہت ہی تسکین ہوئی۔

اس زمانے میں ورکنگ کمیٹی کے اصلی اور قائم مقام ممبر جو قید سے رہا ہوئے تھے بیکار بیٹھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ جلسے کی کوئی اطلاع آئے۔ ان میں

سے بہت سے والد کی طرف سے فکر مند تھے اور فوراً الہ آباد آنا چاہتے تھے چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ جلسہ فوراً کیا جائے اور ان سب کو الہ آباد بلا لیا جائے۔ دو روز کے بعد ان میں سے تیس چالیس پہنچ گئے اور ان کا جلسہ سوراج بھون میں ہوا۔ جو ہمارے گھر سے ملا ہوا ہے۔ میں کبھی کبھی ان جلسوں میں جایا کرتا تھا مگر اس قدر بدحواس تھا کہ ان میں اچھی طرح حصہ نہیں لے سکتا تھا اور مجھے بالکل یاد نہیں کہ ان میں کیا فیصلہ کیا گیا۔ غالباً یہی طے ہوا کہ سول نافرمانی جاری رکھی جائے۔

یہ سب پرانے دوست اور رفیق جو وہاں موجود تھے، جن میں سے اکثر سیدھے جیل سے چھوٹ کر آئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ کوئی دن میں پھر قید کر دئے جائیں گے والد سے مل کر ان کو خدا حافظ کہنا چاہتے تھے۔ غالب خیال یہی تھا کہ اس کے بعد ان کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ وہ صبح اور شام کے وقت دو دو تین تین کر کے آتے تھے اور والد بڑے اصرار سے آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنے رفیقوں سے ملتے تھے۔ یوں تو وہ بت بنے بیٹھے رہتے تھے اس لئے کہ ان کے چہرے کو جو حالت تھی اس کی وجہ سے کوئی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی تھی، مگر جب ان کے دوست اور رفیق ایک ایک کر کے آتے تو ان کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر ہوتا کہ وہ انھیں پہچانتے ہیں۔ ان کا سر کسی قدر جھک جاتا اور ان کے ہاتھ پرنا مکرنے کے لئے جڑ جاتے۔ انھیں بات کرنی مشکل تھی۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی دو ایک لفظ کہہ دیتے تھے۔ ان کی طاقت جواب دے چکی تھی مگر ان کے چہرے سے شاہانہ جلال ٹپکتا تھا۔ میں انہیں دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ نہ جانے ان کے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہوں گے۔ خدا معلوم انھیں ہماری جدوجہد میں کوئی دلچسپی باقی ہے یا نہیں؟ ان کے چہرے سے اکثر ایک اندرونی کشمکش کے آثار ظاہر ہوتے تھے جیسے خیالات کا سلسلہ ان کے قابو سے نکلا جاتا ہو اور وہ اسے پکڑنا چاہتے ہوں۔ یہ کش مکش آخر وقت تک جاری رہی انھوں نے ہار نہیں مانی۔ کبھی کبھی وہ بالکل ہوش و حواس کی

باتیں کرنے لگتے تھے۔ اس وقت بھی جب ان کے گلے سے بالکل آواز نہیں نکلتی تھی وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے کاغذ کے پرچوں پر لکھ دیتے تھے۔

انھیں ورکنگ کمیٹی کے جلسوں سے جو برابر کے مکان ہو رہے تھے تقریباً کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ دو ہفتے پہلے انھیں ان چیزوں سے بہت جوش آتا مگر اب انھیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان سے بہت دور پہنچ گئے ہیں۔ انھوں نے ایک بار گاندھی جی سے کہا'' مہاتما جی اب میرا چل چلاؤ ہے۔ میں سوراج دیکھنے کے لئے نہیں رہوں گا۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ نے لڑائی جیت لی اور سورج آنے ہی والا ہے۔''

اکثر لوگ جو دوسرے شہروں اور صوبوں سے انھیں دیکھنے آئے تھے رخصت ہو گئے صرف گاندھی جی اور چند خاص دوست اور عزیز رہ گئے۔ تینوں مشہور ڈاکٹر یعنی مختار احمد انصاری، بدھان چندرائے اور جیوراج مہتا جو ان کے پرانے دوست تھے اور جن کے متعلق وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی جان ان کے سپرد کر دی ہے، آخر تک ساتھ رہے۔ چوتھی فروری کی صبح کو ان کی طبیعت بظاہر کچھ سنبھل گئی اور یہ طے کیا گیا کہ اس سے فائدہ اٹھا کر انھیں لکھنؤ لے جائیں جہاں ایکسرے کے علاج کے لئے الہ آباد سے زیادہ سہولتیں موجود تھیں۔ اس دن ہم انھیں موٹر سے لکھنؤ لے گئے اور گاندھی جی مع اور بہت سے لوگوں کے ہمارے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ ہم بہت آہستہ آہستہ جا رہے تھے مگر پھر بھی وہ بتہ مضمحل ہو گئے۔ دوسرے دن بظاہر کچھ سنبھل گئی اور یہ طے کیا گیا کہ اس سے فائدہ اٹھا کر انھیں لکھنؤ لے جائیں جہاں ایکسرے کے علاج کے لئے الہ آباد سے زیادہ سہولتیں موجود تھیں۔ اس دن انھیں موٹر سے لکھنؤ لے گئے اور گاندھی جی مع اور بہت سے لوگوں کے ہمارے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ ہم بہت آہستہ آہستہ جا رہے تھے مگر پھر بھی وہ مضمحل ہو گئے۔ دوسرے دن بظاہر ان کی تکان دور ہو گئی مگر اور آثار کچھ اچھے نہ تھے۔ اگلے دن یعنی

چھ فروری کو صبح تڑکے میں ان کی پٹی کے پاس بیٹھا تھا رات بھر انھیں بڑی تکلیف اور بے چینی رہی تھی۔ دفعتاً مجھے ان کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آئے اور بے چینی کی کیفیت دور ہوگئی۔ میں یہ سمجھ کر خوش ہوا کہ انھیں نیند آ گئی ہے مگر میری والدہ حقیقت کو سمجھ گئیں اور چیخ کر رونے لگیں۔ میں نے ان سے التجا کی کہ خاموش رہئے۔ ان کو نیند ان کی آخری نیند تھی جس سے انھیں کوئی نہیں جگا سکتا تھا۔

ہم اسی دن انکی لاش موٹر سے الہ آباد لے گئے۔ میں اسی گاڑی میں بیٹھا تھا اور اسے چلا رہا تھا۔ والد کا معتمد خدمت گار ہری بھی ہمارے ساتھ تھا۔ دوسری گاڑی میں والدہ اور گاندھی جی تھے۔ اس کے پیچھے اور گاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ میری عقل خبط تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ مسلسل واقعات اور لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے میں کچھ سوچ نہیں سکتا تھا۔ لکھنؤ میں لوگوں کا زبردست مجمع جو یہ خبر سنتے ہی اکٹھا ہو گیا تھا، لاش کو قومی جھنڈے میں لپیٹ کر موٹر میں جس پر ایک بڑا سا جھنڈا لگا ہوا تھا لکھنؤ سے الہ آباد لے جانا، الہ آباد پہنچنا تعزیت کرنے والوں کا ہجوم جو میلوں تک چلا گیا تھا، یہ سب باتیں مجھے خواب سی یاد ہیں۔ گھر پر کچھ رسمیں ادا کی گئیں اور اس کے بعد آرتھی بے شمار مجمع کے ساتھ گنگا کی طرف روانہ ہوئی۔ جاڑے کی شام تھی اندھیرا چھا رہا تھا، گنگا کے کنارے بڑے بڑے شعلے اٹھ رہے تھے اور اس جسم کو جلا کر خاک کر رہے تھے جو ہم خاندان والوں کو اور ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کو دل و جان سے عزیز تھا۔ گاندھی جی نے مجمع کو مخاطب کر کے ایک چھوٹی سے تقریر کی اور اس کے بعد ہم سب خاموشی سے اپنے اپنے گھر چلے آئے۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور ہم انتہائی کا درد اور غم کا بوجھ دل پر لئے ہوئے واپس آ رہے تھے۔

میرے اور والدہ کے نام ہمدردی کے ہزاروں پیام آئے۔ لارڈ ارون اور لیڈی ارون نے بھی مناسب الفاظ میں ہمدردی کا اظہار کیا۔ لوگوں کی اس بے

پایاں دلسوزی اور ہمدردی سے ہمارے دل میں درد کی کھٹک کچھ کم ہوئی مگر سب سے بڑھ کر جس چیز نے میری والدہ کو اور ہم سب کو اس جانکاہ صدمے کے برداشت کرنے میں مدد دی وہ گاندھی جی کی موجودگی تھی۔ جن میں غمزدوں کو تسکین دینے اور شکستہ دلوں کو جوڑنے کی عجیب وغریب قوت ہے۔

مجھے کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ والد ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ تین مہینے کے بعد میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ لنکا گیا ہوا تھا اور نوارا ایلیا میں چند روز کے لئے سکون واطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ والد کو یہاں کی آب وہوا راس آئے گی۔ لاؤ ان کو بلا بھیجیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں کچھ دن آرام کرلیں گے۔ میں ان کے نام الہ آباد تار بھیجتے بھیجتے رہ گیا۔

لنکا سے الہ آباد واپس آنے کے بعد دن ڈاک میں ایک عجیب خط آیا۔ لفافہ پر میرا پتہ والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور خدا جانے کن کن ڈاکخانوں کے بے شمار مہریں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی حیرت سے اسے کھولا تو معلوم ہوا کہ واقعی والد کا خط ہے مگر ۲۸ فروری ۱۹۲۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ مجھے ۱۹۳۱ء کے وسط میں، یعنی ساڑھے پانچ سال کے بعد ملا۔ والد نے یہ خط ۱۹۲۶ء میں میرے اور کملا کے یورپ روانہ ہونے سے ایک روز پہلے احمد آباد سے لکھا تھا اور اطالوی لائڈ کمپنی کے اس جہاز کے پتے سے، جس سے ہم روانہ ہونے والے تھے بمبئی بھیجا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاز کی روانگی کے بعد پہنچا اور پھر خدا جانے کہاں کہاں پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ کسی من چلے نے میرے پاس بھیج دیا۔ عجیب بات ہے کہ یہ الوداعی خط تھا۔

دہلی کا معاہدہ

جس روز میرے والد کا انتقال ہوا اسی دن، بلکہ قریب قریب اسی وقت گول میز کانفرنس کے بہت سے ممبر بمبئی میں جہاز سے اترے۔ سری نواس شاستری صاحب، سر تیج بہادر سپرو اور شاید بعض حضرات جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا، سیدھے الہ آباد پہنچے۔ گاندھی جی اور کانگرس ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبر وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ہمارے گھر پر چند نج کے جلسے ہوئے جن میں گول میز کانفرنس کے حالات بیان کئے گئے۔ سب سے پہلے ایک قابل ذکر واقعہ پیش آیا۔ سری نواس شاستری صاحب نے خود بخود اپنے الفاظ پر، جو انھوں نے اڈنبرا میں کہے تھے افسوس ظاہر کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ''میں اپنے ماحول سے بہت متاثر ہو جاتا ہوں اور ''جوش خطابت'' کے سیلاب میں بہہ کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہوں''

گول میز کانفرنس کے نمائندوں نے سوائے ان باتوں کے جو ہمیں پہلے سے معلوم تھیں کوئی نئی بات نہیں کہی۔ البتہ انھوں نے یہ ضرور بتایا کہ پردے کے پیچھے کیا سازشیں ہو رہی تھیں، فلاں ''سر'' نے کیا فرمایا تھا۔ اور فلاں لارڈ نے کیا ارشاد کیا تھا۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ ہمارے دوست ہندوستانی اعتدال پسند، بڑے بڑے حکام کی ذاتی گفتگو اور گپ شپ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اصولی باتوں اور ہندوستانی کے واقعی حالات کی طرف کم توجہ کرتے ہیں۔ اس بے ضابطہ گفت و شنید کا جو اعتدال پسند لیڈروں سے ہو رہی تھی، کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور ہمارا یہ خیال صحیح ثابت ہوا کہ گول میز کانفرنس بالکل بیکار چیز ہے۔ کسی شخص نے یہ رائے دی کہ گاندھی جی وائسرائے کو خط لکھیں کہ میں آپ سے مل کر صاف صاف باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے۔ اگرچہ میرے خیال میں انھیں یہ امید نہیں تھی کہ اس سے کوئی نتیجہ نکلے گا مگر اصولاً وہ اپنے مخالفوں سے ملنے اور ان سے ہر مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ انھیں اپنے خیال کے صحیح

ہونے کا اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتے تھے میں حریف کو قائل کرلوں گا۔ مگر ان کا مقصود صرف قائل کرنا ہی نہیں تھا بلکہ کچھ اور بھی ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ مخالفوں کے دل پر اثر پڑے، غصے اور بے اعتمادی کی دیواریں جو بیچ میں حائل ہیں، ہٹ جائیں اور انسانیت کے لطیف جذبات ابھر آئیں۔ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ بات حاصل ہوگئی تو لوگوں کو قائل کرنا آسان ہے اور اگر وہ قائل نہ بھی ہوں تو مخالفت کا جوش گھٹ جاتا ہے اور اس میں وہ تلخی نہیں رہتی۔ اپنے مخالفوں سے شخصی طور پر معاملہ کرنے میں انھیں اکثر فتح حاصل ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ محض اپنی شخصیت کے اثر سے وہ دشمن کو دوست بنا لیتے ہیں۔ بہت سے لوگ جو ان پر نکتہ چینی کرتے تھے اور ہنستے تھے ان کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے معترف بن گئے یا اگر مخالف بھی رہے تو ان کی مخالفت میں تضحیک کا رنگ مطلق نہیں رہا۔

گاندھی جی کو اپنی اس قوت کا احساس تھا اس لئے وہ اپنے مخالفوں سے ملنے کے لئے ہمیشہ خوشی سے تیار رہتے تھے۔ مگر افراد سے شخصی معاملات یا چھوٹے چھوٹے مسائل میں نبٹنا اور بات تھی اور برطانوی حکومت جیسی لاشخصی قوت سے جو شہنشاہی کے نشے میں سرشار تھی مقابلہ کرنا بالکل دوسری چیز تھی۔ اس لئے جب گاندھی لارڈ ارون سے ملنے گئے تو انھیں کامیابی کی کچھ زیادہ امید نہیں تھی۔ سول نافرمانی کی تحریک ابھی تک جاری تھی۔ اگرچہ حکومت سے گفت وشنید کی خبریں مشہور ہونے کی وجہ سے اس کا زور کم ہوگیا تھا۔

ملاقات فوراً منظور کرلی گئی اور گاندھی جی دہلی روانہ ہوگئے۔ انھوں نے چلتے وقت ہم سے کہا کہ اگر وائسرائے سے ایسی گفتگو ہوئی جس سے واقعی کس عارضی تصفیے کی امید ہوئی تو وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو بھی بلا بھیجیں گے۔ چند روز کے بعد ہم سب دہلی طلب کئے گئے تین ہفتے ہم وہاں رہے اور روزانہ طول طویل تھکا دینے

والی بحثیں ہوتی رہیں۔ گاندھی جی برابر لارڈ ارون سے ملتے رہے۔ مگر کبھی کبھی تین چار دن کا وقفہ بھی ہو جاتا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس عرصے میں حکومت ہند انڈیا آفس سے تبادلہ خیالات کرتی تھی بعض بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں یا الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے گاڑی رک جاتی تھی۔ ان میں سے ایک سول نافرمانی کے ''التو'' کا لفظ بھی تھا۔ گاندھی جی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ سول نافرمانی ہمیشہ کے لئے ترک نہیں کی جاسکتی اس لئے کے عام لوگوں کے ہاتھ میں یہی ایک ہتھیار ہے۔ البتہ یہ تحریک ملتوی ہوسکتی ہے۔ لارڈ ارون کو اس لفظ پر اعتراض تھا اور وہ چاہتے تھے۔ کہ ترک کا لفظ استعمال کیا جائے مگر اسے گاندھی جی نہیں مانتے تھے۔ آخر کار ''موقوف'' کے لفظ پر فیصلہ ہوا۔ بدیسی کپڑے اور شراب کی دکانوں کی پکٹنگ پر بڑی بحث رہی۔ ہمارا وقت زیادہ تر عارضی معاہدے کے شرطوں پر غور کرنے میں صرف ہوتا تھا، اور بنیادی مسائل پر بہت کم توجہ کی جاتی تھی۔ غالباً لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان بنیادی معاملات پر آگے چل کر بہتر فضا میں غور کیا جائے گا جو عارضی تصفیہ ہو جانے اور روزمرہ کی لڑائی موقوف ہونے کے بعد پیدا ہوگئی۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس وقت محض ایک عارضی صلح کی گفتگو ہو رہی ہے اور اس کے بعد اصل اختلافی مسائل پر بحث کرنے کے باری آئے گی۔

ان دنوں دلی میں طرح طرح کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ بہت سے غیر ملکی خصوصاً امریکی اخباروں کے نامہ نگار تھے، جو ہم سے اس بات پر خفا تھے کہ ہم انھیں کچھ بتاتے نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ انھیں گاندھی جی اور لارڈ ارون کی گفتگو کی خبریں ہم سے زیادہ دہلی کے سیکریٹریٹ سے ملتی ہیں اور یہ بالکل صحیح تھا۔ ان کے علاوہ بہت سے بڑے بڑے لوگ گاندھی جی کے سلام کے لئے آئے تھے کیونکہ آج کل مہاتما کا ستارہ عروج پر تھا۔ بڑے مزے کا تماشا تھا کہ جو لوگ کبھی گاندھی جی اور کانگرس کے پاس بھی نہیں بھٹکے اور اکثر انھیں برا بھلا کہتے رہے اور اس کی تلافی

کرنے کے لئے دوڑے آتے تھے۔ بظاہر کانگرس کی بن آئی تھی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے۔ مصلحت اسی میں تھی کہ کانگرس کے لیڈروں سے بھی بنائے رکھیں۔ ایک سال کے بعد ان حضرات کا رنگ پھر بدلا اور انھوں نے بڑے زور شور سے کانگرس سے نفرت اور بیزاری کا اظہار شروع کر دیا۔

فرقہ پرستوں میں بھی ان معاملات سے ایک اہل چل مچ گئی اور وہ گھبرائے کہ کہیں نہیں دور میں ان کی بات نہ بگڑ جائے چنانچہ ان میں سے بہت سے لوگ مہاتما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں یقین دلایا کہ ہم فرقہ وارانہ مسئلے تصفیہ کرنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ اگر آپ اس معاملے میں پیش قدمی کریں تو فوراً فیصلہ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر انصاری کے مکان پر جہاں گاندھی جی اور ہم میں اکثر ٹھہرے ہوئے تھے، لوگوں کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا اور فرصت کے اوقات میں ہم انھیں دیکھ کر لطف اور فائدہ اٹھاتے تھے۔ چند سال سے ہمیں صرف شہروں اور گانوؤں کے غریبوں سے اور جیل کے قیدیوں سے سابقہ رہا تھا۔ ان ارباب دولت میں جو گاندھی جی سے ملنے آتے تھے، ہمیں انسانی فطرت کا ایک اور پہلو نظر آیا۔ یہ حضرت ہوا کے رخ پر چلتے تھے اور جہاں قوت اور اقتداری کی بو پاتے تھے، مسکراتے ہوئے جا پہنچتے تھے۔ ان میں سے اکثر ہندوستان کی برطانوی حکومت کے محکم ستون تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ اگر ہندوستان میں کوئی اور حکومت ہو گی تو یہ اسی طرح اس کے محکوم ستون بھی بن جائیں گے۔

گاندھی جی صبح تڑکے چہل قدمی کے لئے نئی دہلی جاتے تھے اور میں اکثر انکے ساتھ جایا کرتا تھا۔ ان سے گفتگو کرنے کا یہی ایک وقت تھا اس لئے کہ دن کے بقیہ حصے میں انکے اوقات چھوٹے چھوٹے حصوں میں سب بٹ جاتے تھے اور ہر لمحے کسی کام کے لئے یا کسی شخص کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ صبح کی چہل قدمی میں بھی کبھی کبھی

ملاقات کرنے والے خصوصاً غیر ملکی لوگ شریک ہو جاتے تھے یا کوئی دوست ذاتی
معاملات کرنے والے خصوصاً غیر ملکی لوگ شریک ہو جاتے تھے یا کوئی دوست ذاتی
معاملات میں مشورہ کرنے کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ ہم دونوں ماضی، حال اور خصوصاً مستقبل کے بہت سے امور کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار کانگرس کے مستقبل کے بارے میں انکے ایک خیال کو سن کر میں حیرت میں رہ گیا۔ میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ جب آزادی مل جائے گی تو کانگرس خود بخود ختم ہو جائے گی مگر ان کی رائے تھی کہ نہیں کانگرس کو باقی رہنا چاہئے مگر اس شرط پر، کہ وہ ایثار سے کام لے کر خود ہی یہ ضابطہ بنا دے کہ اس کا کوئی ممبر تنخواہ دار سرکاری ملازمت قبول نہ کرے گا اور اگر کوئی شخص عہدہ حاصل کرنا چاہے تو اسے کانگرس کی ممبری سے استفاد دینا ہوگا۔ مجھے اب یاد نہیں رہا کہ انھوں نے اس کے لئے کیا دلیلیں پیش کی تھیں مگر اصل مفہوم یہ تھا کہ اپنی بے تعلقی اور بے غرضی کی وجہ سے کانگرس وزارتوں اور حکومت کے دوسرے محکموں پر زبردست اخلاقی اثر ڈال سکے گی اور انھیں راہ راست سے ہٹنے نہیں دے گی۔

یہ ایک عجیب وغریب خیال ہے اور میرے لئے اس کا سمجھنا بہت دشوار ہے۔ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ یہ فرض محال اگر اس قسم کی کوئی جماعت ہو بھی تو ارباب غرض اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔ مگر عملی پہلو سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو اس گاندھی جی کے طرز خیال کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جو چیز انھیں مدنظر ہے اس کا تصور جدید سیاسی پارٹی کے بالکل برعکس ہے جو اس غرض سے قائم کی جاتی ہے کہ حکومت پر قبضہ کر کے ملک کے سیاسی اور معاشی نظام کی تشکیل اپنے اصولوں کے مطابق کرے اور اس قسم کے پارٹی سے بھی مختلف جو آج کل اکثر دیکھنے میں آتی ہے اور (بہ قول مسٹر ر۔ہ ٹانی کے) زیادہ سے زیادہ گدھوں کو زیادہ خشکہ کھلانے کے سوا کوئی کام نہیں کرتی۔

گاندھی جی کے ذہن میں جمہوریت کا ایک مافوق الطبعی تصور ہے۔ اسے اکثریت، یا نمائندگی کے رسمی طریقے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی بنا خدمت اور ایثار پر ہے اور اس میں صرف اخلاقی اثر سے کام لیا جاتا ہے۔ اپنے ایک بیان میں جا حال (۱۷ستمبر۱۹۳۴ء) ہی میں شائع ہوا ہے، انھوں نے جمہوریت پسند کی نئی تعریف کی ہے۔ ان کا دعوی ہے کہ وہ پیدائشی جمہوریت پسند ہیں اور اس سلسلے میں فرماتے ہیں ''غریب سے غریب آدمیوں کی دل و جان سے حمایت کرنا، ان کی سی زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھنا اور حتی الامکان انکے میعار تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔ اگر جمہوریت پسند ہوں۔'' آگے چل کر وہ جمہوریت کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ کانگرس کی جمہوریت اور اس کے اثر کی بنا ان نمائندوں کی تعداد پر نہیں جو اسکے سالانہ اجلاس میں شریک ہوتے ہیں بھلکہ اس روز افزوں خدمت پر ہے جو وہ اب تک انجام دیتی رہی ہے۔ مغربی جمہوریت معرض امتحان میں ہے اور اس کی ناکامیابی ثابت ہوچکی ہے۔ خدا کرے ہندوستان کو یہ شرف حاصل ہو کہ وہ جمہوریت کے ایک صحیح علم کی بنا ڈالے اور اس کی کامیابی آنکھوں سے دکھا دے''

''بد دیانتی اور یا کری جمہوریت کا لازمی نتیجہ نہیں ہونا چاہیے اگر چہ آج کل یقیناً ایسا ہی ہے۔ کثرت تعداد کو جمہوریت کا نفسی معیار قرار دینا غلطی ہے۔ یہ بات جمہوریت کے منافی نہیں کہ چند آدمی اپنی قوم کی روح اس کی امیدوں اور حوصلوں کی نمائندگی کرتے ہوں۔ میرا دعوی ہے کہ جمہوریت کا نفسی معیار قرار دینا غلطی ہے۔ یہ بات جمہوریت کے منافی نہیں کہ چند آدمی اپنی قوم کی روح اس کی امیدوں اور حوصلوں کی نمائندگی کرتے ہوں۔ میرا دعوی ہے کہ جمہوریت تشدد کے طریقوں سے نشو و نما نہیں پا سکتی۔ جمہوریت کی روح کسی قوم میں باہر سے زبردستی

نہیں پھونکی جاسکتی بلکہ اندر سے خود بخود ابھرتی ہے۔"

جیسا کہ گاندھی جی خود تسلیم کرتے ہیں، ان کی جمہوریت مغربی جمہوریت نہیں ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ یہ کسی حد تک اشتمالیوں کے تصور جمہوریت سے مشابہت رکھتی ہے کیونکہ اس میں بھی مافوق الطبعی رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اشتمالیوں کیا یک چھوٹی سی جماعت بعض اوقات یہ دعوی کرتی ہے کہ وہ جمہور کی خواہشات اور ضروریات کی نمائندہ ہے خواہ جمہور کو خود ان خبروں کا احساس بھی نہ ہو۔ ان کے ذہن میں جمہور کا ایک مافوق الطبعی تصور ہے اور وہ اسی کی نمائندگی کا دعوی کرتے ہیں۔ مگر یہ مشابہت بہت خفیف ہے۔ دونوں کے اصول اور عمل میں خصوصاً طریق کار اور تشدد کے معاملے میں بڑا زبردست اختلاف ہے۔

خواہ گاندھی جی جمہوریت پسند ہوں یا نہ ہوں مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کے نمائندے ہیں اور محض نمائندے ہی نہیں بلکہ ان کی روح رجتماعی کے اوتار بن گئے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کا ذہنی معیار کسانوں کے برابر ہے۔ وہ اعلیٰ دماغ، لطیف جذبات، نفیس مذاق اور وسیع تخیل رکھتے ہیں۔ ان میں تمام انسانی صفات موجود ہیں، مگر اصل میں وہ ایک سادھو ہیں جس نے ضبط نفس کی بدولت اپنی خواہشات اور جذبات کو روحانیت کی بلند سطح دیا ہے۔ ان کی زبردست شخصیت مقناطیس کی سی کشش رکھتی ہے اور لوگوں کے دل میں محبت اور عقیدت کے شدید جذبات پیدا کرتی ہے۔ بھلا ایک کسان میں یہ باتیں کہاں سے آسکتی ہیں؟ مگر اس کے باوجود مہا کسان ہیں، دنیا کو ایک کسان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہندوستان کسانوں ہی کا ملک ہے اور گاندھی جی اپنے ملک کے رگ وریشے سے واقف ہیں۔ ان کا ہاتھ ہندوستان کی نبض پر رہتا ہے اور وہ اس کی خفیف سی حرکت کو پہچانتے ہیں۔ وہ قریب قریب وجدانی طور پر صورت حال کا بالکل صحیح اندازہ کر لیتے ہیں۔ انھیں تنت کے وقت کام کرنے کا ڈھب

خوب آتا ہے۔

ان کی ذات نہ صرف برطانوی حکومت کے لئے بلکہ خود ان کے ہموطنوں اور ہمدموں کے لئے ایک معما ہے۔ غالباً موجودہ زمانے میں کسی اور ملک میں ان کا وجود بے محل ہوتا۔ مگر ہندوستان اب تک پاپ اور کمتی اور اہنسا کا نام لینے والے دھرماتماؤں کی بات سمجھتا ہے اور سمجھتا نہیں تو مانتا ضرور ہے۔ اس ملک کی دیو مالا ان سادھوؤں کی کہانیوں سے بھری ہوئی ہے، جنھوں نے اپنے تیاگ اور تپسیا کے زور سے ''نیکی کا پہاڑ'' بنا کر کھڑا کر دیا ہے جس نے بعض چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی حکومت کی جڑیں ہلا دیں اور دنیان میں کایا پلٹ کر دی۔ جب میں گاندھی جی کی حیرت انگیز قوت عمل اور قوت نفس دیکھتا ہوں جو روحانیت کے کسی لازوال سرچشمہ سے ابلتی چلی آئی ہے تو مجھے اکثر ان کہانیوں کا دھیان آ جاتا ہے۔ وہ دنیا کی معمولی ٹکسال کے ڈھلے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ کسی اور ہی نایاب دھات کے بنے ہوئے ہیں اور اکثر ان کی آنکھوں میں ایک نامعلوم حقیقت کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔

سارے ہندوستان پر، یہاں تک کہ اس کی شہری زندگی بلکہ اس کی نئی صنعتی زندگی پر بھی کسانوں کا رنگ غالب ہے۔ اس لئے یہ قدرتی بات تھی کہ اس نے اپنے اس سوت بیٹے کو جو اس سے اس قدر مشابہ ہے اور پھر بالکل الگ بھی ہے۔ اپنا محترم اور محبوب لیڈر بنالیا۔ اس شخص نے ہندوستان کو پرانے بھولے ہوئے قصے یاد دلا دئے۔ اور اس کی آنکھوں کو خود اس کی روح کی جھلک دکھا دی۔ ہمارا ملک حال کی مصیبتوں کے بوجھ سے دبا ہوا بے کسی کے عالم میں ماضی کے بے جان کہانیوں اور مستقبل کے دھندلے خوابوں سے دل بہلایا کرتا تھا، مگر اس نے آ کر اس کے نراس دل کو آس اور اس کے خستہ جسم کو طاقت بخشی اور اس کی نظروں میں مستقبل کا ایک دلکش نقشہ پھرنے لگا۔ دو چہروں والے دیوتا جنیس کی طرح وہ ادھر

ماضی اور ادھر مستقبل کا منظر دیکھ رہا ہے اور دونوں کو ملا کر ایک ہم آہنگ مرقع بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہم میں سے اکثر کسانوں کے طرز خیال اور قدیم مذہب و معاشرت سے ٹوٹ کر الگ ہو گئے ہیں۔ ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم جدید زمانے کے لوگ ہیں اور ہمارے ذہن میں ''ترقی'' مشینوں کی صنعت، بہتر معیار زندگی اور اجتماعی تنظیم کے خیالات بسے ہوئے ہیں۔ ہم کسانوں کے نقطہ نظر کو رجعت پسندانہ سمجھتے ہیں اور اشتراکیت اور اشتمالیت کی طرف مائل ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم سیاست میں گاندھی جی کے ساتھ شریک ہو گئے اور ہم میں سے بہت سے دل و جان سے ان کے پیرو بن گئے۔ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے اور جو شخص گاندھی جی کو نہیں جانتا اسے کسی جواب سے تسکین نہیں ہوگی، شخصیت ایک سربستہ راز اور ایک عجیب و غریب قوت ہے جو انسانوں کے دلوں کو تسخیر کر سکتی ہے۔ ان میں یہ قوت بدرجہ کمال موجود ہے اور جو لوگ ان سے ملتے ہیں وہ انھیں اور ہی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ پہلے تو ان کی ذاتی کشش اپنا کام کرتی ہے مگر آخر میں لوگ عقلی حیثیت سے قائل ہو کر ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کے فلسفہ زندگی بلکہ ان کے بعض مقاصد سے بھی متفق نہیں تھے اور اکثر ان کے خیالات کو سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ مگر جو عملی تجویز انھوں نے پیش کی وہ ایک محسوس چیز تھی اور عقل کی کسوٹی پر پوری اترتی تھی۔ ہماری مریل سیاست نے بے عملی غنیمت معلوم ہوتا۔ گاندھی جی کے مردانہ اور موثر عمل نے جس کے ساتھ اخلاقیت اور روحانیت کی چمک دمک بھی تھی ہماری عقل اور جذبات دونوں کو مسخر کر لیا۔ انھوں نے ہمیں رفتہ رفتہ اپنی عملی تجویز کے صحیح ہونے کا قائل کر دیا۔ اور ہم ان کے فلسفے سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے ساتھ ہو گئے۔ شاید عمل اور اصول میں یہ تفریق جائز نہ تھی۔ اور اسی وجہ سے بعد میں ذہنی اختلافات اور جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمیں ایک مبہم سی امید تھی

کہ گاندھی جی عملی آدمی ہیں اور حالات کے تغیر سے بہت متاثر ہوتے ہے ں اس لئے وہ اسی طریقے سے کام کریں گے۔ جو ہمیں صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کم سے کم اب تک وہ صحیح رستے پر چل رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ اگر آگے چل کر ہماری ان کی رائیں الگ ہوگئیں تو دیکھا جائے گا۔ ابھی اسے الگ ہو جانا حماقت ہے۔

ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم لوگ معین اور واضح خیالات نہیں رکھتے تھے بلکہ کچھ مذبذب سے تھے۔ ہمیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ چاہے اصولی حیثیت سے ہماری رائے زیادہ صحیح ہو مگر گاندھی جی ہندوستان کو ہم سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ وہ شخص جس سے عام لوگوں کو اس درجہ عقیدت ہو یقیناً ان کی ضرورت جانتے ہیں۔ وہ شخص جس سے عام لوگوں کو اس درجہ عقیدت ہو یقیناً ان کی ضرورتوں اور آرزوؤں کا راز داں ہوگا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر ہم ان کو اپنا ہم خیال بنالیں تو عام لوگ خود بخود ہمارے ہم خیال بن جائیں گے اور گاندھی جی کو ہم خیال بنانا ممکن نظر آتا تھا اس لئے کہ کسانوں کا سا تصور حیات رکھنے کے باوجود وہ خلقی طور پر باغی اور انقلاب پسند واقع ہوئے تھے۔ وہ ہندوستان کی زندگی میں زبردست تغیرات پیدا کرنے پر تلے ہوئے تھے اور انجام کے دھڑکے سے ڈرنے والے نہ تھے۔

انھیں کی ذات تھی جس نے ہماری ست اور پست قوم کو منظم کر کے میدان عمل میں کھڑا کر دیا تھا اور پھر کس طرح؟ قوت کے دباؤ سے نہیں، مادی فائدے کی لالچ سے نہیں بلکہ ایک ہلکی سی نظر سے چند نرم لفظوں سے اور سب سے بڑھ کر اپنی ذاتی مثال سے۔ مجھے یاد ہے کہ ستیاگرہ کے ابتدائی زمانے میں یعنی ۱۹۱۹ء میں بمبئی کے عمر سوبانی انھیں ''غلاموں کے محبوب چابک زن'' کہا کرتے تھے۔ عمر کی زندگی نے وفا نہیں کی کہ وہ ہندوستان کی بدلی ہوئی حالت کو دیکھتے۔ ہم لوگ زیادہ خوش قسمت تھے۔ ۱۹۳۱ء کے آغاز میں فخر و مسرت سے دیکھ رہے تھے کہ بارہ سال میں ملک

کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ۱۹۳۰ء ہمارے لئے ایک عجیب وغریب سال تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی نے کچھ ایسا جادو کر دیا ہے کہ ملک کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ہم اتنے بے وقوف نہ تھے جو یہ سمجھتے کہ ہم برطانوی حکومت کے مقابلے میں قطعی طور پر کامیاب ہو گئے۔ ہماری خوشی حکومت پر غالب آنے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ہمیں اپنی قوم پر، اپنی عورتوں اور نوجوانوں اور بچوں پر فخر تھا۔ جنھوں نے اس تحریک میں کمال کر دکھایا۔ ان کی یہ قوت عمل ایک روحانی دولت تھی جو ہر زمانے میں قوم کے لئے قابل قدر ہوتی اور ہماری جیسی محکوم اور مظلوم قوم کے لئے تو اور بھی زیادہ قدر قیمت رکھتی تھی ہمیں یہ فکر تھی کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے یہ دولت ہمارے ہاتھ سے چلی جائے۔

مجھ پر گاندھی جی ہمیشہ مہربان تھے اور میرا خیال کرتے تھے خصوصاً والد کی وفات کی بعد مجھے ان سے اور بھی زیادہ تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ میری بات بہت غور سے سنتے تھے اور جہاں تک ممکن تھا مانتے بھی تھے۔ اس سے مجھے یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ میں اور میرے رفیق انھیں اشتراکیت کی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ اور انھوں نے خود کہہ دیا تھا کہ جوں جوں ان کا اطمینان ہوتا جائے گا وہ آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھاتے جائیں گے۔ مجھے قریب قریب یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن اشتراکیت کے بنیادی اصول کو قبول کر لیں گے اس لئے کہ مجھے موجودہ نظام کے تشدد، ناانصافی، اسراف اور مصیبت سے نجات پانے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ممکن ہے کہ انھیں ہمارے طریق کار سے اختلاف ہو لیکن ہمارے مقاصد سے اختلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت میرا یہ خیال تھا مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ گاندھی جی کے نصب العین اور اشتراکیوں کے مقاصد میں بنیادی اختلافات ہیں۔

اب میں پھر فروری ۳۱ء کے واقعات کے طرف رجوع کرتا ہوں۔ گاندھی

جی اور لارڈ ارون میں وقتاً فوقتاً گفتگو ہوتی رہی مگر ایک دن یہ سلسلہ ایک دم سے موقوف ہو گیا۔ کئی روز سے وائسرائے نے گاندھی جی کو نہیں بلایا تھا اور ہم سمجھتے تھے کہ صلح کی بات چیت ختم ہو گئی۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبر دہلی سے اپنے اپنے صوبوں کے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ روانگی سے پہلے ہم نے اپنے آئندہ منصوبوں او رسول نافرمانی کے متعلق (جو اصولاً اب تک جاری تھی) آپس میں مشورہ کیا۔ ہمیں یقین تھا کہ گفتگو ختم ہونے کا اعلان ہوتے ہی ہمیں آپس میں ملنے اور مشورہ کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ ہمیں یہ توقع تھی کہ ہم سب گرفتار ہو جائیں گے اور ہم سے لوگوں نے یہ کہا تھا کہ غالباً حکومت کانگرس کے خلاف پہلے سے زیادہ سخت کاروائی شروع کر دے گی اس لئے ہم نے کمیٹی کا ایک جلسہ کیا جو ہمارے نزدیک آخری جلسہ تھا اور اپنی تحریک کو چلانے کے متعلق مختلف رزولیوشن پاس کئے ان میں سے ایک رزولیوشن کسی قدر اہم تھا۔ اب تک یہ ہوتا تھا کہ ہر قائم مقام صدر گرفتار ہونے پر اپنا جانشین نامزد کرتا تھا اور ورکنگ کمیٹی میں جو جگہیں خالی ہوتی تھیں وہ بھی اسی طرح پر کی جاتی تھیں۔ یہ قائم مقام ورکنگ کمیٹیاں بہت کم کام کر سکتی تھیں وہ بھی اسی طرح پر کی جاتی تھیں۔ یہ قائم مقام ورکنگ کمیٹی میں جو جگہیں خالی ہوتی تھیں وہ بھی اسی طرح پر کی جاتی تھیں۔ یہ قائم مقام ورکنگ کمیٹیاں بہت کم کام کر سکتی تھیں۔ اور ان کے اختیارات بھی بہت محدود تھے وہ بس جیل ہی جانے کے کام کے تھیں۔ اور پھر یہ خوف بھی تھا کہ اگر قائم مقاموں کے نامزد کرنے کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا تو کہیں کانگرس بدنام نہ ہو جائے۔ اس میں طرح طرح کے خطرے تھے اس لئے دہلی میں ورکنگ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ آئندہ قائم مقام صدر اور قائم مقام ممبر نامزد نہ کئے جائیں۔ جب تک اصلی ورکنگ کمیٹی کے چند ممبر (یا ایک ممبر بھی) جیل سے باہر ہوں اس وقت تک پوری کمیٹی کی حیثیت سے کام کرتے رہیں۔ جب وہ سب گرفتار ہو جائیں تو کمیٹی باقی نہیں رہے گی مگر

(ہم نے بڑے طمطراق سے کہا) کمیٹی کے اختیارات ملک کے ہر مرد اور ہر عورت کو حاصل ہوں گے اور وہ لڑائی کو آخر وقت تک جاری رکھیں گے۔

اس رزولیوشن میں بڑی بہادری سے لڑائی کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا اور مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اس میں اس بات کا بھی اعتراف تھا کہ کانگرس کے صدر دفتر کے لئے یہ روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے کہ وہ ملک کے سب حصوں کی خبر رکھے اور باقاعدہ ہدایتیں جاری کر سکے۔ یہ مشکل اس وجہ سے پیش آتی تھی کہ ہمارے اکثر کارکن مشہور لوگ تھے اور کھلم کھلا کام کرتے تھے۔ انھیں حکومت جب چاہتی گرفتار کر لیتی۔ ۱۹۳۰ء میں خفیہ قاصدوں کے ذریعے سے ہدایات بھیجنے، رپورٹیں منگوانے اور معائنہ کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ طریقہ بہت کامیاب ہوا اور اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہم خفیہ پیام رسانی کا کام بہت اچھی طرح چلا سکتے ہیں مگر یہ بات ایک حد تک ہماری کھلی ہوئی تحریک کے لئے موزوں تھی اور گاندھی جی اس کو ناپسند کرتے تھے۔ جب مرکز سے ہدایتیں بھیجنا ناممکن تھا تو اس کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی کہ ہم تحریک چلانے کی ذمہ داری مقامی لوگوں کے سپرد کر دیں، ورنہ وہ ہدایتوں کے انتظار میں بیٹھے رہتے اور کچھ نہ کرتے ظاہر ہے کہ جب کبھی ممکن ہوتا تھا ہدایتیں بھی بھیج دی جاتی تھیں۔

غرض ہم نے یہ اور دوسرے رزولیوشن پاس کئے (جن میں سے کوئی ان واقعات کی وجہ سے جو بعد میں پیش آئے شائع یا نافذ نہیں ہوا) اور سفر کی تیاری کرنے لگے۔ عین اس وقت لارڈ ارون کے ہاں سے پھر طلبی ہوئی۔ اور گفت وشنید کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

۴ مارچ کو رات کے بارہ بجے تک ہم وائسرائے کے ہاں سے گاندھی جی کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ وہ دو بجے شب کو واپس آئے اور ہم لوگوں کو جگا کر کہا گیا کہ معاہدہ ہو گیا۔ ہم نے معاہدے کا مسودہ دیکھا۔ میں اس کی اکثر دفعات سے

واقف تھا اس لئے کہ ان پر بار بار بحث ہو چکی تھی مگر شروع ہی دفعہ نمبر ۲(۱) کو پڑھ کر جس میں تحفظات وغیرہ کا ذکر تھا، مجھے سخت دھچکا لگا۔ میں اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس وقت میں نے کچھ نہیں کہا اور ہم سب جا کر اپنے بستر پر لیٹ رہے۔

اب کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ ہمارا لیڈر قول دے چکا تھا۔ اگر ہمیں اس کے رائے سے اختلاف بھی تھا تو ہم کیا کرتے؟ اس کا ساتھ چھوڑ دیتے؟ اس سے قطع تعلق کر لیتے؟ اختلاف رائے کا اعلان کر دیتے؟ اس سے شاید ذاتی طور پر کسی شخص کو تسکین ہو جاتی مگر آخری فیصلے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ سول نافرمانی کی تحریک کم سے کم اس وقت ختم ہو چکی تھی اور اسے پھر سے اٹھانا خود اور ورکنگ کمیٹی کے بس کی بات نہ تھی اس لئے کہ حکومت یہ اعلان کر سکتی تھی کہ مسٹر گاندھی تصفیے پر راضی ہو گئے ہیں۔ مجھے اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں کو اس میں مطلق عذر نہ تھا کہ سول نافرمانی ملتوی کر دی جائے اور حکومت سے کوئی عارضی تصفیہ کر لیا جائے۔ ہمارے لئے یہ بات سہل نہ تھی کہ اپنے رفیقوں کو دوبارہ جیل بھیج دیں یا ان ہزاروں آدمیوں کی رہائی میں مانع ہوں جو اب تک قید میں تھے۔ جیل کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ہم آرام سے رات دن گذار سکیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم میں سے بعض اپنے آپ کو اس کا عادی بنا لیں اور یہ دعویٰ کریں کہ ہم اس جانفرسا زندگی کو کھیل سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ تین ہفتے سے گاندھی جی اور لارڈ ارون میں گفتگو ہو رہی تھی اس کی وجہ سے ملک کو یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ تصفیہ ہونے والا ہے۔ اگر ہم صلح سے قطعاً انکار کر دیتے تو لوگوں کو سخت مایوسی ہوتی۔ غرض ہم سب ورکنگ کمیٹی کے ممبر یقیناً یہ چاہتے تھے کہ عارضی تصفیہ ہو جائے (کیونکہ ظاہر تھا کہ قطعی فیصلے کی صورت ہی نہیں) بشرطیکہ ہمیں اپنے کسی اہم مطالبے سے دست بردار نہ ہونا پڑے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے اکثر مسائل سے جن پر بڑے زور شور سے بحث

ہوتی تھی، کچھ مطلب نہ تھا۔ مجھے تو سب سے زیادہ دو چیزوں سے دلچسپی تھی۔ ایک یہ کہ ہم اپنے کامل آزادی کے مطالبے سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹیں۔ دوسرے یہ کہ اس تصفیے کا صوبہ متحدہ کے کسانوں کی حالت پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ ہماری محصول نہ دینے یا لگان نہ دینے کی تحریک اب تک بہت کامیاب رہی تھی اور بعض علاقوں میں ایک پیسہ بھی وصول نہیں ہوا تھا۔ کسان میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ دنیا کی زراعتی حالت اور بگڑ گئی تھی۔ قیمتیں اور گر گئی تھیں اس لئے انھیں لگان ادا کرنا پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ ہماری محصول نہ دینے کی تحریک معاشی بھی تھی اور سیاسی بھی۔ میں یہ کہتا تھا کہا گر حکومت سے عارضی تصفیہ ہو گیا تو سول نافرمانی بند ہو جائے گی اور محصول نہ دینے کی تحریک کی سیاسی بنا ختم ہو جائے گی۔ مگر اس کے معاشی پہلو میں کیا فرق پڑے گا؟ قیمتوں کے اس قدر گر جانے کی وجہ سے کسانوں کو مطالبہ ادا کرنے میں جو معذوری ہے وہ تو بدستور باقی رہے گی۔ گاندھی جی نے یہ بات لارڈ ارون کو بہت وضاحت کے ساتھ سمجھا دی تھی۔ انھوں نے کہہ دیا تھا کہ محصول نہ دینے کی تحریک بند کر دی جائے گی مگر ہم کسانوں کو یہ مشورہ ہرگز نہیں دیں گے کہ اپنے مقدور سے زیادہ مطالبہ ادا کریں۔ اس معاملے میں حکومت ہند سے تفصیلی بحث نہیں کی سکتی تھی اس لئے کہ یہ صوبے کا معاملہ تھا۔ ہمیں یہ اطمینان دلایا گیا کہ صوبے کی حکومت بڑی خوشی سے ہم سے اس کے متعلق گفتگو کرے گی اور کسانوں کی مشکل کو حل کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گی۔ یہ ایک مبہم سا وعدہ تھا مگر ان حالات میں کوئی قطعی فیصلہ ہونا مشکل تھا۔ غرض اس وقت تو یہ مسئلہ اس طرح سے طے کر دیا گیا۔

اب دوسری چیز باقی رہی یعنی ہمارا کامل آزادی کا مقصد، معاہدے کی دفعہ ۲ کو پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ اس کی بھی خیر نہیں۔ کیا اسی دن کے لئے ہماری قوم اس بہادری سے سال بھر لڑتی رہی؟ کیا ہمارے سارے کارناموں اور لمبے چوڑے

دعوؤں کا یہی انجام ہونا تھا؟ کانگرس کا کامل آزادی کا روز ولیوشن کہاں گیا؟ ۲۶ جنوری کا عہد کیا ہوا؟ میں مارچ کی اس رات کو اپنے بستر پر پڑا یہ باتیں سوچ رہا تھا اور میرے دل پر اداسی چھائی ہوئی تھی، جیسے کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو اور اس کے ملنے سے قریب قریب مایوسی ہو۔

"دنیا کا انجام یہی ہوتا ہے
نہ دھماکہ نہ دھڑاکا بلکہ ٹائیں ٹائیں فش"

---

(۱) دفعہ ۲ معاہدہ دہلی (مورخہ ۵ مارچ ۱۹۳۱ء) جہاں تک دستور اساسی کے مسائل کا تعلق ہے آئندہ بحث کا دائرہ حکومت برطانیہ کی منظوری کی شرط پر معین کیا جاتا ہے تاکہ ہندوستان کی دستوری حکومت کی تجویز پر جو گول میز کانفرنس میں پیش ہو چکی ہے مزید غور کیا جا سکے۔ جس تجویز کا خاکہ وہاں تیار ہوا ہے اس کے اہم اجزا حسب ذیل ہیں:- وفاقی نظام۔ ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت کا قیام ان تحفظات کے ساتھ جو ہندوستان کے مفاد کے لئے ضروری ہوں مثلاً فوج، امور خارجہ، اقلیتوں کے حقوق، ہندوستان کی مالی ساکھ اور قرضوں کی ادائیگی۔

کراچی کانگرس

گاندھی جی کو کسی اور سے میری پریشانی کا حال معلوم ہوا اور دوسرے دن صبح کو انھوں نے مجھ سے کہا کہ میرے ساتھ ٹہلنے چلو۔ ہم دونوں میں بڑی طول طویل گفتگو ہوتی رہی اور انھوں نے مجھے یقین دلانا چاہا کہ ہم نے اپنا کوئی اہم مطالبہ ترک نہیں کیا۔ کسی اصول سے قدم نہیں ہٹایا۔ انھوں نے معاہدے کی دفعہ ۲ کی ایک خاص تشریح کی اور اسے اس فقرے کی بنا پر ''جو ہندوستان کے مفاد کے لئے ضروری ہوں'' ہمارے کامل آزادی کے مطالبے سے مطابقت دینا چاہتی۔ مجھے یہ زبردستی کی تاویل معلوم ہوئی اور میں نے اسے تسلیم نہیں کیا مگر ان باتوں سے میرا غصہ کسی قدر دھیما ہو گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ معاہدے کی اچھائی برائی ایک طرف، میں تو آپ کی اس عادت سے ڈرتا ہوں کہ آپ اچانک کوئی نئی بات کر کے ہمیں چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ آپ کی سیرت میں کوئی نامعلوم چیز ہے جسے چودہ برس کے گہرے تعلقات کے باوجود میں آج تک نہیں سمجھ سکا اور جس سے مجھے بہت اندیشہ ہے۔ انھوں نے اس نامعلوم عنصر کے وجود کا اعتراف کیا اور کہا کہ میں خود پہلے سے اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ کیا گزرے گا اور اس کیا نتیجہ ہوگا۔

دو تین روز میں عجب شش و پنج میں رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ اب معاہدے کے مخالفت کرنے یا اسے روکنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں رہا تھا۔ یہ منزل گذر چکی تھی اور میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ واقعے کی حیثیت سے تو اسے تسلیم کر لوں مگر اصولاً اپنے اختلاف رائے کا اظہار کر دوں۔ اسے سے میری خود بینی کو تسکین ہو جاتی۔ مگر اصل معاملے پر کیا اثر پڑتا؟ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ جو کچھ ہو چکا ہے اسے ہنسی خوشی مان لوں اور گاندھی جی نے معاہدے کی اس تاویل پر زور دیا تھا اور یہ کہہ دیا تھا کہ ہم پوری طرح کامل آزادی کے مطالبے پر قائم ہیں۔ انھوں نے لارڈ ارون سے مل کر انھیں یہ بات اچھی طرح جتا دی تا کہ اس وقت یا

آئندہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ اگر کانگرس نے گول میز کانفرنس میں نمائندہ بھیجا تو وہ اسی بنا پر اور اسی دعوے کے پیش کرنے کے لئے بھیجا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ لارڈ ارون اس دعوے کو تسلیم کر نہیں سکتے تھے مگر انہوں نے کانگرس کا یہ حق تسلیم کر لیا کہ وہ یہ دعوے پیش کر سکتی ہے۔

غرض میں نے سخت ذہنی کش مکش اور جسمانی تکلیف کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اس معاہدے کو تسلیم کر لوں اور دل و جان سے اسے پورا کرنے کی کوشش کروں۔ کوئی درمیانی صورت مجھے نظر نہیں آتی تھی۔

معاہدے سے پہلے اور اس کے بعد گاندھی جی اور لارڈ ارون میں جو ملاقاتیں ہوئیں ان میں گاندھی جی نے بہت اصرار کیا تھا کہ علاوہ سول نافرمانی کے قیدیوں کے جو اس معاہدے کے رو سے رہا ہونے والے تھے، دوسرے سیاسی قیدی بھی چھوڑ دئے جائیں۔ یہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ان میں سے بعض کو تحقیقات کے بعد سزا دی گئی تھی اور بعض بغیر الزام، تحقیقات یا اثبات جرم کے یوں ہی نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ بہت سے لوگ سالہا سال سے نظر بند تھے اور اس طرح بغیر تحقیقات قید کر دینے کے طریقے کے خلاف سارے ہندوستان خصوصاً بنگال میں جہاں اس کا سب سے زیادہ زور تھا، بہت ناراضی پھیلی ہوئی تھی۔" پینگوئین آئی لینڈ" کے نائب سپہ سالار (یا ڈرائی فس کے مقدمے کے مدعیوں) کی طرح حکومت کا خیال تھا کہ یہ لوگ بالفعل یا بالقوت تشدد پسند قسم کے انقلابی ہیں۔ گاندھی جی نے بہت زور دیا کہ چاہیے یہ معاہدے میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے مگر ان کی رہائی سیاسی کشیدگی کو دور کرنے اور بنگال میں طبعی فضا قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ مگر حکومت اس پر راضی نہیں ہوئی۔

اسی طرح بھگت سنگھ کی سزائے موت کو بدلوانے کے لئے گاندھی جی نے پورا زور لگایا مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اسے بھی معاہدے سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ

گاندھی جی سارے ہندوستان کی خواہش کے مطابق اس کے لئے علیحدہ کوشش کر رہے تھے مگر ان کی کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ اسی زمانے میں یعنی میرے والد کی وفات سے چند روز پہلے یا چند روز کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس سے مجھے ہندوستان کی تخویف پسند جماعت کی طبیعت کا اندازہ ہوا۔ ہمارے گھر ایک اجنبی شخص مجھ سے ملنے کے لئے آیا جس کا نام چندر شیکر آزاد تھا۔ میں پہلے اس سے کبھی نہیں ملا تھا۔ البتہ دس برس ہوئے ۱۹۲۱ء میں ترک موالات کی تحریک کے زمانے میں جب وہ اسکول چھوڑ کر جیل خانے گیا تھا تو میں نے اس کا نام سنا تھا۔ ان دنوں وہ پندرہ برس کا لڑکا تھا اور اسے جیل کے قواعد کی خلاف ورزی کے الزام میں کوڑے لگائے گئے تھے۔ آگے چل کر وہ تخویف پسندوں کی طرف ڈھل گیا اور شمالی ہند میں ان کا ممتاز لیڈر بن گیا۔ میں نے اس قسم کی افواہیں سنی تھیں۔ مگر مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے اس کے آنے سے مجھے کچھ تعجب سا ہوا۔ وہ میرے پاس اس لئے آیا تھا کہ ہم لوگوں کی رہائی کی وجہ سے لوگوں کو عام طور پر یہ توقع تھی کہ حکومت اور کانگرس میں صلح کی بات ہونے والی ہے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اگر صلح ہوگئی تو اس کی جماعت کو بھی امن نصیب ہوگا یہ نہیں۔ کیا وہ لوگ اب بھی اسی حال میں رہیں گے کہ راندہ قانون بنا کر کھدیرے جائیں، ان کے سروں کی قیمت مقرر رہو اور انھیں ہر وقت موت کو خوف رہے؟ یا اس کا کچھ امکان ہے کہ انھیں امن و امان کی زندگی بسر کرنی نصیب ہو؟ اس نے کہا کہ وہ اور اس کے بہت سے ساتھی اس کے قائل ہوگئے ہیں کہ خالی تخویف کے طریقے بیکار ہیں اور ان سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ مگر وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ صرف پرامن جدوجہد کے ذریعہ سے ہندوستان کو آزادی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ آگے چل کر تشدد سے کام لینا پڑے گا، مگر تخویف کی صورت میں نہیں۔ بہر حال وہ تخویف کو ہندوستان کی آزادی کے لئے مناسب سمجھتا تھا مگر وہ پوچھتا تھا

کہ جب اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا جائے اور لوگ اس کی جان لینے کے درپے ہوں تو آخر وہ کیا کرے۔ اس کے قول کے مطابق حال میں جس قدر تخویف کی وار داتیں ہندوستان میں ہوئیں وہ لوگوں نے صرف اپنی جان بچانے کے لئے کیں۔

میں آزاد سے یہ بات سن کر خوش ہوا اور آگے چل کر اس کی تصدیق بھی ہوگئی کہ تخویف پسندی کا عقیدہ اٹھتا جاتا ہے۔ اجتماعی حیثیت سے یہ چیز قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ انفرادی طور پر کہیں کہیں اس قسم کے واقعات پیش آتے تھے مگر ان کی کوئی خاص وجہ ہوتی تھی مثلاً ذاتی انتقام، یا افراد کی کج رائی۔ ان کی تہ میں کوئی عام اصول نہیں تھا۔ ظاہر ہے اس کے یہ معنی نہ تھا کہ پرانے تخویف پسند یا ان کے نئے رفیق عدم تشدد کے قائل ہو گئے ہیں یا برطانوی حکومت کے قدردان بن گئے ہیں۔ البتہ تخویف پسند کا خیال انکے دل سے نکل گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے اکثر فاشتی ذہنیت رکھتے ہیں۔

میں نے چندر شیکر آزاد کو اپنا سیاسی جدوجہد کا نظریہ سمجھانے اور اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ مگر اصل سوال یہ تھا کہ وہ اب کیا کرے؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ کوئی ایسی صورت نہیں نظر آتی تھی کہ اسے یا اس جیسے اور لوگوں کو چین سے بیٹھنا نصیب ہو۔ میں اسے بس اتنا ہی مشورہ دے سکا کہ اپنے اثر سے کام لے کر آئندہ تخویف کے واقعات کو روکے اس لئے کہ ان سے قومی مقصد کو بھی نقصان پہنچے گا اور اس کی جماعت کو بھی۔

دو تین ہفتے کے بعد گاندھی ارون گفت وشنید کے دوران میں دہلی میں سنا کہ الہ آباد میں چندر شیکر آزاد کو پولیس نے گولی ماردی۔ وہ دن کے وقت ایک پارک میں پہنچا گیا اور پولیس کے ایک بہت بڑے دستے نے اسے گھیر لیا۔ اس نے ایک درخت کی آڑ لے کر بچنا چاہا، دونوں طرف سے گولیاں چلیں، پولیس کے دو ایک سپاہی زخمی ہوئے اور چندر شیکر مارا گیا۔

عارضی تصفیہ ہونے کے چند روز بعد میں دہلی سے لکھنؤ آ گیا۔ ہم نے فوراً سول نافرمانی کو روکنے کی کاروائی شروع کر دی تھی اور کانگرس کی کل شاخوں نے قابل تعریف انضباط کے ساتھ ہماری نئی ہدایات کی پابندی کی تھی ہماری جماعت میں بہت سے جنگجو اشخاص اس تصفیے سے ناراض تھے اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے ہم انھیں جدوجہد کے روکنے پر مجبور کر سکتے۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے بلا استثنا پوری جماعت نے عملاً نئی پالیسی کو قبول کر لیا اگر چہ بہت سے لوگ اصولاً اس کے مخالف تھے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اس کی تھی کہ دیکھیں ہمارا صوبہ کیا کرتا ہے اس لئے کہ یہاں بعض علاقوں میں محصول نہ دینے کی تحریک زور شور سے چل رہی تھی۔ ہمارا پہلا کام یہ تھا کہ سول کے بعد بجز آدمیوں کے جن کے بارے میں کچھ جھگڑا تھا سب چھوٹ گئے۔ ظاہر ہے کہ ہزارہا نظر بند اور وہ لوگ جنھیں تشدد آمیز جدوجہد کے الزام میں سزا ہوئی تھی۔ اس زمرے میں شامل نہیں تھے۔

جب یہ رہا شدہ قیدی اپنے اپنے شہر یا گاؤں میں گئے تو قدرتی طور پر ان کے عزیزوں اور دوستوں نے بڑے جوش وخروش سے ان کا استقبال کیا۔ اکثر مقامات پر جھنڈیوں وغیرہ سے آرائش کی گئی، جلوس نکلے۔ جلسے ہوئے۔ تقریریں کی گئیں، خیر مقدم کے ایڈریس پڑھے گئے۔ یہ بالکل قدرتی بات تھی اور ہونا ہی چاہئے تھی لیکن اس زمانے سے مقابلہ کیا جائے جب پولیس کی لاٹھی ہر جگہ دکھائی دیتی تھی اور جلسے اور جلوس زبردستی منتشر کر دئے جاتے تھے تو تعجب ہوتا تھا کہ ایک دم سے یہ کیسی کایا پلٹ ہوگئی۔ پولیس کچھ پریشان سی تھی اور غالباً ہمارے آدمیوں میں جو جیل سے چھوٹ کر آئے تھے ایک تفاخر کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ فخر کی کوئی بات نہ تھی مگر قید سے چھوٹنے کے بعد (اگر جیل میں بالکل کچل نہ گئی ہو) طبیعت میں ایک ترنگ ہوا ہی کرتی ہے اور جب ہزاروں آدمی ایک ساتھ چھوٹیں یہ

ترنگ اور بڑھ جاتی ہے۔

میں اس واقعے کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ چند مہینے کے بعد حکومت نے اس ''فخر کے انداز پر'' بہت اعتراض کیا اور اسے ہمارے خلاف ایک الزام قرار دیا۔ اس نے تحکم کی فضا میں نشو ونما پائی ہے اور اس کے ذہن میں فوجی حکومت کا تصور ہے۔ اس کی جڑیں لوگوں کے دلوں میں قائم نہیں ہیں اس لئے جس چیز کو وہ اپنا رعب سمجھتی ہے اس کے چوٹیوں سے لے کر نیچے کے میدانوں تک، لوگوں کی ان گستاخیوں پر غصے اور غیرت سے کھول رہے ہیں۔ وہ اخبار جو حکومت کی آواز کو دہراتے ہیں اس صدمے سے آخر تک نہیں سنبھلے، اور اب ساڑھے تین برس کے بعد بھی اس ابتری اور شورہ پشتی کے زمانے کا نام آتے ہی کانپ جاتے ہیں۔ جب بقول ان کے کانگرس والے فتح کی خوشی میں اکڑتے پھرتے تھے۔

حکومت اور اس کے اخباری دوستوں کا یہ غیظ وغضب دیکھ کر ہم حیرت میں رہ گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اعصاب کی کیا حالت تھی اور انھوں نے اپنے جذبات کو کتنا دبایا ہوگا جس سے ان کے نفس میں طرح طرح کی گرہیں پڑ گئیں۔ تعجب کی بات ہے کہ ہمارے معمولی آدمیوں کے دو چار جلوسوں اور تقریروں نے انھیں اس قدر برہم کر دیا۔

سچ پوچھئے تو لیڈروں کا کیا ذکر ہے، کانگرس کے عام ممبروں کا بھی ان دنوں مطلق یہ خیال نہیں تھا کہ انھوں نے حکومت کو ''شکست'' دی ہے۔ البتہ ہمیں اپنی قوم کی قربانی اور اس کی بہادری پر ضرور فخر تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ہمارے ملک نے جو کر دکھایا اس سے ہماری عزت خود اپنی نظروں میں بڑھ گئی۔ ہمیں اپنے اوپر بھروسا ہو گیا اور ہمارا چھوٹے سے چھوٹا والنٹیر بھی تن کر اور گردن اٹھا کر چلنے لگا۔ ہمیں یہ احساس بھی تھا کہ ہماری اس جدوجہد سے جس نے دنیا کو ہماری طرف متوجہ کر دیا، برطانوی حکومت پر دباؤ پڑا اور ہم منزل مقصود سے قریب تر ہو گئے۔ ان سب

باتوں میں حکومت کو شکست دینے کو کوئی ذکر نہ تھا بلکہ سچ پوچھئے تو ہم میں سے اکثر اچھی طرح جانتے تھے کہ دہلی کے معاہدے میں حکومت نفع میں رہی۔ جب ہم میں سیکوئی یہ کہتا تھا کہ ہم اپنے مقصد سے بہت دور ہیں اور ابھی ہمیں بڑی کش مکش اور مشکلات کا سامنا کرنا ہے تو اس پر لڑائی کی ترغیب دینے کا' دہلی کے معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام لگایا جاتا تھا۔

صوبہ متحدہ میں ہمیں کاشتکاروں کے مسئلے سے نبٹنا تھا۔ اب ہماری پالیسی یہ تھی کہ جہاں تک ہو سکے حکومت سے اتحاد عمل کریں۔ اور ہم نے فوراً صوبہ متحدہ کی حکومت سے بات چیت شروع کر دی۔ ایک مدت کے بعد (کوئی بارہ برس سے ہمیں ان لوگوں سے سرکاری طور پر سابقہ نہیں پڑا تھا) میں صوبے کے چند بڑے افسروں سے ملنے گیا تا کہ ان سے کاشتکاروں کے مسئلے پر گفتگو کروں۔ ہماری صووبے کی کمیٹی نے اپنے ایک ممتاز رکن گوند ولبھ پنتھ کو خاص طور پر اس کام کے لئے مقرر کیا کہ وہ صوبے کی حکومت سے تعلقات قائم رکھیں۔ کاشتکاروں کی نازک حالت، زراعتی پیداوار کی قیمت کا گر جانا، عام کاشتکاروں کا مطلوبہ لگان ادا نہ کر سکنا یہ سب باتیں مسلم تھیں۔ سوال یہ تھا کہ چھوٹ کتنی ہونی چاہئے اور اس معاملے میں پہلا قدم حکومت ہی اٹھا سکتی تھی۔ معمولاً حکومت کو صرف زمینداروں سے واسطہ ہوتا تھا۔ اسامیوں سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا اور لگان کو گھٹانا یا معاف کرنا زمینداروں کا کام تھا۔ مگر زمیندار کہتے تھے کہ جب تک حکومت مالگذاری میں رعایت نہیں کرے گی ہم چھوٹ نہیں دے سکتے۔ اور یوں بھی زمیدنار عموماً خوشی سے چھوٹ دینے پر تیار نہیں تھے۔ اس لئے فیصلہ حکومت کے ہاتھوں میں تھا۔

صوبہ کانگرس کمیٹی نے کاشتکاروں کو سمجھایا کہ محصول نہ دینے کی تحریک ختم ہو گئی اب تم جتنا لگان دے سکتے ہو دے دو۔ مگر ان کی طرف سے کمیٹی نے بہت سے چھوٹ کا مطالبہ کیا تھا۔ ایک مدت تک حکومت نے کوئی کاروائی نہیں کی۔ غالباً

اسے یہ مشکل درپیش تھی کہ صوبے کے گورنر سر مالکم ہیلی موجود نہیں تھے بلکہ کار خاص پر انگلستان گئے ہوئے تھے۔ اس وقت بڑی مستعدی اور دوررسی سے کام کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر قائم مقام گورنر اور ان کے رفیق اپنے اور کوئی گرمی کے موسم تک جب سر مالکم ہیلی واپس آنے والے تھے ملتوی کر دی جائے۔ اس حیص بیص اور ڈھیل سے معاملہ اور بگڑ گیا اور اسامیوں کو بڑی تکلیف پہنچیں۔

معاہدہ دہلی کے بعد میں بیمار پڑ گیا۔ جیل ہی میں میری طبیعت اچھی نہیں رہتی تھی اس کے بعد والد کے وفات کے صدمے سے اور دلی کی طویل گفت وشنید کے بوجھ سے میری صحت نے جواب دے دیا۔ کراچی کانگرس کے زمانے میں کسی قدر طبیعت سنبھل گئی تھی۔

کراچی ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع ہے اور اس کا راستہ بہت دشوار گذار ہے اس کے اور بقیہ ہندوستان کے بیچ میں ریگستانی خطے حائل ہیں۔ پھر بھی ہزاروں آدمی دور دور سے آ کر جمع ہو گئے۔ یہ مجمع صحیح معنی میں ہندوستان کی اس وقت کی مزاجی حالت کو ظاہر کرتا تھا۔ ایک تو قومی تحریک کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر ہمیں خاموش مگر گہری مسرت تھی، کانگرس کی تنظیم پر ناز تھا جس نے اپنے بھاری فرائض کو اس خوبی سے ادا کیا اور انضباط اور قربانی کا حق ادا کر دیا۔ ہمیں اپنی قوم پر بھروسا تھا اور ہمارے دل ایک دبے وہئے جوش سے معمور تھے۔ دوسرے طرف ہمیں اپنی ذمہ داری کا اور ان مسئلوں اور خطروں کی اہمیت کا جو ہمیں درپیش تھے پورا احساس تھا۔ اب ہمارے الفاظ اور ہماری تجویزیں قومی عمل کی تمہید تھیں اور ہمیں سوچے سمجھے نہ کوئی لفظ زبان سے نکال سکتے تھے اور نہ کوئی رزولیوشن پاس کر سکتے تھے۔ دہلی کا معاہدہ اکثریت نے منظور کر لیا تھا مگر لوگ اس عام طور پر پسند نہیں کرتے تھے۔ اور انھیں خوف تھا کہ اس میں ایسی صورتیں پیدا ہو جائیں گی۔ جن میں کانگرس کی بدنامی ہوگی۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی وجہ

سے وہ مسائل جو ملک کے سامنے درپیش ہیں الجھ کر رہ جائیں گے۔ کانگرس سے چند ہی روز پہلے ناراضی کی ایک نئی وجہ پیدا ہوگئی تھی اور وہ بھگت سنگھ کی سزائے موت تھی۔ یہ احساس شمالی ہندوستان میں بہت بڑی تعداد میں آئے تھے۔

کراچی کانگرس میں شخصی طور گاندھی جی کو اتنی بڑی فتح حاصل ہوئی کہ کسی اور کانگرس میں نہ کوئی ہوگی۔ اس اجلاس کے صدر سردار ولبھ بھائی پٹیل تھے جو ہندوستان کے نہایت بااثر اور ہر دلعزیز لیڈروں میں سے تھے مگر اصل میں گاندھی جی سب کہیں چھائے ہوئے تھے۔ پشاور کے سرخ پوشوں کی ایک جماعت بھی خان عبدالغفار خاں کی سرکردگی میں کانگرس میں شرکت کرنے کے لئے آئی تھی۔ یہ سرخ پوش بہت ہر دلعزیز تھے اور جہاں کہیں جاتے تھے لوگ آفرین کے نعرے بلند رکتے تھے۔ اس لئے کہ اپریل ۱۹۳۰ء کے بعد سے لوگ ان کے بعد سے لوگ انکی بے نظیر ہمت اور ان کی امن پسندی کو جس پر وہ باوجود سخت اشتعال کے قائم رہے، دیکھ کر بہت متاثر تھے۔ ''سرخ پوش'' کے نام سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ کوئی اشتمالیوں یا انتہا پسند مزدوروں کی جماعت ہے۔ اصل میں ان کا نام ''خدائی خدمتگار'' تھا اور ان کی جماعت کانگرس کی رفیق کار بن گئی تھی (۱۹۳۱ء میں اس جماعت کانگرس سے باضابطہ الحاق ہوگیا) سرخ پوش وہ محض اس وجہ سے کہلاتے تھے کہ ان کی قدیم وضع کی وردیاں سرخ کی تھیں۔ ان لائحہ عمل محض قومی آزادی اور معاشرتی اصلاح پر مبنی تھا اور وہ کوئی معاشی پالیسی نہیں رکھتے تھے۔

کراچی کانگرس کا سب سے اہم رزولیوشن معاہدہ دہلی اور گول میز کانفرنس سے متعلق تھا۔ جب یہ رزولیوشن ورکنگ کمیٹی میں منظور ہوگیا تو میں نے بھی اس قبول کرلیا۔ مگر جب گاندھی جی نے مجھ سے فرمائش کی کہ تم اسے کانگرس کے کھلے اجلاس میں پیش کرو تو میں ہچکچایا۔ یہ میری طبیعت کے خلاف تھا۔ اس لئے پہلے میں نے انکار کیا مگر پھر سوچا کہ یہ بڑی کمزوری ہے۔ یا تو مجھے اسکی موافقت کرنا چاہیے یا

مخالفت۔ بات کو ٹالنے سے اور لوگوں کو شبے میں ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ عین وقت پر یعنی رزولیوشن کے پیش ہونے سے چند منٹ پہلے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں خود اسے پیش کروں گا۔ اپنی تقریر میں میں نے یہ کوشش کی کہ اس عظیم الشان مجمعے کے سامنے اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کر دوں اور یہ بتا دوں کہ میں نے اس رزولیوشن کو کیوں قبول کر لیا اور لوگوں سے اس کی وکالت کیوں کر رہا ہوں۔ یہ تقریر جو میں نے وقت کے وقت کی تھی اور جس کا ہر لفظ میرے دل سے نکلا تھا بالکل کھری سیدھی سادی تقریر تھی مگر غالباً یہ میری اور تقریروں سے جو میں نے بہت سوچ سمجھ کر تھیں، زیادہ کامیاب رہی۔

میں نے اور تجویزوں پر بھی تقریریں کیں خصوصاً اس روزولیوشن پر جو بھگت سنگھ کے متعلق تھا اور اس پر جس میں بنیادی حقوق اور معاشی پالیسی کی بحث تھی اس دوسرے رزولیوشن سے مجھے نہ صرف اس کے مضمون کے سبب سے بلکہ اس وجہ سے بھی خاص دلچسپی تھی کہ یہ کانگرس کے نئے طرز خیال کو ظاہر کرتا تھا۔ اب تک کانگرس خالص قومی خیالات رکھتی تھی اور معاشی مسائل سے بچتی تھی۔ کراچی کے رزولیوشن میں اس نے اشتراکیت کی طرف ایک چھوٹا سا قدم اٹھایا۔ یعنی بنیادی صنعتوں وغیرہ کے قومی ملکیت قرار دئے جانے اور غریبوں کو بوجھ گھٹا کر امیروں کا بوجھ بڑھانے کے مختلف تدابیر کی وکالت کی۔ یہ ہرگز اشتراکیت نہیں اور ایک سرمایہ داری سلطنت کو بھی اس رزولیوشن کی تمام باتوں کے منظور کر لینے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔

ایک ہلکے سے پیش پا افتادہ رزولیوشن نے حکومت ہند کے اعلیٰ افسروں میں ہل چل ڈال دی۔ شاید انھیں اس قوت تخیل کے زور سے جو ان کے حصے میں آئی ہے نظر آنے لگا کہ بالشویکوں کا سرخ سونا پوشیدہ طریقے سے کراچی پہنچ گیا اور اس نے کانگرس کو پھسلا لیا۔ یہ لوگ بیرونی دنیا سے الگ حریم سیاست کی چار دیواری

میں رہتے ہیں، جہاں راز داری کی فضا چھائی ہوئی ہے اور ان کی اثر پذیر طبیعتیں مزے لے لے کر پراسرار خیالی قصے سنا کرتی ہیں۔ اور پھر ان کہانیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بڑے پراسرار انداز میں اخباروں میں چھپتے ہیں، جنھیں حکومت کا تقرب حاصل ہے اور اشارتاً یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر حقیقت کے رخ سے پردہ اٹھا دیا جائے تو نہ جانے کیا کیا طلسمی منظر دکھائی دیں۔ اس منجھے ہوئے طریقے سے کراچی کے بنیادی حقوق وغیرہ کے رزولیوشن کا بارہا ذکر کیا گیا جس کے معنی میں تو یہ سمجھوں گا کہ یہ حکومت اس رزولیوشن کے متعلق یہ خیالات رکھتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی پراسرار شخص نے جو بالشویکوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس رزولیوشن یا اس کے بڑے حصے کا مسودہ بنایا اور اسے کراچی میں میرے سر منڈھ دیا۔ اس کے بعد میں نے مسٹر گاندھی کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر آپ نے یہ روزلیوشن قبول نہ کیا تو میں دہلی کے معاہدے کی مخالفت کروں گا۔ چنانچہ مسٹر گاندھی میرے تالیف قلب کے لئے اسے مان گئے۔ اور آخری دن تھی ماندی سبجیکٹس کمیٹی اور کانگرس سے زبردستی یہ روزلیوشن پاس کرالیا۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے اس ''پراسرار شخص'' کا نام صاف صاف نہیں لیا گیا۔ مجھے پراسرار طریقوں اور اینچ پیچ کی باتوں کی عادت نہیں اس لئے میں صاف کیوں نہ کہہ دوں کہ میرے خیال میں یہ اشارہ م۔ ن۔ رائے۔ کی طرف ہے۔ بڑا لطف آئے اور شملے اور دہلی کے اعلیٰ حکام کی آنکھیں کھل جائیں، اگر انھیں یہ معلوم ہو کہ م۔ ن۔ رائے یا کوئی اور اشتمالی خیالات رکھنے والا شخص کراچی کے اس بے ضرر رزولیوشن کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔ انھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس خیال کے لوگ اس رزولیوشن کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے خیال میں یہ متوسط طبقے کے شہروں کی اصلاح پسندانہ ذہنیت کا خاص نمونہ ہے۔ اب رہا گاندھی جی کا معاملہ تو مجھے ان سے سترہ برس سے بہت اچھی طرح سے نیاز

حاصل ہے اور یہ بات قیاس ہی میں نہیں آسکتی کہ میں ان کو الٹی میٹم دوں یا ان سے سودا چکاؤں۔ خواہ ہم میں اتفاق رائے ہو یا کسی خاص معاملے میں اختلاف ہو بہر صورت ہمارے تعلقات میں بازاری لین دین کے طریقے کو دخل نہیں ہوسکتا۔

کانگرس سے اس قسم کا رزولیوشن پاس کرانے کا خیال پہلے سے موجود تھا۔ کئی سال سے صوبہ متحدہ کی کانگرس کمیٹی یہ کوشش کر رہی تھی کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی سے ایک اشتراکی رنگ کا رزولیوشن پاس کرائے۔ ۱۹۲۹ء میں اسے اشتراکیت کا اصول منوا لینے میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سول نافرمانی کا قصہ چھڑ گیا۔ فروری اور مارچ ۳۱ء میں جب میں دلی میں صبح کی چہل قدمی کے وقت گاندھی جی سے گفتگو کیا کرتا تھا، میں نے ان سے معاملے کا ذکر کیا تھا اور انھوں نے بڑی خوشی سے اسے منظور کر لیا تھا کہ معاشی مسائل کے متعلق ایک رزولیوشن پیش کیا جائے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ تم کراچی میں اس مسئلے کو پیش کرنا اور ایک رزولیوشن کا مشودہ بنا کر مجھے دکھانا۔ چنانچہ میں نے کراچی میں رزولیوشن ترتیب دیا اور انھوں نے اس میں کچھ تغیر و تبدل بھی کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ رزولیوشن کو کمیٹی میں پیش کرنے سے پہلے ان میں اور مجھ میں الفاظ کے متعلق اتفاق رائے ہو جائے۔ مجھے کئی مسودے بنانے پڑے جس کی وجہ سے کئی روز کی دیر ہوئی اور یوں بھی ہم اور کاموں میں الجھے رہے۔ آخر کار ایک ایسا مسودہ بن گیا جس پر گاندھی جی کا اور میرا اتفاق ہو گیا اور پہلے ورکنگ کمیٹی اور پھر سبجیکٹس کمیٹی میں پیش کیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سبجکٹس کمیٹی کے لئے بالکل نئی چیز تھی اور بعض ممبروں کو اس پر حیرت ہوئی۔ بہر حال کمیٹی اور کانگرس میں یہ رزولیوشن بڑی آسانی سے پاس ہو گیا اور آل انڈیا کمیٹی کی سپرد کر دیا گیا کہ وہ ان اصولوں کو مدنظر رکھ کر جو اس میں قائم کئے گئے ہیں، اس کی توضیح اور تفصیل کرے۔

جب میں اس رزولیوشن کو ترتیب دے رہا تھا تو مختلف لوگوں سے جو میرے

خیمے میں آتے تھے، اس کے بارے میں مشورہ بھی کرتا تھا۔ مگر م۔ن۔ رائے کو اس سے مطلق کوئی تعلق نہ تھا اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اسے ناپسند کریں گے۔ اور اسی کی ہنسی اڑائیں گے۔

مجھے کراچی آنے سے چند دن پہلے الہ آباد میں م۔ن۔ رائے سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ایک روز شام کو وہ اچانک ہمارے یہاں آپہنچے اور اگرچہ مجھے شان گمان بھی نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں ہیں مگر میں نے انھیں پہچان لیا اس لئے کہ ۲۷ء میں انھیں ماسکو میں دیکھ چکا تھا۔ کراچی میں بھی ان میں سے ملاقات ہوئی مگر صرف پانچ منٹ کے لئے۔ پچھلے چند سال کے عرصے میں رائے نے میرے سیاسی رویے کی مذمت میں بہت کچھ لکھا تھا اور کبھی کبھی "مجھے" اس سے کسی قدر تکلیف بھی پہنچی تھی۔ ہم دونوں میں بہت کچھ اختلافات تھے مگر اس کے باوجود مجھے ان سے ایک تعلق خاطر تھا اور جب وہ گرفتار کئے گئے تو جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا میں نے ان کی مدد کی۔ میں ان کی ذہنی قابلیت کی وجہ سے ان کی قدر کرتا تھا اور مجھے ان سے اس وجہ سے بھی ہمدردی ہوگئی تھی کہ انھیں سب سے چھوڑ دیا تھا اور وہ بالکل بے یارو مددگار رہ گئے تھے۔ برطانوی حکومت ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے قومیت پسندوں کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ لوگ جو اپنے آپ کو اشتمالی کہتے ہیں ان پر غداری کا الزام لگاتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ برسوں روس میں رہنے اور اشتمالیوں کی بین الاقوامی مجلس سے اتحاد عمل کرنے کے بعد وہ اس سے الگ ہو گئے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی کیا وجہ تھی اور نہ مجھے اب تک مبہم افواہوں کے سوا یہ معلوم ہے کہ ان کے موجودہ خیالات کیا ہیں اور انھیں اشتمالیوں سے کس بات میں اختلاف ہے۔ مگر مجھے اس سے بڑی تکلیف ہوئی کہ ان جیسے شخص کا کوئی ساتھ دینے والا نہیں تھا اس لئے اپنی عادت کے خلاف میں ان کی طرف سے پیروی کرنے والی کمیٹی میں شریک ہوگیا۔ ۱۹۳۱ء کی گرمیوں میں

انھیں سزا ہوگئی۔ اب تین سال سے وہ قریب قریب قید تنہائی میں ہیں اور ان کی صحت اچھی نہیں رہتی۔

کراچی کانگرس کی آخری کاروائیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس نے آئندہ سال کیئے لئے نئی ورکنگ کمیٹی منتخب کی۔ اس کمیٹی کا انتخاب آل انڈیا کانگرس کمیٹی کرتی ہے مگر کچھ عرصے سے یہ طریقہ رائج ہوگیا ہے کہ جو شخص کانگرس کا صدر ہوتا ہے وہ (گاندھی جی اور کبھی کبھی بعض اور رفیقوں کے مشورے سے) ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے نام تجویز کرتا ہے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی اس تجویز کو منظور کر لیتی ہے۔ کراچی میں ورکنگ کمیٹی کا انتخاب کیا گیا اس سے ایک ناخوشگوار نتیجہ پیدا ہوا۔ جس کا ہم لوگوں کو اس وقت خیال بھی نہ تھا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی اس تجویز کو منظور کر لیتی ہے۔ کراچی میں ورکنگ کمیٹی کا انتخاب کیا گیا اس سے ایک ناخوشگوار نتیجہ پیدا ہوا۔ جس کا ہم لوگوں کو اس وقت خیال بھی نہ تھا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی اس تجویز کو منظور کر لیتی ہے۔ کراچی میں ورکنگ کمیٹی کا انتخاب کیا گیا اس سے ایک ناخوشگوار نتیجہ پیدا ہوا۔ جس کا ہم لوگوں کو اس وقت خیال بھی نہ تھا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بعض ممبروں کو اس انتخاب پر خصوصاً ایک (مسلمان کے) نام پر اعتراض تھا۔ شاید انھیں یہ شکایت بھی تھی کہ ان کے حلقے میں سے کوئی نہیں لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ پندرہ آدمیوں کی آل انڈیا کمیٹی میں ہر گروہ کی نمائندگی ناممکن تھی اور اصل نزاع جس کا ہمیں کچھ علم نہیں تھا۔ محض ذاتی اور مقامی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعتراض کرنے والا گروہ رفتہ رفتہ کانگرس سے علیحدہ ہوگیا۔ اور اس نے "مجلس احرار" کے نام سے اپنی ایک انجمن بنالی۔ پنجاب کے بعض نہاتے سرگرم اور ہر دلعزیز مسلمان کانگرسی کارکن اس انجمن میں شریک ہوگئے اور انھوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ لوگ زیادہ تر نیچے اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا عام مسلمانوں پر بڑا اثر تھا۔ یہ ایک

زبردست انجمن بن گئی جو اونچے طبقے کے فرقہ پرست مسلمانوں پر بڑا اثر تھا۔ یہ ایک زبردست انجمن بن گئی جو اونچے طبقے کے فرقہ پرست مسلمانوں کی فرسودہ جماعت سے کہیں زیادہ قوت رکھتی تھی۔ اس لئے کہ اس جماعت کی کاروائیاں محض ہوائی تھیں یا یوں کہنا چاہئے کہ محض دیوان خانوں اور کمیٹی کے کمروں تک محدود تھیں لازمی طور پر احرار کی انجمن رفتہ رفتہ فرقہ پرستی کی طرف مائل ہوگئی مگر چونکہ ان کا تعلق عام مسلمانوں سے تھا اس لئے وہ ایک زندہ جماعت تھی اور بعض مبہم معاشی خیالات بھی رکھتی تھی۔ آگے چل کر دیسی ریاستوں، خصوصاً کشمیر کے مسلمانوں کی شورشوں میں جہاں بدقسمتی سے معاشی شکایتیں فرقہ پرستی میں گڈمڈ ہوگئی تھیں احرار نے بہت اہم حصہ لیا۔ احرار پارٹی کے بعض لیڈروں کے کانگرس سے الگ ہو جانے سے پنجاب کی کانگرس کو بہت نقصان پہنچا۔ مگر کراچی میں ہمیں اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کے الگ ہونے کی وجہ صرف وہ ناراضی ہی نہیں تھی جو ورکنگ کمیٹی کے انتخاب سے پیدا ہوئی۔ یہ تو محض ایک علامت تھی جس سے صورت حال کا اظہار ہوگیا۔ اصل اسباب کچھ اور تھے۔

کراچی میں ہمیں کانپور کے ہندو مسلمانوں کے فساد کی اطلاع پہنچی، اور اس کے بعد ہی یہ خبر بھی آئی کہ گنیش شنکر ودیارتھی کو عوام کے غضب ناک مجمع نے جس کی وہ مدد کرنا چاہتے تھے۔ قتل کر دیا۔ خوفناک اور وحشیانہ فسادیوں ہی کیا کم تھا مگر ہمیں اس کے ہولناک نتائج کا اندازہ سب سے زیادہ گنیش جی کی موت سے ہوا۔ کانگرس کے کیمپ میں ہزاروں آدمی ان کے جاننے والے تھے اور ہم صوبہ متحدہ والوں کے تو وہ عزیز ترین دوست اور رفیق تھے۔ یہ بہادر اور نڈر جوان دور اندیشی اور اصابت رائے میں بوڑھوں کو مات کرتا تھا۔ وہ کبھی ہمت نہیں ہارتا تھا اور چپ چاپ اپنے کام میں لگا رہتا تھا۔ شہرت اور عزت، عہدے اور منصب کی اسے ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ جوانی کی ترنگ میں اس نے جان بوجھ کر اس مقصد کے لئے جس

کی محبت اور خدمت کو وہ اپنا دھرم جانتا تھا اپنی جان جوکھم میں ڈال ی۔ نادانوں نے اسے مار کر گرا دیا اور کانپور کیا سارے صوبے کو اس گوہر تاباں سے محروم کر دیا جس کی جودت کا ان کے پاس اور کوئی ہیرا نہ تھا۔ اس خبر کے آتے ہی کراچی کے صوبہ متحدہ کے کیمپ میں اداسی چھا گئی اور اس کی ساری چمک دمک ماند پڑ گئی۔ مگر اسی کے ساتھ ہمیں اس پر ناز تھی کہ اس نے اس آن بان سے موت کا سامنا کیا اور اس شان سے جان دی۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

لنکا کی سیر

میرے معالج ڈاکٹروں کا اصرار تھا کہ تم کچھ دن آرام کرو اور تبدیل آب وہوا کے لئے کہیں چلے جاؤ۔ چنانچہ میں نے یہ طے کیا کہ ایک مہینہ سیلون میں گذاروں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے مگر اس میں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی تھی جہاں میرے مشاغل بدل سکیں یا میرے دماغ کو آرام مل سکے۔ اس لئے کہ میں جہاں کہیں جاتا وہاں میرے سیاسی رفیق کار موجود ہوتے اور میں ایک ہی قسم کے مسائل میں الجھا رہتا۔ سیلون چلے گئے۔ ۲۷ء میں یورپ سے واپس آنے کے بعد میں نے یہ پہلی چھٹی لی تھی اور بہت دن کے بعد موقع ملا تھا کہ میں ہر قسم کی فکروں سے محفوظ ہو کر اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ دن امن اور سکون سے بسر کروں۔

مگر سچ پوچھئے تو ہمیں نوارا ایلیا کے دو ہفتے کے قیام کے سوا سیلون میں بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ وہاں ہر طبقے کے لوگوں نے ہماری اس قدر خاطر تواضع کی کہ ہم بے حد متاثر ہوئے۔ ان کی ان عنایتوں سے جی بہت خوش ہوتا تھا مگر بعض وقت بڑی مشکل پڑ جاتی تھی۔ نوارا ایلیا میں روزانہ چائے کے باغ میں کام کرنے والوں اور دوسرے مزدوروں کی ٹولیاں میلوں چل کر ہم سے ملنے آتی تھیں اور ہمارے لئے جنگلی پھول، ترکاریاں، گھر کا بنا ہوا مکھن لاتی تھیں۔ عموماً ہم آپس میں گفتگو تک نہیں کر سکتے تھے۔ بس ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا مکان ان تحفوں سے بھر جاتا تھا جو وہ اپنی ذرا سی پونجی میں سے ہمیں دیتے تھے اور ہم انھیں مقامی ہسپتال اور یتیم خانوں میں بھیج دیا کرتے تھے۔

ہم جزیرے کی بہت سی قابل دید چیزیں، تاریخی عمارتیں، بودھ مذہب کی خانقاہیں اور گرم خطے کے ہرے بھرے جنگل دیکھنے جایا کرتے تھے۔ انوردھ پور میں مجھے بدھ کی ایک رات پرانی بیٹھی مورت بہت پسند آئی۔ ایک سال بعد جب میں دہرہ دون کے جیل میں تھا۔ سیلون سے ایک دوست نے مجھے اس مورت کی

تصویر بھیجی جو میں نے اپنی کوٹھری میں میز پر رکھ لیک۔ وہ ایک میرے لئے ایک قابل قدر رفیق ثابت ہوئی۔ بودھ کے باوقار اور پرسکون چہرے کو دیکھ کر مجھے تسکین اور تقویت ہوتی تھی اور بارہا مجھے اس سے اپنی افسردگی اور اداسی کو دور کرنے میں مدد ملی۔

بودھ کا مجھ پر ہمیشہ سے بہت اثر ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اثر کس کا ہے اسے مذہبی عقیدت نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ بودھ مذہب کے عقائد سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے جو چیز کھینچی ہے وہ بودھ کی شخصیت ہے۔ اسی طرح مسیح کی شخصیت بھی میرے لئے بڑی کشش رکھتی ہے۔

میں نے خانقاہوں میں اور شاہراہوں پر بہت سے بودھ بھکشو (راہب) دیکھے۔ان کی ہر جگہ تعظیم کی جاتی ہے۔ قریب قریب ان سب کے چہرے پرسکون اور اطمینان کا رنگ چھایا ہوا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی فکروں سے آزاد ہیں۔ عموماً ان کے بشرے سے ذہانت ظاہر نہیں ہوتی اور شدید ذہنی کش مکش کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی۔ان کے لئے زندگی ایک سب روندی ہے جو سرمدی سمندر کی طرف بہتی چلی جارہی ہے۔ انہیں دیکھ کر مجھے کسی قدر رشک آتا تھا اور میرے دل میں امن و عافیت کی ایک خفیف سی آرزو پیدا ہوتی تھی۔ مگر میں خوب جانتا تھا کہ یہ زندگی میرے حصے میں نہیں آئی ہے۔ میری کشتی حیات طوفان وتلاطم کے لئے وقف ہے۔ میرے لئے امن کی کوئی جگہ نہیں۔ اس لئے کہ میرے اندر ویسا ہی شدید طوفان برپا ہے جیسا باہر ہے۔ اور فرض کیجئے میں کسی پر امن بندرگاہ میں پہنچ جاؤں، جو تند و تیز ہواؤں سے محفوظ ہو، تو کیا میں وہاں خوش اور مطمئن رہ سکوں گا؟

کچھ دنوں کے لئے یہ گوشہ عافیت ضرور خوش گوار تھا۔ جہاں میں آرام سے لیٹا، خواب وخیال کا لطف اٹھاتا تھا اور میں نے اپنے آپ کو اس دلفریب پرسکون او

رطاقت ربا خطے کے آغوش میں دے دیا تھا۔ سیلون اس زمانے میں میری قلبی کیفیت سے مناسبت رکھتا تھا اور اس کے خوش نما مناظر میرے دل کو راحت و مسرت بخشتے تھے۔ ہمارا چھٹی کا مہینہ بہت جلد گذر گیا اور ہم حسرت و افسوس کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئے۔ مجھے سیلون اور اس کے باشندوں کی بہت سی باتیں اب تک یاد آتی ہیں۔ ان کی یاد قید کی لمبی کٹھن اور سنسان گھڑیوں میں میری مونس اور ہمدم رہی۔ ایک چھوٹا سا واقعہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ شاید ہم جانتا کے قریب تھے کہ ایک مدرسے کے استادوں اور لڑکوں نے ہماری موٹر روکی اور خیر مقدم کے چند الفاظ کہے۔ لڑکوں کے چہرے جوش اور شوق سے چمک رہے تھے۔ یکا یک ان میں سے ایک میرے پاس آیا اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور آپ ہی آپ بغیر کسی تمہید کے کہا ''میرا قدم نہیں ڈگمگائے گا'' اس بچے کا ہونہار چہرہ جس کی آنکھوں سے عزم و استقلال ٹپک رہا تھا میرے دل پر نقش ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھا۔ میں اس کا پتہ نہیں چلا سکا۔ مگر یہ جانے کیوں مجھے دل سے یقین ہے کہ وہ اپنے قول پر قائم رہے گا اور جب اسے زندگی کی مشکلات کا سامنا ہوگا تو اس کا قدم نہیں ڈگمگائے گا۔

سیلون سے چل کر ہم ہندوستان کے آخری جنوبی سرے راس کماری پر اترے۔ وہاں ایک حیرت انگیز سکون کا عالم تھا۔ اس کے بعد ٹراونکور، کوچین، ملابار میسور، حیدرآباد سے گذرے۔ ان میں سے اکثر دیسی ریاستیں ہیں۔ بعض بہت ترقی کر رہی ہیں اور بعض انتہائی پستی کی حالت میں ہیں۔ ٹرانکور اور کوچین تعلیم میں اور میسور غالباً صنعت و حرفت میں برطانوی ہند سے کہیں آگے ہیں۔ حیدرآباد جاگیرداری نظام کے زمانے کے قریب قریب مکمل نشانی ہے۔ ہمارا خیر مقدم ہر جگہ رعایا اور حکام دونوں کی طرف سے بڑے اخلاق اور تپاک سے کیا گیا مگر حکام کے اس تپاک میں یہ بات صاف جھلک رہی تھی کہ وہ بہت پریشان ہیں کہ کہیں ہمارے

آنے کی وجہ سے لوگوں میں خطرناک خیالات نہ پیدا ہو جائیں۔ میسور اور ٹراونکور میں ان دنوں رعایا کو کسی قدر قانونی آزادی اور سیاسی کام کے مواقع حاصل تھے۔ حیدرآباد میں یہ بھی نہ تھا۔ بعد میں میسور اور ٹرانکور کی حکومتوں نے وہ تھوڑی بہت قانونی آزادی اور سیاسی جدوجہد کی اجازت بھی واپس لے لی جو انھوں نے پہلے دے رکھی تھی۔

میسور کی ریاست میں بنگلور کیمقام پر میں نے ایک عظیم الشنا جلسے میں لوہے کے ایک بہت بڑے کھمبے پر قومی جھنڈا چڑھا دیا تھا۔میرے وہاں سے آنے کے تھوڑے ہی دن بعد یہ کھمبا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا گیا۔ اور قومی جھنڈے کا لگانا اور لے چلنا جرم قرار دے دیا گیا۔ مجھے اس جھنڈے کی توہین سے جو میں نے نصب کیا تھا سخت تکلیف ہوئی۔

ٹرانکور میں آج بھی کانگرس خلاف قانون جماعت ہے اور کوئی شخص لوگوں کو اس کا ممبر نہیں بنا سکتا حالانکہ برطانوی ہند سے ان سول نافرمانی کے موقوف ہو جانے کے بعد کانگرس مطابق قانون قرار دے دی گئی ہے۔ غرض میسور اور ٹرانکور دونوں ریاستیں پر امن سیاسی جدوجہد کو کچل رہی ہیں اور انھوں نے وہ رعایتیں جو پہلے دے رکھی تھیں واپس لے لی ہیں۔ حیدرآباد کو پیچھے ہٹنے یا رعایتوں کو واپس لینے کی ضرورت ہی نہ تھی اس لئے کہ وہ نہ ہیں۔ حیدرآباد کو پیچھے ہٹنے یا رعایتوں کو واپس لینے کی ضرورت ہی نہ تھی اس لئے کہ وہ نہ کبھی آگے بڑھا تھا اور نہ اس نے کوئی رعایتیں دی تھیں۔ سیاسی جلسوں کا تو حیدرآباد میں کوئی نام تک نہیں جانتا تھا۔ بلکہ سماجی اور مذہبی جلسے بھی شبہے کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کے لئے خاص طور پر اجازت لینی پڑتی ہے۔ خود وہاں سے کوئی معقول اخبار نہیں نکلتا اور باہر کے زہر کو روکنے کے لئے بہت سے اخباروں کا جو ہندوستان کے مختلف حصوں سے شائع ہوتے ہیں داخلہ بند کر دیا گیا ہے۔ اس میں یہاں تک سختی کی جاتی ہے کہ اعتدال

پسند اخبار بھی نہیں آنے پاتے۔

کوچین میں ہم ''گورے یہودیوں'' کے محلے میں گئے اور انھیں ان کے قدیم ''خیمہ عبادت'' میں عبادت کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک بہت پرانا اور عجیب و غریب چھوٹا سا فرقہ ہے اور اب اس کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ ہمیں یہ بتایا گیا کہ کوچین کا وہ حصہ جس میں یہ لوگ رہتے ہیں قدیم یروشلم سے مشابہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ دیکھنے میں بہت قدیم معلوم ہوتا ہے۔ ہم ان قصبوں میں بھی گئے جو ملابار کی اندرونی کھاڑیوں کے کنارے آباد ہیں۔ ان میں زیادہ تر شامی کلیسا کے پیرو عیسائی رہتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ عیسائی مذہب ہندوستان میں پہلی صدی عیسوی ہی میں پہنچ گیا تھا اور اس نے جنوبی ہند میں مضبوطی سے قدم جمالیا تھا۔ اگرچہ ان عیسائیوں کا مذہبی پیشوا انطاکیہ یا شام کے کسی شہر میں رہتا ہے لیکن ان کا مذہب قریب قریب دیسی ہے اور اسے باہر کے لوگوں سے بہت کم واسطہ ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جنوب میں نسطوریوں کی بھی ایک آبادی ہے ان کے پشپ نے کہا کہ ان لوگوں کی تعداد دس ہزار ہے۔ میں یہی سمجھا کرتا تھا کہ نسطوری مدت میں بھی فروغ پایا تھا۔ مگر مجھے یہ بتایا گیا کہ کسی زمانے میں ہندوستان میں بھی اس کے بہت پیرو تھے اور شمال میں بنارس تک پھیلے ہوئے تھے۔

ہم حیدرآباد خاص طور پر سروجنی نائڈو اور ان کی لڑکیوں پدمجا اور لیلامنی سے ملنے کے لئے گئے تھے اور انھیں کے یہاں ٹھہرے تھے۔ ہمارے قیام کے زمانے میں وہاں پردہ نشین خواتین کا ایک چھوٹا سا جلسہ میری بیوی سے ملنے کے لیے منعقد ہوا۔ معلوم ہوا کہ کملا نے ان کے سامنے ایک تقریر بھی کی اور شاید اس میں عورتوں کی جنگ آزادی کا ذکر کیا جو وہ مردوں کے بنائے ہوئے رسوم وقوانین سے کر رہی ہیں (یہ موضوع اسے بہت پسند تھا) اس سلسلے میں اس نے ان سے کہا کہ تمہیں

اپنے مردوں کے حد سے زیادہ اطاعت نہیں کرنی چاہئے۔ اس کا ایک دلچسپ نتیجہ ہوا۔ دو تین ہفتے کے بعد حیدر آباد سے کسی شخص نے بڑی پریشانی کی حالت میں کملا کو خط لکھا کہ آپ کے یہاں آنے کے بعد سے میری بیوی کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے وہ خلاف معمول اب میری کوئی بات نہیں مانتی۔ ہر کام میری مرضی کے خلاف کرتی ہے۔ ہر وقت بحث کرتی رہتی ہے بلکہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

جس دن ہم بمبئی سے سیلون روانہ ہوئے تھے اس کے ساتھ ہفتے بعد وہاں واپس پہنچ گئے اور میں پھر کانگرس کی سیاست کے بھنور میں پڑ گیا۔ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا اور اس میں بعض نہایت اہم مسائل پر غور کیا جا رہا تھا۔ ہندوستان کی بدلتی ہوئی حالت، صوبہ متحدہ کے کسانوں کی حیرت انگیز ترقی، بنگال کی برہمی، دبا ہوا غصہ بے چینی، سدا بہار فرقہ وارانہ مسئلہ، چھوٹی چھوٹی مقامی نزاعیں، کانگرس اور ملازمان سرکار کے بہت سے جھگڑے جن میں ایک دوسرے پر معاہدہ دہلی کی خلاف ورزی کا الزام لگاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ سوال تھا جو ایک مدت سے بار بار اٹھ رہا تھا:۔ کیا کانگرس کی نمائندگی گول میز کانفرنس میں ہونی چاہئے؟ کیا مہاتما گاندھی کو اس میں شرکت کرنی چاہئے؟

صلح کے زمانے میں حکومت اور کانگرس کے جھگڑے

گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لندن جائیں یا نہ جائیں؟ یہ سوال بار بار اٹھتا تھا اور اس کو کوئی صاف جواب نہیں ملتا تھا۔ آخر وقت تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا فیصلہ ہوگا۔ یہاں تک کہ ورکنگ کمیٹی اور خود گاندھی جی کو بھی خبر نہ تھی۔ فیصلہ بہت سی باتوں پر موقوف تھا اور نئے واقعات کی وجہ سے صورت حال روز بدلتی رہتی تھی۔ اس سوال اور اس کے جواب کی تہ میں بہت سے مشکل سوال پوشیدہ تھے۔

برطانوی حکومت اور اس کے دوستوں کی طرف سے ہم سے بار بار کہا جاتا تھا کہ گول میز کانفرنس پہلے ہی دستور اساسی کا ڈھانچا بنا چکی ہے۔ تصور کا خاکہ تیار ہے۔ صرف رنگ بھرنے کی کسر ہے۔ مگر کانگرس کا یہ خیال نہیں تھا۔ اس کی طرف سے تو تصویر کورے پردے پر نئے سرے سے بنائی جانے والی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ دہلی کے معاہدے میں وفاق کو تو ہم میں سے اکثر بہت پہلے سے ہندوستان کے دستور اساسی کا بہترین حل سمجھتے تھے اور اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ اس خاص وفاقی نظام کو تسلیم کر لیا ہے جو پہلی گول میز کانفرنس نے تجویز کیا تھا۔ وفاقی حکومت میں سیاسی آزادی اور سماجی تبدیلیوں کی پوری طرح گنجائش بھی تھی مگر تحفظات کا اس کے ساتھ کھپنا بہت مشکل تھا۔ معمولی صورت میں تحفظات کو وجود ملک سے اقتدار اعلیٰ میں بہت کچھ کمی کر دیتا مگر چونکہ ان کے ساتھ ''ہندوستان کے فائدے'' کی شرط لگی ہوئی تھی اس لئے یہ مشکل کسی قدر آسان ہوگئی تھی مگر پھر بھی پوری طرح حل نہیں ہوئی تھی اس لئے یہ مشکل کسی قدر آسان ہوگئی تھی مگر پھر بھی پوری طرح حل ہوئی تھی۔ بہر حال کراچی کانگرس نے اس بات کو صاف کر دیا تھا کہ وہی دستور قابل قبول ہوگا جس کی رو سے ہندوستان کو فوج، امور خارجہ، مالی اور معاشی پالیسی پر پورے پورے اختیارات دئے جائیں اور وعدہ کیا جائے کہ بیرونی قرضوں کی ذمہ

داری ہندوستان پر ڈالنے سے پہلے اس کی اچھی طرح چھان بین کر لی جائے گی کہ اس پر دوسرے ملکوں (خصوصاً انگلستان) کا واقعی قرضہ کتنا ہے۔ اس کے علاوہ بنایدی حقوق کے رزولیوشن میں بھی بعض معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کو جو ہمیں مطلوب تھیں ذکر کر دیا گیا تھا۔ یہ سب چیزیں گول میز کانفرنس کے بہت سے فیصلوں اور ہندوستان کے موجودہ نظام حکومت سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔

کانگرس اور برطانوی حکومت کے نقطہ نظر میں زمین آسمان کا فرق تھا اور یہ بات قیاس میں نہیں آتی تھی کہ موجودہ صورت میں یہ فرق دور ہو سکتا ہے۔ بہت کم کانگریسیوں کو یہ توقع تھی کہ گول میز کانفرنس میں حکومت اور کانگرس کے درمیان کسی قسم کی مفاہمت ممکن ہے اور گاندھی جی کو بھی باوجود اپنی امید پروری کے کچھ زیادہ امید نظر نہیں آتی تھی۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں تھے اور انھوں نے ٹھان لی تھی کہ آخر تک کوشش کرتے رہیں گے۔

ہم سب کی رائے تھی کہ خواہ کامیابی ہو یا نہ ہو دہلی کے معاہدے کے مطابق ایک بار کوشش ضرور کرنے چاہئے مگر دو اہم مسئلے تھے جن سے اندیشہ تھا کہ ہمارے گول میز کانفرنس میں شریک ہونے میں حائل ہوں گے۔ ہم اسی صورت میں جا سکتے تھے کہ ہمیں گول میز کانفرنس میں اپنے پورے مطابقات پیش کرنے کی آزادی دی جائے اور یہ کہہ کر کہ معاملہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے یا کسی اور بہانے سے ہماری زبان بند نہ کی جائے۔ پھر اس کا بھی امکان تھا کہ ہندوستان کے حالات ہمیں گول میز کانفرنس میں نہ جانے دیں۔ شاید یہاں ایسی صورت پیش آتی کہ حکومت سے جنگ چھڑ جاتی اور ہم پر سختیاں شروع ہو جاتیں۔ اگر ہندوستان میں ایسا واقعہ ہو جاتا اور ہمارے گھر میں آگ لگ جاتی تو یہ کتنی نامناسب بات ہوتی کہ ہمارا کوئی نمائندہ گھر جلتا چھوڑ کر لندن میں بیٹھا دستور اساسی وغیرہ کے متعلق نظری بحثیں کرتا رہے۔

ہندوستان میں صورت حال روز بروز نازک ہوتی جاتی تھی۔ اس کے آثار ہر جگہ نظر آتے تھے مگر بنگال، صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد میں خاص طور پر نمایاں تھے۔ بنگال میں دہلی کے معاہدے کا کوئی اثر نہیں ہوا، جو حالت تھی وہی رہی۔ بلکہ اور بدتر ہوگئی۔ سول نافرمانی کے کچھ قیدی چھوڑ دئے گئے تھے مگر ہزار ہا سیاسی کارکن جو اصطلاحی طور پر سول نافرمانی کے قیدی نہیں تھے، اب تک جیل میں تھے ان کے علاوہ بہت سے نظر بند قید خانوں میں یا نظر بندوں کے کیمپ میں قید تھے۔ لوگ اب تک ''باغیانہ'' تقریریں کرنے یا کسی اور قسم کی سیاسی جدوجہد کے الزام میں برابر گرفتار ہو رہے تھے۔ غرض عام طور پر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ حکومت کے سختیوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کانگرس کے لئے بنگال کا مسئلہ غیر معمولی طور پر مشکل تھا اس لئے کہ وہاں تخویف پسندی اب تک موجود تھی۔ سچ پوچھئے تو کانگرس کی معمول کی جدوجہد اور سول نافرمانی کے مقابلے میں تخویف پسندوں کی سرگرمیاں وسعت اور اہمیت کے لحاظ سے بہت کم تھیں مگر ان کا شور بہت تھا اور اس لئے لوگوں کی ان کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ پھر ان کی وجہ سے کانگرس کے کام میں بھی دشواریاں پیدا ہوگئی تھیں۔ اس لئے کہ تخویف پسندی کی فضا با امن عملی جدوجہد کے لئے سازگار نہیں تھی۔ حکومت کو ان کی وجہ سے انتہائی تشدد کا موقع مل گیا اور اس نے بلا تفریق تخویف پسندوں اور غیر تخویف پسندوں سب پر سختی شروع کر دی۔

بہت مشکل تھا کہ پولیس اور مقامی انتظامی افسر، ان خاص قوانین اور ضوابط سے جو تخویف پسندوں کے لئے بنائے گئے تھے، کانگریسیوں، کسان اور مزدور کارکنوں اور دوسرے لوگوں کے خلاف، جن کی سرگرمیاں انھیں ناپسند تھیں، کام نہ لیں۔ ممکن ہے کہ بہت سے نظر بندوں کا جو بغیر کسی الزام یا تحقیقات یا سزا کے برسوں سے قید تھا، اصل جرم تخویف پسندانہ جدوجہد نہیں بلکہ کسی اور قسم کی موثر سیاسی جدوجہد ہو۔ انھیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا بلکہ یہ بھی نہیں بتایا گیا

کہ انھوں نے کون سا گناہ کیا ہے۔ ان پر مقدمہ اسی لئے نہیں چلایا جاتا ہوگا کہ پولیس کے پاس انھیں سزا دلانے کے لئے کافی شہادت نہ ہوگی حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ برطانوی ہند میں جرائم خلاف سرکار کے متعلق بہت مکمل اور جامع قوانین موجود ہیں۔ جن کے جال سے نکلنا مشکل ہے اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص عدالت سے رہا ہو جاتا ہے مگر فوراً ہی دوبارہ گرفتار کر کے نظر بند کر دیا جاتا ہے۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی بنگال کے اس پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے سے معذور تھی۔ وہ ہمیشہ اسی الجھن میں رہتی تھی اور آئے دن بنگال کو کوئی نہ کوئی معاملہ کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے رہا کرتا تھا۔ اس سے جو کچھ ہو سکتا تھا کرتی تھی مگر اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اصل میں اس جھگڑے کو نبٹانا اس کے بس کے بات نہیں۔ چنانچہ اس نے واقعات کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس سے اس کی کمزوری ضرور ہوتی ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ موجودہ صورت میں وہ اور کیا کر سکتی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے اس رویے سے بنگال میں ناراضی پھیل گئی اور لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ کانگرس کی مجلس عاملہ اور دوسرے صوبے بنگال سے بے پروائی برت رہے ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نازک وقت میں سب بنگال کو چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ یہ خیال بالکل غلط تھا اس لئے کہ سارے ہندوستان کو بنگال سے انتہائی ہمدردی تھی مگر اس ہمدردی کو عملی صورت میں لانے کے کوئی تدبیر نہیں سوجھتی تھی۔ اس کے علاوہ ہر صوبے کے لوگ خود اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا تھے۔

صوبہ متحدہ کے کاشتکاروں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ صوبے کی حکومت ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی اور لگان اور مالگذاری کی تخفیف کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرتی تھی اس نے جبریہ وصولی شروع کر دی تھی۔ ہر جگہ بیدخلیاں اور قرقیاں ہو رہی تھیں۔ جن دنوں ہم سیلون میں تھے یہاں دو تین جگہ جبریہ وصولی کی وجہ سے بلوے بھی ہو گئے۔ یہ بلوے یوں تو بہت معمولی تھے مگر بدقسمتی سے ان

میں کوئی زمیندار یا اس کا کارندہ مار ڈالا گیا تھا۔ گاندھی جی اسی زمانے میں نینی تال گئے اور انھوں نے صوبہ متحدہ کے گورنر سر مالکم ہیلی سے کاشتکاروں کے معاملے میں گفتگو کی۔ مگر اس گفتگو کا خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ جب حکومت نے تخفیف کا اعلان کیا تو وہ لوگوں کی توقعات سے بہت کم تھی۔ دیہات میں ہل چل مچی ہوئی تھی اور روز بروز بڑھتی جاتی تھی کاشتکاروں پر حکومت اور زمینداروں کا متفقہ دباؤ پڑ رہا تھا، ان کے کھیت چھینے جا رہے تھے، اور ان کے برتن بھانڈے قرق ہو رہے تھے۔ یہ صورت اگر کسی اور ملک میں ہوتی تو کاشتکاروں میں عام شورش پھیل جاتی۔ میرے خیال میں یہ زیادہ تر کانگرس کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ کسان تشدد سے باز رہے مگر ان پر دل کھول کر تشدد کیا جا رہا تھا۔

کاشتکاروں کی بے چینی اور مصیبت کا ایک روشن پہلو بھی تھا۔ زراعتی پیداوار کی ارزانی کی وجہ سے غریبوں کو پیٹ بھر کھانے کو مل جاتا تھا، جو انھیں مدت سے نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس سے کاشتکار بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ سوا ان بیچاروں کے جن کی ساری پونجی ضبط ہو گئی تھی۔

بنگال کی طرح صوبہ سرحد کو بھی دہلی کے معاہدے سے امن نصیب نہیں ہوا۔ وہاں ہر وقت ایک کشائش کی حالت رہتی تھی۔ حکومت فوجی طریقے کی تھی، جس میں خاص قوانین اور ضوابط سے کام لیا جاتا تھا اور ذرا ذرا سے قصور پر بہت سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس استبداد کا مقابلہ کرنے کے لیے عبدالغفار خاں نے ایک زبردست تحریک اٹھائی اور تھوڑے دن میں حکومت انھیں ہوا سمجھنے لگی۔ چھ فٹ تین انچ کا یہ شاندار پٹھان گاؤں گاؤں پیدل پھرتا تھا اور سرخ پوشوں کا ایک سلسلہ بنتا جاتا تھا اور تھوڑے دن میں خدائی خدمتگاروں کی انجمن کی شاخیں سارے صوبے میں پھیل گئیں۔ یہ لوگ بالکل باامن تھے اور باوجودیکہ ان پر بہت سے مبہم الزامات لگائے گئے لیکن کسی طرح یہ ثابت نہ ہو سکا کہ انھوں نے ایک بار بھی تشدد

سے کام لیا۔ مگر وہ امن ہوں یہ نہ ہوں یہی کیا کم تھا کہ وہ جنگ وجدل کی روایات کے وارث ہیں اور سرحد کے قریب رہتے ہیں ان کی منضبط تحریک کو، جو ہندوستان کی قومی تحریک سے وابستہ تھی۔ اس تیزی سے بڑھتے دیکھ کر حکومت بدحواس ہوگئی۔ شاید اسے یقین نہ آتا تھا کہ ان کا امن اور عدم تشدد کا دعوی سچا ہے۔لیکن اگر وہ اسے یقین بھی کر لیتی تب بھی اسے خوف اور پریشانی ضرور ہوتی۔ ان کی تحریک کی واقعی اور امکانی قوت اتنی بڑی تھی کہ حکومت اسے سکون قلب کے ساتھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اس عظیم الشان تحریک کے مسلمہ رہنما عبدالغفار خاں تھے جو ''فخر افغان'' اور ''سرحدی گاندھی'' کہلاتے تھے۔ انھیں صرف اس وجہ سے صوبہ سرحد میں حیرت انگیز ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی تھی کہ وہ خاموشی اور استقلال سے کام کرتے تھے اور کسی قسم کی مشکلات اور حکومت کی سختیوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آج کل کی سیاست کے جو معنی سمجھے جاتے ہیں ان کے لحاظ سے وہ کوئی سیاسی آدمی نہیں ہیں۔ انھیں سیاست کے داؤں پیچ اور چالیں نہیں آتیں وہ ایک راست قامت راستباز آدمی ہیں۔شور مچانا اور باتیں بنانا نہیں جانتے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ اپنے صوبہ سرحد کی آزادی چاہتے ہیں مگر دستور اساسی کے مسائل اور قانونی موشگافیوں میں نہ انھیں کچھ دخل ہے اور نہ ان چیزوں سے کوئی دلچسپی ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ کامیابی کے لئے عمل کی ضرورت ہے اور مہاتما گاندھی نے با امن عمل کی جو عجیب وغریب مثال قائم کی تھی وہ انھیں پسند آگئی اس لئے بحث مباحثے اور قواعد و ضوابط کے بغیر انھوں نے اپنی قوم کی تنظیم شروع کر دی اور اس میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

انھیں گاندھی جی سے ایک خاص انس ہے مگر ان کی طبیعت میں حجاب بہت ہے اور وہ اپنے آپ کو نمایاں نہیں کرنا چاہتے اس لئے ابتدا میں وہ ان سے الگ الگ

رہے۔ آگے چل کر دونوں کو مختلف معاملات پر گفتگو کرنے کے لئے ایک دوسرے سے ملنے کی ضرورت پیش آئی اور پھر تعلقات کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح اس پٹھان نے عدم تشدد کو نہ صرف عملی طور پر اختیار کیا بلکہ اس کے اصول کو بھی تسلیم کرلیا جو ہم میں سے اکثر نے پورے طور پر نہیں کیا تھا۔ اسی خلوص کی وجہ سے انھیں اس میں کامیابی ہوئی کہ انہوں نے صوبہ سرحد کے لوگوں کو سخت اشتعال کے باوجود تشدد سے باز رکھا۔ یہ کہنا تو بالکل فضول ہے کہ صوبہ سرحد کے باشندوں نے تشدد کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کردیا۔ ایک اسی پر کیا موقوف ہے کسی صوبے کے متعلق یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ عوام جذبات کے جوش میں کام کرتے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ جوش میں آکر کیا کچھ نہ کر گذریں گے۔ مگر جس ضبط نفس سے صوبہ سرحد کے باشندوں نے ۱۹۳۰ء میں اور اس کے بعد کام لیا وہ ایک حیرت انگیز چیز ہے۔

سرکاری ملازم اور ہمارے بعض ڈرپوک ہم وطن ''سرحد گاندھی'' کو شبے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھیں یقین نہیں آتا کہ وہ اپنے قول پر عمل کریں گے۔ اور سمجھتے ہیں کہ اس میں ضرور کوئی گہری سازش ہے۔ مگر پچھلے چند سال میں ہندوستان کے اور حصوں کے کانگریسی کارکنوں کو عبدالغفور خاں اور سرحد کے دوسرے رفیقوں سے بہت کچھ سابقہ رہا ہے۔ ان میں آپس میں گہر دوستی ہوگئی ہے اور ایک دوسرے کی بڑی قدر اور عزت کرنے لگے ہیں۔ یوں تو عبدالغفار خاں کو کانگریس والے برسوں سے جانتے ہیں اور ان کی قدر کرتے ہیں مگر اب ان کی حیثیت محض انفرادی نہیں رہی بلکہ وہ سارے ہندوستان کی نظر میں اس بہادر اور جرار قوم کی شجاعت اور قربانی کے مظہر بن گئے ہیں جو ملک کی جنگ آزادی میں ہمارے دوش بدوش رہی۔

ان کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب میں نے عبدالغفار خاں کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ جن دنوں میں کیمبرج میں پڑھتا تھا

وہ لندن کے سینٹ ٹامس اسپتال میں طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس کے بعد جب میں لندن میں آیا اور بیرسٹری کے لئے انر ٹیمپل میں داخل ہوا تو ہم دونوں میں بڑی دوستی ہوگئی اور کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا کہ میں لندن میں موجود ہوں اور ان سے ملاقات نہ ہو۔ میں انھیں انگلستان میں چھوڑ کر ہندوستان آ گیا اور وہ بہت عرصے تک وہاں رہے اور جنگ کے زمانے میں ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد پھر ان سے نینی جیل میں ملاقات ہوئی۔

صوبہ سرحد کے سرخ پوش کانگرس کے ساتھ کام کرتے تھے مگر ان کی انجمن اب تک علیحدہ تھی۔ یہ ایک انوکھے قسم کا تعلق تھا جس میں عبدالغفار خاں کی ذات واسطے کا کام دیتی تھی۔ ۱۹۳۱ء کی گرمیوں میں ورکنگ کمیٹی نے صوبہ سرحد کے لیڈروں کے ساتھ مل کر اس مسئلے پر اچھی طرح غور کیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ''سرخ پوش'' کانگرس میں ضم کر لئے جائیں۔ اس طرح ''سرخ پوش'' کی تحرے ک کانگرس کے نظام کا ایک جزو بن گئی۔

گاندھی جی چاہتے تھے کہ کراچی کانگرس کے بعد سیدھے صوبہ سرحد جائیں۔ مگر حکومت نے اس پسند نہیں کیا۔ آئندہ مہینوں میں جب سرکاری ملازم ''سرخ پوشوں'' کی جدوجہد سے نالاں تھے انھوں نے بار بار اصرار کیا کہ مجھے صوبہ سرحد جانے کی اجازت دی جائے تکاہ میں خود وہاں کی حالت کو دیکھوں مگر حکومت نے ایک نہیں سنی۔ میرا وہاں جانا بھی گوارا نہیں کیا گیا۔ معاہدہ دہلی کی وجہ سے ہم یہ مناسب نہیں سمجھتے تھے، کہ حکومت کی ممانعت کے باوجود صوبہ سرحد میں داخل ہوں۔

ایک اور مسئلہ جو ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش تھا، فرقہ وارانہ مسئلہ تھا۔ یہ وہی پرانا قصہ تھا جو نئے نئے بھیس بدل کر آتا تھا۔ گول میز کانفرنس کی وجہ سے اس کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ یہ ظاہر تھا کہ برطانوی حکومت اسے سب پر مقدم رکھے گی اور ہر

چیز کو اسی پر منحصر کر دے گی۔ کانفرنس کے ممبر جو سب کے سب حکومت کے نامزد کئے ہوئے تھے۔ اسی نظریئے سے منتخب کئے گئے تھے کہ فرقہ وارانہ مسائل کی اہمیت بڑھ جائے۔ اور مشترک اغراض کے بجائے اختلافات پر زور دیا جائے۔ یہاں تک کہ حکومت نے بڑی دیدہ دلیری سے قوم پرور مسلمانوں کے کسی لیڈر کو مزدر کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ اگر کانفرنس برطانوی حکومت کے اشارے سے سب سے فرقہ وارانہ مسئلے میں الجھ گئی تو اصل سیاسی اور معاشی مسائل پر خاطر خواہ غور نہیں کیا جا سکے گا۔ ان حالات میں انکا کانفرنس میں شریک ہونا بے کار ثابت ہوگا۔ اس لئے انہوں نے ورکنگ کمیٹی سے کہا کہ انہیں لندن اسی صورت میں جانا چاہئے۔ جب فرقہ وارانہ مسئلے کا تصفیہ سب فریقوں کی رضامندی سے ہو جائے۔ ان کا یہ خیال آگے چل کر صحیح ثابت ہوا۔ مگر اس وقت کمیٹی نے ان کی رائے کو نہیں مانا اور یہ فیصلہ کیا۔ انہیں محض اس بناء پر لندن جانے سے انکار نہیں کرنا چاہئے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کو حل نہیں کر پائے۔ کمیٹی نے یہ کوشش کی کہ مختلف فرقوں کے نمائندوں سے مشورہ کر کے کوئی متفقہ تجویز پیش کی جائے۔ مگر اس میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔

یہ ان بڑے مسئلوں میں سے چند مسئلے تھے جو ۱۹۳۱ء کی گرمیوں میں ہمارے سامنے پیش تھے۔ ان کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، ملک کے ہر حصے سے مقامی کانگریس کمیٹیوں کی شکائتیں آ رہی تھیں کہ سرکاری ملازموں نے فلاں فلاں موقع پر دہلی کے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ ان میں سے جو زیادہ اہم تھیں وہ ہم حکومت کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ادھر سے کانگرس والوں پر معاہدے کی خلاف ورزی کے الزام لگائے جاتے تھے۔ غرض دونوں طرف سے شکائتیں ہو رہی تھیں جو آگے چل کر اخباروں میں شائع کر دی گئیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا کانگرس اور حکومت کے تعلقات پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ

چھوٹے چھوٹے جھگڑے بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی اہمیت یہ تھی کہ ان سے ایک بنیادی کش مکش کا پتہ چلتا تھا۔ کش مکش افراد پر منحصر نہ تھی بلکہ اس کی بناء ہماری قومی تحریک کی نوعیت اور ہماری زرعی معیشت کی خرابی تھی اور اس کو دور کرنے کے لئے ادھوری کاروائیاں کافی نہیں تھیں بلکہ پورے نظام کو بدلنے کی ضرورت تھی۔ ہماری تحریک کی ابتداء اس طرح ہوئی تھی کہ ہندوستان کا اونچا اوسط طبقہ اظہار خودی اور نشوونما کے ذریعے ڈھونڈھتا تھا اور اس کہ تہہ میں سیاسی اور معاشی محرکات پوشیدہ تھے۔ پھر اس تحریک میں نیچا اوسط طبقہ بھی شامل ہو گیا اور اس کی قوت بہت بڑھ گئی۔ اس کے بعد یہ لہر دیہات کے عام طبقے میں پہنچی جو بحیثیت مجموعی انتہائی پستی کی حالت میں تھا اور اب اس کے لئے اس پست ترین معیار زندگی کو قائم رکھنا بھی روز بروز دشوار ہوتا جاتا تھا۔ پرانی دیہی معیشت جس میں ہر گاؤں اپنی کل ضرورتیں خود پوری کر لیتا تھا کب کی ختم ہو چکی تھی۔

گھریلو صنعتیں جو زراعت کی معاون تھیں اور کسی حد تک زمین کا بوجھ بٹاتی تھیں مٹ چکی تھیں۔ اس میں کچھ تو حکومت کی پالیسی کو دخل تھا مگر بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ صنعتیں مشین کی بڑھتی ہوئی صنعت کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ غرض زمین کا بوجھ بڑھتا جاتا تھا اور ہندوستان کی صنعتی ترقی کی رفتار اس قدر سست تھی کہ اس سے کوئی خاص مدد نہیں ملتی تھی۔ ہمارے بے ساز و سامان گاؤں کو یکا یک دنیا کے بازار سے سابقہ پڑا اور وہ تنکے کی طرح اس سمندر میں جھکولے کھانے لگا۔ وہ حریفوں سے برابر کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پیداوار کے ذرائع ناقص تھے اور اس نظام آراضی نے کھیتوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر ڈالے تھے جس کی وجہ سے کسی بنیادی اصلاح گرتی جاتی تھی۔ البتہ کبھی کبھی چند روز کی گرم بازاری کے زمانے میں کچھ سنبھل جایا کرتی تھی۔ بڑے زمیندار بڑھتے ہوئے افلاس سے تنگ آ کر قومی تحریک کی طرف ڈھل گئے تھے دیہات کے بے مایہ طبقے یعنی بے شمار زرعی مزدور

بھی ادھر کھنچ رہے تھے۔ ان سب دیہاتی طبقوں کے نزدیک ''قومیت'' یا ''سوراج'' کے معنی یہ تھے کہ نظام اراضی میں کوئی بنیادی تبدیلی ہو جس سے ان کا بوجھ ہلکا ہو اور ان لوگوں کو جو زمین سے محروم ہیں، زمینیں مل جائیں۔ مگر ان خواہشات کا اظہار واضح طور پر نہ تو خود کاشتکاروں کی طرف سے ہوا تھا اور نہ قومی تحریک کے لیڈروں کی طرف سے جو اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

اتفاق سے ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک اور عالمگیر کساد بازاری کا ساتھ ہو گیا جس کا احساس ابتداء میں خود اس کے لیڈروں کو بھی نہ تھا۔ دیہات کے باشندوں پر اس کساد بازاری کا بہت شدید اثر پڑا اور وہ کانگرس اور سول نافرمانی کی طرف دوڑے۔ ان کے لئے اس کا سوال نہ تھا کہ لندن میں یا کسی اور جگہ ایک عمدہ سا دستور اساسی مرتب کیا جائے بلکہ اس کا نظام اراضی میں بنیادی تبدیلی ہو خصوصاً ان صوبوں میں جہاں زمینداری طریقہ رائج ہے۔ سچ پوچھئے تو زمینداری نظام اپنا وقت پورا کر چکا ہے اور اب اس میں کچھ جان نہیں رہی ہے مگر برطانوی حکومت اپنی مصلحتوں کے لحاظ سے نظام اراضی میں اس بنیادی تبدیلی کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ جب اس نے شاہی زرعی کمیشن مقرر کیا تو ملکیت اراضی یا طریق لگان داری کا سوال اس کے موضوع بحث سے خارج کر دیا گیا۔

غرض ہندوستان میں اس وقت جو کش مکش تھی وہ ایک بنیادی چیز تھی اور الفاظ کے منتر یا سمجھوتے کے جادو سے دور نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ مشکل تبھی آسان ہو سکتی تھی جب (علاوہ اور اہم قومی مسائل کے) زمین کا بنیادی مسئلہ حل کیا جائے اور برطانوی حکومت کی مدد سے اس مسئلے کہ حل ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ممکن تھا کہ عارضی تدبیروں سے لوگوں کے کچھ آنسو پچھ جائیں یا انتہائی سختی کر کے ان کی زبانیں بند کر دی جائیں مگر اس سے مسئلہ تو حل ہونے سے رہا۔

برطانوی حکومت کا خیال ہے کہ ہندوستان میں سارا جھگڑا چند شورش برپا

کرنے والوں کی وجہ سے ہے۔ شاید اکثر حکومتوں کی سمجھ ایسی ہی ہوتی ہے یہ خیال بالکل بے سر و پا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان کو پندرہ برس سے ایک بہت بڑا لیڈر مل گیا ہے جس سے اس کے کروڑوں باشندوں کو محبت اور عقیدت ہوگئی ہے اور وہ بہت سے امور میں اس کی مرضی پر چلتے ہیں۔ اسے ہماری موجودہ تاریخ میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے مگر اس سے بھی زیادہ اہم وہ قوم ہے جو بظاہر آنکھ بند کر کے اس کا حکم مانتی ہے۔ کام جو کچھ کیا وہ قوم ہی نے کیا ہے اور اس کے عمل کی محرک تاریخی قوتیں ہیں جنھوں نے اس میں یہ صلاحیت پیدا کر دی کہ اپنے لیڈر کی بات سنیں اور سمجھیں۔ لیڈر کی حیثیت سے گاندھی جی کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ لوگوں کی نبض پہچانتے ہیں اور یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ کام کس وقت شروع کرنا چاہئے۔

۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی قومی تحریک کچھ دنوں کے لئے ابھرتی ہوئی سماجی قوتوں سے مل گئی تھی، اس وجہ سے اس کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور اس میں اصلیت کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تاریخ کے ساتھ قدم ملا کر چل رہی ہے۔ کانگرس اس قومی تحریک کی حامل تھی اور اس کے قوت نے کانگرس کے اثر کو بہت بڑھا دیا تھا۔ یہ ایک مبہم اور غیر متعین چیز تھی مگر اس کے وجود میں کوئی شبہ نہ تھا کسانوں کے شریک ہو جانے سے کانگرس کو بڑی تقویت پہنچی تھی اور نیچا اوسط طبقہ تو اس کے لئے قلب لشکر کا کام دیتا تھا۔ شہر کا اونچا اوسط طبقہ بھی زمانے کے رنگ کو دیکھ کر اپنی سلامتی اس میں سمجھتا تھا کہ کانگرس سے کے مجوزہ اقرار نامے پر دستخط کر دئے تھے اور کوئی ایسی بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے جس میں کانگرس کے ناراض ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ ادھر لندن میں لوگ گول میز کانفرنس میں قانونی باریکیاں چھانٹ رہے تھے اور ادھر اصل قوت کا دھارا آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر کانگرس کی طرف بہتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ فریب نظر معاہدہ دہلی کے بعد اور بھی بڑھ گیا۔ دھواں

دھار تقریروں کی وجہ سے نہیں بلکہ ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد کے واقعات کی وجہ سے۔ سچ پوچھئے تو آنے والی مشکلوں اور خطروں کا اندازہ صرف کانگرس کے لیڈروں کو تھا اور وہی ان کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے تھے۔

لوگوں کے ذہن میں ایک مبہم سا احساس تھا کہ ملک میں دو برابر کی قوتیں کار فرما ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات حکومت کو بہت ناگوار تھی۔ واقعی حیثیت سے یہ خیال بالکل بے بنیاد تھا۔ اس لئے کہ ظاہری قوت سراسر حکام کے ہاتھ میں تھی مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دلوں پر کانگرس کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک تحکم پسند غیر ذمہ دار حکومت کے لئے یہ صورت حال نا قابل برداشت تھی اور یہی چیز تھی مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دلوں پر کانگرس کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک تحکم پسند غیر ذمہ دار حکومت کے لئے یہ صورت حال نا قابل برداشت تھی اور یہی چیز تھی جو اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ دیہات میں چند تقریریں ہونے یا دو چار جلوس نکلنے کی شکایت جو اس کی طرف سے کی گئی محض ایک بہانہ تھا۔ غرض یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ لڑائی ہو کر رہے گی۔ اس لئے کہ نہ تو کانگرس خودکشی کی مرتکب ہو سکتی تھی اور نہ حکومت اس دوعملی کو برداشت کر سکتی تھی۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ کانگرس کو کچل کر رکھ دے گی۔ دوسری گول میز کانفرنس کی وجہ سے یہ لڑائی کچھ دن کے لئے مل گئی۔ خدا جانے کیوں برطانوی حکومت گاندھی جی کو لندن بلانے کے لئے بے چین تھی اور جہاں تک ممکن تھا کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی کہ ان کا جانا رک جائے۔

پھر بھی لڑائی کے آثار بڑھتے جاتے تھے اور ہمیں حکومت کی کشیدگی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ معاہدہ دہلی کے تھوڑے ہی دن بعد لارد ارون ہندوستان سے رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ پر لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہو کر آئے۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ نئے وائسرائے بہت سخت آدمی اور اپنے پیشرو کی طرح مصالحت کو پسند نہیں کرتے۔ ہمارے اکثر لیڈروں نے لبرل پارٹی کی یہ عادت سیکھ لی ہے کہ سیاسی

معاملات کو اصول کے لحاظ سے نہیں بلکہ اشخاص کے لحاظ سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ برطانوی حکومت کی عام پالیسی وائسراؤں کے شخصی خیالات پر منحصر نہیں ہوتی۔ اس لئے وائسرائے کے بدل جانے کا نہ کوئی اثر ہوا اور نہ ہوسکتا تھا۔ یہ اتفاقی بات تھی کہ واقعات کی رفتار کے لحاظ سے حکومت نے رفتہ رفتہ اپنی پالیسی بدل دی۔ سول سروس والوں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ حکومت کانگرس سے معاہدہ کر لے۔ ان کی ساری تربیت اور تحکم پسندانہ خیالات اس کے مخالف تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی سے برابری کا برتاؤ کر کے حکومت نے ان کا رعب اور کانگرس کا اثر بہت بڑھا دیا اور اب اس کی ضرورت ہے کہ ذرا ان کا دماغ درست کر دیا جائے۔ یہ ایک احمقانہ خیال تھا مگر ہندوستان کی سول سروس کی پرواز فکر کچھ بہت اونچی نہیں ہوا کرتی۔ بہر حال کسی نہ کسی وجہ سے حکومت تن کر بیٹھ گئی اور اس نے سختی سے کام لینا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ توریت کے الفاظ میں ہم سے کہہ رہی ہے "میری چھنگلی میرے باپ کی رانوں سے زیادہ موٹی ہے، اس نے تو تمہیں کوڑے ہی لگائے تھے میں بچھوؤں سے کٹواؤں گا۔"

مگر ابھی سزا کا وقت نہیں آیا تھا۔ یہ کوشش ہو رہی تھی کہ کانگرس کا نمائندہ گول میز کانفرنس میں بھیجا جائے۔ گاندھی جی نے دوبارہ شملے جا کر وائسرائے اور دوسرے حکام سے مختلف مسائل پر خصوصاً صوبہ سرحد کی سرخ پوشوں کی تحریک اور صوبہ متحدہ کے کاشتکاروں کی حالت پر گفتگو کی، سرخ پوشوں کی تحریک اور صوبہ متحدہ کے کاشتکاروں کی حالت پر گفتگو کی۔ بنگال کے مسئلے کے علاوہ یہی دو مسائل حکومت کو سب سے زیادہ پریشان کر رہے تھے۔

گاندھی جی نے مجھے شملہ بلوالیا اور میں بھی حکومت ہند کے بعض اراکین سے ملا۔ میری ان کی گفتگو صرف صوبہ متحدہ تک رہی، ان سے صاف صاف باتیں ہوئیں اور ان اصل نزاعی معاملات پر بحث ہوئی جو چھوٹی چھوٹی شکایتوں کی تہ میں

پوشیدہ تھے۔ ہم سے یہ کہا گیا کہ فروری ۱۹۳۱ء میں حکومت چاہتی تو سول نافرمانی کی تحریک کو تین مہینے میں کچل کر رکھ دیتی۔ سیاست کی مشین کیل کانٹے سے درست تیار کھڑی تھی صرف ایک بٹن دبانے کی دیر تھی مگر یہ سمجھ کر کہ باہمی رضامندی سے تصفیہ ہو جائے تو اچھا ہے اس نے تجربے کے طور پر گفت وشنید کا سلسلہ چھیڑا، جس سے دہلی کے معاہدے کے صورت نکل آئی۔ اگر معاہدے میں کامیابی نہ ہوتی تو وہ بٹن تو موجود ہی تھا، دبایا جاتا۔ اس میں اشارہ بھی تھا کہ اگر تم نے شرارت کی تو بہت جلد اس بٹن کو دبانے کی ضرورت پڑے گی۔ یہ سب باتیں بڑے شائستہ الفاظ میں کہی گئیں۔ مگر دونوں فریق اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کچھ بھی کہیں، اور کچھ بھی کریں لڑائی تو ہو کر رہے گی۔

ایک اور اعلیٰ حاکم نے کانگرس کی بڑی تعریف کی۔ ہم اس وقت وسیع تر غیر سیاسی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ سیاست سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو کانگرس نے ہندوستان کی بڑی خدمت کی ہے۔ ہندوستانیوں پر عموماً یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان میں تنظیم کا مادہ نہیں مگر ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے سخت مشکلات اور مخالفت کے باوجود تنظیم کا حیرت انگیز نمونہ دکھا دیا۔

جب گاندھی جی پہلی بار شملے گئے تو ان کے گول میز کانفرنس میں جانے کا مسئلہ طے نہیں ہو سکا تھا۔ اگست کے دوسرے ہفتے میں وہ دوبارہ وہاں تشریف لے گئے۔ اب ادھر یا ادھر فیصلہ کرنا تھا۔ مگر وہ اب بھی ہندوستان کو اس حالت میں چھوڑ کر جاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ بنگال، صوبہ سرحد، صوبہ متحدہ میں آثار اچھے نظر نہیں آتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ ہندوستان میں امن قائم رہے گا اس وقت تک نہ جائیں۔ آخر حکومت سے کچھ نہ کچھ فیصلہ ہو گیا جو ایک اعلان یا چند خطوط کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ بہت تنگ وقت میں ہوا جب گول میز کانفرنس کے نمائندوں کا آخری جہاز روانہ ہونے ہی کو تھا۔ ایک اسپیشل

ٹرین شملے سے کالکا روانہ ہوئی اور دوسری گاڑیاں روک دی گئیں تا کہ گاندھی جی کو ہر جگہ گاڑی ملتی جائے۔

میں ان کے ساتھ شملے سے بمبئی گیا اور وہاں اگست کے آخر کی ایک روشن صبح کو انھیں خدا حافظ کہا اور ان کے جہاز کو بحر عرف میں مغرب کے سمت جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد دو برس تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

گول میز کانفرنس

حال ہی میں ایک انگریز اخبار نویس نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں بھی،اور لندن میں گول میز کانفرنس کے وقت بھی انہیں گاندھی جی سے خوب ملنے جلنے کا موقع ملا۔اس کتاب میں یہ لکھتے ہیں: ملتان جہاز پر جو لیڈر سفر کر رہے تھے،وہ سب جانتے تھے کہ خود کانگرس کی مجلس عاملہ میں مسٹر گاندھی کے خلاف ایک سازش ہے۔

یہ جانتے تھے کہ جب وقت آئے گا تو کانگرس مسٹر گاندھی کو نکال باہر کرے گی۔لیکن کانگرس نے انہیں نکالا تو ساتھ ہی غالباً اپنے آدھے ممبروں کو نکالنا ہو گا۔اور یہی وہ نصف تھا،جسے سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر اپنے لبرل مسلک کا ساتھی بنانا چاہتے تھے۔یہ لوگ اس بات کو کبھی نہیں چھپاتے کہ مسٹر گاندھی (خود ان کے الفاظ) میں ذرا الجھے دماغ کے آدمی ہیں۔لیکن جو الجھی کوپڑی والا لیڈر اپنے ساتھ کوئی دس لاکھ الجھی کھوپڑی کے پیرو بھی لا سکے۔اس کو اپنی طرف ملانے کی کوشش تو بہر حال کرنے کی چیز (ا) ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس اقتباس سے مسٹر سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر کے خیالات کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے،یا نہیں یا گول میز کے ان اراکین کے خیالات کی جو 1931 میں لندن تشریف لے جا رہے تھے۔البتہ مجھے اس بات پر حیرت ضرور ہے کہ کوئی شخص بھی،اخبار نویس ہو کہ ''لیڈر'' جو ہندوستانی سیاست سے ذرا بھی واقف ہو۔وہ اس قسم کی بات کیسے کہہ سکتا ہے؟ میں تو اسے پڑھ کر ششدر رہ گیا۔پہلے کبھی اس کا ذکر بھی میں نے نہ سنا تھا۔مگر اس لاعلمی کو سمجھنا تو یوں مشکل نہیں،کہ اس وقت کے بعد سے میں زیادہ تر قید میں رہا ہوں۔

یہ سازش کرنے والے آخر تھے کون اور ان کا ارادہ کیا تھا؟ کبھی،کبھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ صدر ولبھ بھائی پٹیل اور میں مجلس عاملہ کے انتہا پسندوں میں سے

تھے۔اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہو نہ ہو ضرور ہم ہی کو اس سازش کے سرغنوں میں گنا گیا ہو گا۔حالانکہ شاید ہی سارے ہندوستان بھر میں گاندھی جی کا کوئی اور ساتھی ولبھ بھائی پٹیل جیسا وفادار ہو۔ولبھ بھائی اپنے کام میں مضبوط اور نہ دبنے والے آدمی ہیں۔مگر شخصی طور پر وہ گاندھی جی کے اور ان کے خیالات اور طریقہ کار کے دلدادہ بھی ہیں۔میں اپنے متعلق یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے بھی گاندھی جی کے خیالات کو انھی کی طرح قبول کیا ہے،لیکن گاندھی جی کے ساتھ نہایت قریبی طور پر مل جل کر کام کرنے کا شرف مجھے بھی حاصل رہا ہے۔اور ان کے خلاف سازش کرنے کا خیال بھی میرے لئے ہر حال میں ناممکن اور لغو ہے۔اور میں کیا ساری مجلس عاملہ کا یہی حال ہے۔یہ مجلس عملاً انھی کی بنائی ہوئی ہے۔انھی نے چند ساتھیوں کے مشورے سے اسے نامزد کیا تھا۔انتخاب تو بس ایک ضابطہ کی کاروائی تھی۔اس مجلس کا بڑا اور با اثر حصہ تو ان اراکین پر مشتمل تھا۔جو اس میں برسوں سے کام کر رہے تھے۔اور اب مستقل سے ممبر سمجھے جانے لگے تھے۔بے شک ان میں بھی سیاسی اختلافات تھے،نقطہ نظر کے اختلاف تھے۔لیکن انہوں نے برسوں ایک ساتھ کام کیا تھا۔مل کر بوجھ اٹھائے تھے۔مل کر خطروں کو انگیز اتھا۔اور ان باتوں نے انہیں باہم جوڑ سا دیا تھا۔ان میں دوستی رفاقت،اور ایک دوسرے کی عزت کے رشتے پیدا ہو گئے تھے۔اب یہ مجلس مختلف الخیال لوگوں کا محض ایک مجموعہ نہ تھی،بلکہ ایک نامی وحدت بن گئی تھی۔اور یہ بات وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی،کہ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے خلاف سازش کرے گا۔گاندھی جی اس مجلس پر پوری طرح حاوی تھے۔اور ہر شخص ہدایات کے لئے بس ان ہی کی طرف دیکھتا تھا،یہ صورت حال کئی سال سے یونہی تھی۔اور ۱۹۳۰ء کی عظیم الشان کامیابی کے بعد ۱۹۳۱ء میں تو یہ بات اور بھی صاف دکھائی دیتی تھی۔

اچھا،گاندھی جی کو نکال باہر کرنے کی کوشش سے مجلس عاملہ کے ان انتہا

پسندوں کی غرض کیا ہو سکتی تھی۔؟ شاید یہ سمجھا جاتا ہو کہ گاندھی جی چونکہ سمجھوتہ کرنے والے آدمی ہیں۔اس لئے یہ لوگ انہیں راہ میں حائل جانتے ہوں گے۔لیکن گاندھی جی کے بغیر یہ تحریک ہی کہاں ہوتی۔سول نافرمانی کا پتہ کہاں ہوتا اور ستیا گرہ کا نشان کہاں ملتا؟۔وہ تو خود اس زندہ تحریک کے ایک جزو تھے۔نہیں سچ تو یہ ہے۔تحریک ہی وہ تھے۔جہاں تک اس تحریک کا تعلق تھا، سب کچھ ان پر منحصر تھا۔یہ ضرور ہے کہ قومی تحریک ان کی آفریدہ نہیں تھی، نہ وہ کسی ایک شخص پر منحصر ہو سکتی ہے۔اس کی جڑیں تو اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔مگر تحریک کی یہ خاص شکل جس کا علم سول نافرمانی ہے۔خصوصیت کے ساتھ ان سے وابستہ تھی، ان سے جدا ہونے کے معنی یہ تھے، کہ اس تحریک کی ساری بساط ہی تہہ کر دی جائے۔اور نئے سرے سے نئی بنیادوں پر کوئی نئی عمارت کھڑی کی جائے۔یہ تجویز کسی وقت بھی کی جائے تو خاصی دشوار ہے۔۱۹۳۱ء میں تو اس کا خیال بھی کسی کو نہیں آ سکتا تھا۔

یہ خیال کر کے بھی ہنسی آتی ہے، کہ بعض لوگوں کے نزدیک ہم میں سے چند ۱۹۳۰ء گاندھی جی کو کانگرس سے باہر نکالنے کی سازش کر رہے تھے: بھلا ہمیں اس سازش کی ضرورت ہی کیا تھی۔جب ایک ذرا سا اشارہ ہی کافی ہوتا؟ گاندھی جی کی طرف سے جب بھی یہ ظاہر ہوا ہے، کہ وہ سیاست سے کنارا کش ہونا چاہتے ہیں۔تو مجلس عاملہ اور سارے ملک میں تہلکہ سا مچ گیا ہے۔وہ تو ہمارے جہاد آزادی کا ایسا جزو بن گئے ہیں۔کہ یہ خیال تک برداشت نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ہم تو انہیں لندن بھیجتے بھی جھجکتے تھے، کہ ان کی غیر حاضری میں سارا بوجھ ہم پر آن پڑے گا۔اور اس کا خیال بھی ہمیں بھلا نہ لگتا تھا۔ہم لوگ تو اپنے بوجھ کو ان کے کاندھوں پر منتقل کر دینے کے ایسے عادی ہو گئے تھے۔ہم میں سے بہتوں کے لئے مجلس عاملہ کے اندر اور اس کے باہر گاندھی جی سے وابستگی کے رشتے کچھ ایسے تھے، کہ ہم اسے ترجیح دیتے تھے کہ ان کے ساتھ رہ کر ہار جائیں۔بہ نسبت اس کے

کہ ان سے الگ ہو کر کوئی عارضی کامیابی حاصل کر لیں۔

اس بات کا فیصلہ کہ گاندھی جی الجھے دماغ کے آدمی ہیں یا نہیں، ہم اپنے لبرل دوستوں ہی پر چھوڑتے ہیں، بے شک یہ سچ ہے کہ ان کی سیاست کبھی، کبھی بہت ہی فلسفیانہ اور حقائق سے دور ہو جاتی ہے۔ اور اس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر انہوں نے اپنے کو ایک نہایت ہی عملی آدمی ثابت کیا ہے۔ غیر معمولی ہمت اور جرات کا آدمی اور ایسا آدمی کہ جو کچھ کہتا ہے، اسے کر بھی دکھاتا ہے۔ پھر اگر الجھے ہوئے دماغ کے ایسے عملی نتائج نکل سکتے ہیں، تو یہ الجھاؤ اس عمل، سیاست سے کیا برا ہے؟ جو مطالعہ کے کمروں اور خواص کے حلقوں میں شروع ہوتی ہے۔ اور وہیں ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان کے پیرو بھی الجھے دماغ کے لوگ ہیں۔ وہ نہ سیاست کو سمجھتے ہیں۔ نہ قانون دستوری سے آشنا ہیں، وہ سوچتے ہیں تو بس اپنی انسانی ضرورتوں کے اعتبار سے، یعنی کھانے پینے، گھر، ور، کپڑے لتے اور زمین کے اعتبار سے۔

مجھے ہمیشہ اس پر تعجب ہوتا ہے، کہ ممتاز پردیسی اخبار نویس، جنھیں فطرت انسانی کے مشاہدہ کی خوب مشق ہوتی ہے، یہاں ہندوستان میں آ کر کیوں غلطی کر جاتے ہیں۔ اس کی وجہ کہیں ان کے بچپن کا یہ انمٹ خیال تو نہیں۔ کہ مشرق میں دنیا ہی نرالی ہے۔ اسے معمولی معیار سے جانچا ہی نہیں جا سکتا، یا انگریزوں کے معاملے میں یہ بات تو نہیں ہے کہ سامراج سے ان کی نظر میں ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور نظارہ کو مسخ کر دیتی ہے۔ کوئی بات ہو کیسی ہی بعید از قیاس ہو، وہ اسے بلا تعجب کے یقین کر لیتے ہیں۔ اس لئے کہ مشرق کے اسرارستان میں ہر چیز ممکن ہے۔ وہ کتابیں شائع کرتے ہیں، جن میں نہایت اچھے تبصرے اور نہایت گہرے مشاہدے بھی ملتے ہیں۔ لیکن بیچ، بیچ میں ایسی غلطیاں بھی ہوتی ہیں، کہ بس حیرت ہو جاتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی یورپ جا رہے تھے، تو میں نے

لندن کے ایک اخبار میں اس کے پیرس کے نامہ نگار کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ یہ مضمون ہندوستان کے متعلق تھا۔ اس میں نامہ نگار نے ایک واقعہ کا ذکر کیا تھا، جو اس کے نزدیک ۱۹۲۱ء میں ترک موالات کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ اس وقت جب شہزادہ ویلز ہندوستان آئے تھے۔ لکھا تھا کہ کسی مقام پر (غالباً دہلی میں) مہاتما گاندھی ایک مرتبہ بلا اطلاع شہزادے کے سامنے جا پہنچے، گھٹنوں پر گر پڑے، شہزادے کے پیر پکڑ لیے، دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اور ان سے التجا کی کہ اس ناشاد ملک کو امن وسکون ارزانی فرمائیں! ہم میں سے کسی نے خود غریب گاندھی جی سے یہ قصہ نہ سنا تھا۔ میں نے ان نامہ نگار صاحب کو ایک خط لکھا۔ اور انہیں یہ بھی بتایا کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ انھوں نے اس پر افسوس ظاہر کیا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ انھیں یہ قصہ ایک معتبر ذریعہ سے پہنچا تھا۔ مجھے جس بات پر تعجب ہوا۔ وہ یہ کہ اس نامہ نگار نے ایسے قصے کو باور کرلیا، اور حقیقت دریافت کرنے کی ذرا کوشش نہ کی۔ حالانکہ یہ قصہ بادی النظر میں ہی اس قدر بعید از قیاس ہے۔ کہ کوئی شخص جو گاندھی جی کو یا کانگرس کو، یا ہندوستان کو ذرا بھی جانتا ہو، اسے یقین نہ کرتا، بدقسمتی سے بہت سے انگریز جو ہندوستان ہی میں عرصہ سے رہتے ہیں۔ وہ بھی اس ملک کے متعلق یا کانگرس کے متعلق یا گاندھی جی کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ بہر حال یہ قصہ بالکل ہی ناقابل یقیناً ور مضحکہ خیز تھا۔ جس کے مقابلے میں بس اس فرضی قصے کی روداد پیش کی جاسکتی ہے۔ جب کہ کنٹربری کے لاٹ پادری صاحب یکا یک مسولینی کے سامنے جا پہنچے، سر نیچا کیا اور ٹانگیں اوپر، اور سلام اور دعا کی جگہ لگے فضا میں اپنی دونوں ٹانگوں کو حرکت دینے۔

حال ہی میں ایک اور اخبار میں ایک اطلاع شائع ہوئی ہے، جس میں ایک اور ہی قسم کا قصہ پیش کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ گاندھی جی کے پاس بے حساب رقمیں ہیں۔ جن کا شمار لاکھوں پونڈ تک پہنچتا ہے۔ یہ رقمیں خفیہ طور پر دوستوں کے پاس

رکھی ہیں۔اور کانگرس کی نظر اس روپے پر ہے۔اگر گاندھی جی کانگرس سے ہٹے تو ڈر ہے کہ یہ خزانے ہاتھ سے جائیں گے۔یہ افسانہ بھی سرتاپا لغو ہے۔اس لئے کہ گاندھی جی کبھی بھی کسی قسم کا فنڈ اپنی تحویل میں نہیں رکھتے۔نہ کو دا پنے پاس۔نہ چھپا کر دوستوں کے پاس، جو کچھ جمع کرتے ہیں، کسی پبلک ادارے کے سپرد کر دیتے ہیں۔حساب کتاب ٹھیک رکھنے کے باب میں ان کی جبلت ایک بنیے کی سی ہے۔اور ان کی جمع کی ہوئی رقموں کی ہمیشہ باضابطہ جانچ ہوتی رہتی ہے۔

یہ افواہ غالباً اس مشہور ایک کروڑ روپیہ والیقصہ پر مبنی ہے۔جو کانگرس نے ۱۹۲۱ میں جمع کیے تھے۔یہ رقم جو یوں خاصی بڑی معلوم ہوتی ہے، مگر سارے ہندوستان پر پھیلائی جائے، تو کچھ ایسی بڑی نہیں۔قومی یونیورسٹیوں، مدرسوں کے لئے استعمال ہوئی، اور دیہی صنعتوں خصوصاً کھدر کو فروغ دینے میں یا اچھوتوں کے کاماور دوسری تعمیری تجاویز کے سلسلہ میں۔اس میں سے بہت تو پہلے ہی سے مختلف کاموں کے لئے مخصوص تھیں۔اور یہ فنڈ اب تک موجود ہیں۔اور ان مخصوص اغراض میں کام آرہے ہیں۔باقی حصہ مقامی کمیٹیوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔اور کانگرس کے تنظیمی اور سیاسی کاموں میں صرف ہوا۔ترک موالات کی تحریک کے مصارف، اس سے پہلے اور اس سے چند سال بعد تک کانگرس کا کام بھی اسی روپیہ سے چلا۔گاندھی جی نے اور پبلک کے افلاس نے ہمیں یہ سکھا دیا تھا کہ اپنی سیاسی تحریک کو بہت ہی محدود وسائل سے چلائیں۔

ہمارے کام کا بڑا حصہ تو بلا معاوضہ رہا ہے۔اور جب کبھی کوئی رقم بقدر معاوضہ دی گئی تو بس مشکل سے پیٹ بھرنے کے قابل، ہمارے بہترین کام کرنے والوں کو، یونیورسٹی کے فارغ التحصیل لوگوں کو، جن کے ذمہ پورے خاندان کے مصارف بھی تھے۔ہم نے اس سے کم دیا ہے جتنا کہ انگلستان میں ایک بے روزگار مزدور کو بطور الاؤنس دیا جاتا ہے۔میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی سیاسی یا مزدوروں کی

تحریک بڑے پیانے پر کہیں بھی اس قدر کم خرچ پر چلی ہے۔ جیسے کہ پچھلے پندرہ برس میں کانگرس کی تحریک۔ سال بہ سال کانگرس کے تمام حسابات کی باضابطہ علی اعلان جانچ ہوتی ہے، ان کا کوئی حصہ خفیہ نہیں رہا ہے۔ سوائے سول نافرمانی کے زمانہ میں۔ جب کہ کانگرس کو خلاف قانون جماعت قرار دیا تھا۔

گاندھی جی لندن کی گول میز کانفرنس میں کانگرس کے نمائندہ کی حیثیت سے گئے تھے۔

بہت کچھ بحث ومباحثہ کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا، کہ کوئی اور نمائندہ نہ بھیجا جائے۔ کچھ تو اس کی وجہ یہ تھی، کہ ہم اپنے بہترین آدمیوں کو اس کٹھن زمانے میں ہندوستان ہی میں رکھنا چاہتے تھے۔ کہ اس زمانہ میں بہت ہوشیاری سے ساری تحریک کو ہاتھ میں رکھنا تھا۔ ہم محسوس کرتے تھے، کہ گول میز کانفرنس کے باوجود اصل مرکز ثقل ہندوستان ہی میں ہے۔ اور ہندوستان میں جو صورت حال پیدا ہوگی اس کا اثر لازمی طور پر لندن میں پڑے گا۔ ہم چاہتے تھے کہ ناموافق حالات کو پیدا ہونے سے روکیں۔ اور اپنی تنظیم کو درست حالت میں برقرار رکھیں۔ لیکن سرف ایک نمائندہ بھیجنے کی اصل وجہ یہ نہ تھی۔ اگر ہم ضرورت سمجھتے اور غایت جانتے تو ضرور اور نمائندے بھی بھیجتے۔ مگر ہم نے قصداً ایسا نہیں کیا۔

ہم گول میز کانفرنس میں کچھ اس لئے تو شرکت کر نہیں رہے تھے، کہ جا کر دستور ملکی کی ضمنی تفصیلات سے متعلق وہ بحثیں چھیڑیں، جو کبھی ختم ہی ہونے میں نہ آئیں۔ اس وقت ان تفصیلات میں ہمیں ذرا دل چسپی نہ تھی۔ ان پر تو غور اسی وقت ہو سکتا تھا۔ کہ برطونوی حکومت سے بنیادی معاملات پر کوئی سمجھوتہ ہو جاتا۔ اصل سوال یہ تھا کہ جمہوری ہند کو کتنی طاقت منتقل کرنی ہے۔ تفصیلات کو طے کرنے اور انہیں قلم بند کرنے کا کام تو کوئی بھی قانون دان بعد کو کر سکتا تھا۔ ان بنیادی امور میں کانگرس کا مقصد صاف اور سادہ تھا۔ اور اس مین بحث اور دلیل کی

زیادہ گنجائش نہ تھی۔ہم نے سوچا کہ ہمارے لئے باوقار طریقہ یہی ہے کہ ہمارا بس ایک نمائندہ اور وہ خود ہمارا قائد جائے۔اور ہمارے مسلک کو پیش کر کے بتادے کہ وہ کس قدر معقول ہے۔اور کس قدر اٹل اور ہو سکے تو اس مسلک کے لئے برطانوی حکومت کی حمایت حاصل کرے۔کام مشکل تھا،یہ ہم خوب جانتے تھے،اور معاملات کی جو صورت اس وقت تھی،اس میں مشکل ہی سے اس کے کرنے کا امکان تھا۔مگر کیا کرتے۔کوئی دوسری صورت بھی ہمارے سامنے نہ تھی،ہم اپنے مسلک کو اپنے اصولوں کو،اور اپنے مطمع نظر کو چھوڑ نہیں سکتے تھے،ہم ان کے پابند تھے،اور ان پر پکا یقین رکھتے تھے۔اگر حسن اتفاق سیان بنیادی اصولوں پر سمجھوتے کی کوئی صورت نکل آتی تو پھر باقی کام بہت آسان ہو جاتا۔بلکہ ہم میں یہ طے ہو چکا تھا،کہ اگر سمجھوتہ ہو گیا تو گاندھی جی فوراً مجلس عاملہ کے چند یا سب اراکین کو لندن بلا لیں گے۔تاکہ تفصیلات پر بات چیت میں سب شریک ہو سکیں۔ہمیں ہدایت تھی کہ ہم تیار رہیں۔اور ضرورت ہو تو ہوائی جہاز سے سفر کریں۔یوں گویا بلاوے کے دس دن کے اندر ہم لوگ گاندھی جی کے پاس پہنچ سکتے تھے۔

لیکن اگر بنیادی باتوں پر سمجھوتہ نہ ہو تو پھر مزید گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔نہ کانگرس کو ضرورت ہوتی کہ گول میز کانفرنس میں مزید نمائندے بھیجے۔لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ اکیلے گاندھی جی کو بھیجیں۔مجلس عاملہ کے ایک اور رکن مسٹر سروجنی نائڈو نے بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔مگر کانگرس کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں،انھیں ہندوستان کی عورتوں کی نمائندے کی حیثیت سے دعوت دی گئی تھی،اور مجلس عاملہ نے انہیں جانے کی اجازت دیدی تھی۔

مگر برطانوی حکومت اس معاملے میں ہماری خواہشوں کو پورا کرنا نہیں چاہتی تھی۔اس کی تدبیر یہ تھی کہ بنیادی امور پر غور و بحث کو برابر ٹالیں تاکہ کانفرنس کم و بیش ضمنی اور غیر اہم باتوں پر بحث کر کر کے تھک جائے۔کہیں کوئی اہم معاملہ سامنے

آہی گیا تو حکومت رکی رکی رہی اپنے کو کسی بات پر قطعی طور سے پابند نہ کیا اور بس یہی وعدہ کر دیا کہ مزید غور و خوض کر کے بعد کو اپنی رائے ظاہر کرے گی۔ ان کا ترپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اسے انھوں نے خوب کھیلا۔ ساری کانفرنس پر ایک یہی مسئلہ حاوی رہا۔

کانفرنس کے ہندستانی ممبروں میں سے بڑی اکثریت، زیادہ تر ارادہ، اس سرکاری چال کا ساتھ دے رہی تھی۔ اور یہ مجمع تھا بھی نرالا ان میں کون تھا جو اپنی ذات کے سوا اور کسی کا نمائندہ ہو۔ بعض ان میں سے ضرور قابل اور معزز لوگ تھے، اور بہت سے ایسے تھے جن کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے یہ لوگ بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کے سب سے زیادہ ترقی دشمن عناصر کے نمائندے تھے، اور ایسے رجعت پسند اور تغیر دشمن کہ ہمارے ہندوستانی لبرل تک، جو یہاں اس درجہ محتاط اور معتدل لوگ سمجھے جاتے ہیں، وہاں ان کے مقابلہ میں ترقی خواہ حیثیت سے چمکتے رہے۔ یہ لوگ ہمارے ملک کے ان اہل گرض گروہوں کی نمائندگی کر رہے تھے جن کا مفاد برطانوی سامراج سے وابستہ ہے اور اپنی غرضوں کی تکمیل اور تحفظ کے لئے یہ اسی سامراج کا منہ تکتے ہیں۔ سب سے ممتاز نمائندگی مختلف اقلیتوں، اور اکثریتوں کی طرف سے فرقہ وارانہ مسئلہ کے متعلق تھی، ان میں اونچے طبقہ کے کچھ لوگ تھے جو کسی کی بات نہیں مانتے اور جن کے متعلق مشہور تھا کہ آپس میں بھی متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ سیاسی لحاظ سے یہ سب کٹر ترقی دشمن تھے اور ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کچھ فرقہ واری فائدہ حاصل کر لیں، چاہے اس میں ملک کی سیاسی ترقی کو یکسر ہاتھ سے دینا ہی کیوں نہ پڑے۔ چنانچہ انھوں صاف اعلان ہی کر دیا تھا کہ کسی ایسی کارروائی پر جس سے ملک کو کچھ اور سیاسی آزادی ملے یہ اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ان کے فرقہ وارانہ مطالبات پورے نہ ہو جائیں۔ کیسا نرالا نظارہ تھا! اور کیسی تکلیف دہ وضاحت سے

یہ بات روشن ہوتی تھی کہ ایک محکوم قوم کس قدر نیچے جاسکتی ہے اور کس طرح اسے سامراجی بساط کا مہرا بنایا جاسکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ راجوں مہاراجوں، لاٹ صاحبوں، سروں اور رابالقابہم کا یہ انبوہ ہندوستانی قوم کا نمائندہ نہیں کہا جاسکتا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ گول میز کانفرنس کے اراکین کو برطانوی حکومت نے نامزد کیا تھا اور اپنے نقطہ نظر سے واقعی خوب انتخاب کیا تھا۔ یہ سب صحیح، مگر پھر بھی اس بات سے کہ برطانوی حکام ہمیں یوں برت سکتے اور اپنے کام میں لاسکتے ہیں، ہماری قوم کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی۔ اور پتہ چلتا تھا کہ ہمیں کس آسانی سے بہکایا جاسکتا ہے اور ایک سے دوسروں کی کوششوں کا کیسے کاٹ کرایا جاسکتا ہے۔ ہمارے اونچے طبقہ کے لوگ ابھی تک سامراجی حکمرانوں کی ذہنیت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور انھیں کا کام کرتے ہیں۔ کیا انھیں اس کی حقیقت نہیں دکھائی دیتی؟ یا یہ بات ہے کہ اس کی حقیقت کو جانتے ہیں اور جان بوجھ کر اس لئے اسے قبول کرتے ہیں کہ ملک میں جمہوریت اور آزادی کے قیام سے انھیں ڈر لگتا ہے۔

بہت ہی ٹھیک بات تھی کہ اغراض کے اس ہجوم میں، سامراجی، منصب داری مالیاتی، صنعتی، مذہبی، فرقہ واری اغراض کے اس جھمگٹ میں، برطانوی ہند کے نمائندوں کی سرداری عموماً آغاخان کے حصہ میں آئی تھی۔ اس لئے کہ اغراض کچھ نہ کچھ سب ہی ان کی ذات میں یکجا جمع ہیں۔ ایک نسل سے زیادہ عرصہ سے یہ برطانوی سامراج اور حکمران طبقہ کے ساتھ وابستہ رہے ہیں، رہتے سہتے بھی زیادہ تر انگلستان ہی میں ہیں۔ یہ ہمارے حکمرانوں کے مفاد اور ان کے نقطہ نظر کو واقعی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ اگر گول میز کانفرنس میں سامراجی انگلستان کی طرف سے یہ آتے تو اس کے نہایت ہی قابل نمائندہ ثابت ہوتے۔ مگر ستم ظریفی یہ کہ ہندوستان کی نمائندگی فرما رہے تھے۔

کانفرنس میں ہمارا مقابل پلہ بہت بھاری تھا، اور ہمیں اس سے کوئی زیادہ توقع

بھی نہ تھی۔ پھر بھی اس کی کارروائی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور گھن آتی تھی۔ ہم قومی اور معاشی مسائل کی بھی سطح کو کھرچنے کی لغو اور جھوٹ موٹ کی کوششوں کو دیکھتے تھے، معاہدوں اور سازشوں اور چالوں کو دیکھتے تھے۔ برطانوی کنزرویٹو پارٹی کے ترقی دشمن حصہ سے اپنے بعض اہل وطن کا ساز باز دیکھتے تھے چھوٹے چھوٹے معاملات پر لامتناہی بک بک سنتے تھے، دیکھتے کہ اصلی معاملات کو کیس جان بوجھ کر ٹالا جا رہا ہے اور ہمارے ہی آدمی برابر کس طرح اہل غرض اور خصوصاً برطانوی سامراج کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، آپس کی جھک جھک دیکھتے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ جشن اور دعوتیں اور باہمی مدح وثنا کا طوفان! شروع سے آخر تک خدمتوں اور نشستیں، مسلمانوں کے لئے خدمتیں ہوں اور نشستیں، سکھوں کے لئے بھی ہوں، اینگلو انڈین جماعت کے لئے بھی اور یورپین گروہ کے لئے بھی۔ مگر ہوں خدمتیں سب اعلیٰ طبقہ کے لئے۔ بچارے عوام کو ان میں ذرا دخل نہ ہو۔ ابن الوقتی کا دور دورہ تھا اور مختلف گروہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح شکار کی گھات میں تھے، بس یہی فکر تھی جب نئے دستور اساسی میں کچھ لے مریں۔ خود آزادی کے تصور نے بڑے پیمانہ پر خدمت طلبی کی شکل اختیار کر لی تھی جسے (Indianization) یا ہندیانا، کہتے تھے، یعنی فوج میں ہندوستانیوں کو زیادہ خدمتیں ملیں، سول سروس میں بھی زیادہ ملیں، وغیرہ وغیرہ۔ خود مختاری، حقیقی آزادی، جمہوری ہند کو طاقت اور اختیار کی منتقلی، یا ہندوستانی قوم کے کسی اہم اور ضروری معاشی مسئلہ کے حل کا وہاں ذکر ہی نہ تھا۔ کیا اسی کے لئے ہندوستان نے یوں مردانہ وار جدوجہد کی تھی؟ اور کیا ایثار قربانی کی اس لطیف فضا کو کانفرنس کی کثیف ہوا سے بدلنا ضروری تھا؟

اس سنہرے اور بھرے ہوئے ہال میں گاندھی جی بیٹھے تھے، یکہ وتنہا ان کا لباس یا بے لباسی، انھیں اوروں سے ممتاز کرتی تھی مگر ان کے خوش لباس ہم نشینوں میں افکار اور نقطہ نظر کا فرق اس سے بھی زیادہ تھا۔ اس کانفرنس میں ان کی

حیثیت بڑی ہی مشکل کی تھی اور ہم یہاں دور سے بیٹھے حیرت کرتے تھے۔ کہ اسے کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔ لیکن وہ حیرت انگیز صبر کے ساتھ اپنا کام کئے گئے اور پیہم کوشش کرتے رہے کہ سمجھوتہ کی کوئی صورت پیدا۔ ہوانھوں نے ایک خاص بات کی جس نے ایک مرتبہ یہ راز فاش کر دیا کہ فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے۔ کانفرنس کے مسلمان نمائندوں نے جو فرقہ وارانہ مطالبات پیش کئے تھے گاندھی جی ان میں سے بہتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا اور ان کے مسلمان قوم پرور ساتھیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ان مطالبات میں سے بعض آزادی اور جمہوریت کی راہ میں حائل ہوں گے پھر بھی انھوں نے کہہ دیا کہ میں بلا پوچھے گچھے اور بے دلیل و بحث ان سب مطالبوں کو مان لوں گا۔ اگر مسلمان نمائندے سیاسی مطالبہ یعنی خودمختاری کے مطالبہ میں میرے ساتھ اور کانگریس کے ساتھ مل جائیں۔

یہ بات انھوں نے بالکل شخصی طور پر کہی تھی اس لئے کہ وہ اس وقت تو کانگریس کو اس کا پابند نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے وعدہ کیا کہ میں کانگریس کو اس کے تسلیم کرنے پر آمادہ کروں گا اور کوئی شخص جو کانگریس میں ان کی حیثیت کو جانتا ہو شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کانگریس سے اس بات کو منوانے میں ضرور کامیاب ہو جاتے لیکن ان کی بات کسی نے نہ مانی اور سچ بھی ہے آغا خان کو آزادی ہند کی حمایت میں کمربستہ تصور کرنا بھی ذرا مشکل ہے۔ غرض اس سے ظاہر ہو گیا کہ چاہے فرقہ وارانہ مسائل ہی کانفرنس پر چھائے ہوئے معلوم ہوں مگر اصل وقت فرقہ پروری نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی ترقی دشمنی راہ میں حائل تھی اور فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کرتی تھی۔ کانفرنس کے اراکین کو نہایت احتیاط سے نامزد کر کے برطانوی حکومت نے یہ سارے ترقی دشمن عناصر ایک جگہ جمع کر دئے تھے۔ اور ضابطہ کارروائی چونکہ خود ان کے ہاتھ میں تھا اس لئے اس فرقہ وارانہ مسئلہ کو کانفرنس کا اہم

مسئلہ بنا دیا تھا اور ایسا مسئلہ کہ جس پر وہ لوگ جو وہاں جمع تھے کبھی متفق ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

برطانوی حکومت کو اپنی اس کوشش میں کامیابی ہوئی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ اس کے پاس اپنی سلطنت کے قائم رکھنے کے لئے صرف قوت ہی نہیں ہے بلکہ کچھ عرصہ تک سامراجی روایات کے برقرار رکھنے کے لئے ابھی کافی چالاکی اور تدبیر بھی باقی ہے۔ ہندوستانی قوم ناکام ہوئی۔ ہر چند کہ گول میز کانفرنس نہ ان کی نمائندہ تھی نہ اس سے ان کی قوت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ مگر قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ اپنی کوشش کے مقصود کو متعین کرنے کے لئے جس ذہنی پس منظر کی ضرورت ہے وہ اس کے پاس نہ تھا اس لئے انھیں بہکا کر غلط راستہ پر ڈال دینا آسان تھا۔ قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ اس نے اپنے میں اتنی قوت نہیں پائی کہ جو اہل غرض اس کی ترقی میں حائل ہیں انہیں راہ سے ہٹا پھینکے۔ قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ اس میں غلط مذہبیت کی زیادتی ہے اور اس میں فرقہ وارانہ جذبات کو نہایت آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ قوم ناکام ہوئی اس لئے کہ وہ ابھی اتنی آگینہ بڑھی تھی اور ابھی اتنی مضبوط نہ تھی کہ کامیاب ہوتی۔

خود اس گول میز کانفرنس میں کامیابی اور ناکامی کا کوئی سوال نہ تھا اس سے ایسی زیادہ امید ہی کسے تھی۔ مگر پھر بھی اس سے ایک فرق ضرور پیدا ہوا اس سے پہلے جو کانفرنس ہوئی تھی۔ اپنی قسم کی پہلی کانفرنس، اس کی طرف نہ ہندوستان میں زیادہ توجہ کی گئی نہ اور کہیں۔ اس لئے کہ اس وقت سب کا دھیان سول نافرمانی کی تحریک میں لگا تھا۔ برطانوی حکومت کے نامزد کئے ہوئے لوگ جب ۱۹۳۱ء کی کانفرنس کو جا رہے تھے تو کالی جھنڈیوں کے جلوسوں اور مزمت کی آوازوں کے ساتھ انھیں رخصت کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۰ء میں بات ہی کچھ اور تھی اور یہ فرق اس لئے تھا کہ اس مرتبہ گاندھی جی کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے گئے تھے، ایک قائد کی حیثیت

سے جن کی پیروی لاکھوں آدمی کر رہے تھے۔ اسوجہ سے کانفرنس کا رتبہ بڑھا اور ہندوستان کے لوگوں کو اس کی کارروائی سے بہت زیادہ دلچسپی ہوگئی۔ اس کی ناکامی' چاہے اس کا سبب کچھ ہو ہندوستان کی مخالف پڑتی تھی۔ اس وقت سمجھ میں آیا کہ برطانوی حکومت کو گاندھی جی کی شرکت پر اتنا اصرار کیوں تھا۔

کانفرنس خود تو اپنے سارے سازباز ابن الوقتی اور بے سود بے راہ روی کے باوجود، ہندوستان کے لئے ناکامی نہ تھی۔ یہ تو بنائی ہی اس طرح گئی تھی کہ ناکام ہو اور اس کی ناکامی کی ذمہ داری ہندوستانی قوم پر نہیں ڈالی جاسکتی ہاں اسے یہ کامیابی ضرور ہوئی کہ اس نے ہندوستان کے اصل مسائل کی طرف سے دنیا کی توجہ ہٹادی' اور خود ہندوستان کے اندر اس سے مایوسی ہراس' اور ذلت کا احساس پیدا ہوا۔ اس سے ترقی دشمن قوتوں کو ایک سہارا ملا اور وہ اس قابل ہوئیں کہ پھر ذرا اٹھائیں۔

ہندوستان کے لوگوں کو کامیابی یا ناکامی تو ہندوستان کے واقعات سے حاصل ہوسکتی تھی۔ دور دراز لندن کے سازباز سے قومی تحریک کچھ کمھلا تو سکتی نہ تھی۔ ہندوستانی قومی تحریک یہاں کے متوسط طبقے اور یہاں کے کسانوں کی ایک حقیقی ار فوری ضرورت ہے اور یہ اس کے ذریعہ اپنے مسائل کا حل تلاش کر رہے ہیں، اس لئے یا تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ تحریک کامیاب ہوکر اپنا مقصد پورا کردے اور اس کی جگہ کوئی دوسری ایسی تحریک لے لے جو قوم کو ترقی اور آزادی کی شاہراہ پر اور آگے لے جاسکے یا پھر اسے کچھ دنوں کے لئے دبایا جاسکتا ہے۔ یہ کشمکش ہندوستان میں فوراً ہی شروع ہونے کو تھی اور اس کا نتیجہ عارضی طور پر ہماری شکست ہونے کو تھا مگر دوسری گول میز کانفرنس کا اس کشمکش کے نتیجہ پر چنداں اثر نہیں ہوسکتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس نے ہمارے ناموافق ایک فضا پیدا کردی۔

---

(۱) گلوربی بولٹن کی کتاب The Trgedy of Gandhi سے اقتباس۔ میں نے یہ اقتباس اس کتاب کی ایک تنقید سے لیا ہے۔ اصل کتاب پڑھنے کا مجھے موقع

نہیں ملا۔ مجھے امید ہے کہ اس اقتباس کو پیش کر کے مین مصنف کے ساتھ اور ان اصحاب کے ساتھ جن کا نام اس میں آیا ہے کوئی ان انصافی نہ کرتا ہوں گا یہ لکھ چکنے کے بعد میں نے اصل کتاب بھی پڑھ لی۔ بہت سی باتیں جو مسٹر بولٹن نے لکھی ہیں اور بہت سے نتیجے جو انہوں نے نکالے ہیں، میری رائے میں ناواجب ہیں بیان واقعات میں بھی بہت سی غلطیاں ہیں، خصوصاً اس سلسلہ میں کہ دلی کے معاہدہ کی بات چیت کے زمانہ میں اور اس کے بعد کانگریس کی مجلس عاملہ نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا ان کا ایک عجیب سا مفروضہ یہ بھی کہ مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کو ۱۹۳۱ء میں کانگریس کی صدارت اور یون اس کی قیادت جو ملی تو وہ گاندھی جی کے مدمقابل کی حیثیت سے: حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے پندرہ سال میں گاندھی جی حیثیت کانگریس میں اور ظاہر ہے کہ ملک میں بھی اس سے کہیں بلند رہی ہے جتنی کانگریس کے کسی صدر کی ہونی ممکن ہے وہ صدر گر رہے ہیں اور ان کا کہنا ہمیشہ مانا گیا ہے بارہا انہوں نے خود صدارت کرنے سے انکار کیا ہے اور اسے ترجیح دی ہے کہ ان کا کوئی دوسرا ساتھی یا چیلا صدر ہو جائے۔ میں جو کانگریس کا صدر ہوا تو تمام تر ان کی ہی وجہ سے۔ دراصل انتخاب گاندھی جی کا ہوا تھا۔ مگر انہوں نے اپنا نام واپس لے لیا اور میرے انتخاب کو مجبور کیا۔ ولبھ بھائی پٹیل کا انتخاب ذرا معمول تھا۔ اس لئے کہ ہم لوگ اس وقت قید سے چھوٹے تھے اور کانگریس کمیٹیاں اس وقت تک خلاف قانون جماعتیں تھیں اور معمول کے مطابق کام نہیں کر سکتی تھیں۔ اس وجہ سے مجلس عاملہ نے کراچی کانگریس کے صدر کا انتخاب اپنے ذمہ لے لیا۔ ساری مجلس نے جس میں ولبھ بھائی پٹیل بھی تھے۔ گاندھی جی سے التجا کی کہ وہ صدارت قبول فرمالیں۔ کہ واقعی طور پر وہ سردار تھے ہی اس مشکل کے سال میں نام کے لحاظ سے بھی کانگیرس کے سردار وہی ہوں۔ لیکن وہ نہ مانے اور اصرار سے کہا تھا کہ آپ خود ہمیشہ مسولینی کی طرح رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو عارضی طور پر بادشاہ اور دکھاوے کا سردار بناتے رہتے ہیں۔

یوں مسٹر بولٹن کی بہتری اور غلط فہمیوں سے اس حاشیہ میں بحث کرنی ممکن نہیں لیکن ایک ذرا شخصی معاملہ ہے اس کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ میرے والد صاحب کی سیاسی زندگی میں جو تغیر ہوا تھا اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایک یورپین کلب میں ان کا انتخاب نہ ہو سکا تھا۔ اور اس وجہ سے وہ سیاست ہی میں انتہا پسند نہیں ہو گئے تھے بلکہ انگریزوں کی صحبت سے بھی پرہیز کرنے لگے تھے۔ یہ قصہ بارہا بیان ہو چکا ہے مگر ہے سراسر غلط۔ اصلی واقعات کی چنداں اہمیت نہیں لیکن میں یہاں ان کا ذکر اس لئے کئے دیتا ہوں کی بات صاف ہو جائے۔ بیرسٹری کے ابتدائی زمانہ میں سر جان اج، جو اس وقت ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے

والد صاحب کو بہت چاہنے لگے تھے۔ ایک دفعہ سر جان نے والد سے کہا کہ الہ آباد (یورپین) کلب میں شریک ہو جاؤ میں خود تمہارا نام رکنیت کیلئے پیش کروں گا۔ والد صاحب نے ان کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن یہ بتلا دیا کہ اس میں لازمی طور پر بڑی دقت ہوگی بہت سے انگریز ان کے ہندوستانی ہونے کی وجہ سے اعتراض کریں گے اور ممکن ہے مخالف میں رائے دیں۔ فوج کا کوئی بھی چھوٹا موٹا افسر رائے دینے کے وقت ان کی مخالفت کر سکتا ہے۔ ان حالات میں بہتر یہی ہوگا کہ وہ اپنا نام انتخاب کے لئے پیش نہ کرائیں سر جان نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ والد کے نام کی تائید الہ آباد کے فوجی حلقہ کے بریگیڈیر جنرل سے کرائیں گے۔ مگر آخر کار میں یہ معاملہ چھوڑ دیا گیا اور نام اس لئے پیش نہیں ہو کہ والد نے صاف کہہ دیا کہ میں اس سلسلہ میں اپنی کوئی ہتک کرانے کو تیار نہیں ہوں۔ اس واقعہ سے ان کے دل میں انگریزوں کی طرف سے تلخی تو کیا پیدا ہوتی۔ ہوا یہ کہ سر جان سے ان کے تعلقات اور گہرے ہو گئے۔ اور اس کے بعد کے زمانہ ہی میں اکثر انگریزوں سیا ان کی دوستی ہوئی اور تعلقات بڑھے۔ یہ کوئی ۱۸۹۰ء کے قریب کی بات تھی اور وہ انتہا پسند سیاسی اور تارک موالات ہوئے کوئی چوتھائی صدی گزرنے کے بعد جا کر۔ یہ ضرور ہے کہ یہ تبدیلی یکا یک پیدا نہیں ہوئی تھی' البتہ پنجاب کے مارشل لا نے اس میں ذرا جلدی کرا دی اور ٹھیک وقت پر گاندھی جی کے اثر نے بھی فرق پیدا کیا۔ مگر پھر بھی ان کا یہ ارادہ کبھی نہ تھا کہ وہ انگریزوں سے ملنا چھوڑ دیں۔ البتہ جہاں انگریز زیادہ تر سرکاری عہدہ دار ہی ہوں وہاں ترک موالات اور سول نافرمانی سے لازمی طور پر ان تعلقات میں رکاوٹ پیدا ہوتی۔

صوبجات متحدہ کے کسانوں کی پریشانیاں

کانگریس کے جنرل سیکرٹری اور مجلس عاملہ کے رکن کی حیثیت سے مجھے عام ہندوستانی سیاست سے تعلق تھا۔ کبھی کبھی دورے بھی کرنے پڑتے تھے، مگر جہاں تک بن پڑتا میں ان سے بچتا تھا۔ ذمہ داریاں بڑھیں تو مجلس عاملہ کے جلسے بھی بڑے لمبے لمبے ہونے لگے اور آخر میں تو باضابطہ دو دو ہفتے کے اجلاس کی نوبت آ گئی۔ بات یہ تھی کہ اب محض تنقیدی قراردادیں منظور کرنے کا معاملہ تو تھا نہیں ایک وسیع اور متنوع نظام کے مختلف تعمیری کامون کو چلانا تھا اور روز ایسے مشکل مسائل سے سابقہ تھا جن پر یہ بات منحصر تھی کہ قومی پیمانہ پر کشمکش شروع ہو کہ نہ ہو۔

مگر میرا خاص کام صوبہ متحدہ میں تھا۔ یہاں کسانوں کی پریشانیوں نے کانگریس کی تمام تر توجہ جذب کر رکھا تھا۔ صوبہ کی کانگریس کمیٹی میں کوئی ۱۵۰ سے اوپر رکن تھے اور ہر دوسرے تیسرے مہینہ ان کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ اس کی مجلس انتظامیہ میں کوئی ۱۵ رکن تھے ان کے جلسے بھی جلد جلد ہوتے تھے اور کانگیرس کا دیہی شعبہ انہیں کے ہاتھ میں تھا۔

۱۹۳۱ء کے نصف آخر میں اس مجلس انتظامیہ اور دیہاتی کمیٹی سے برابر بہت سے زمیندار خاص طور پر وابستہ تھے چنانچہ جو کچھ کہا گیا ان کی منظوری سے کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس سال ہماری صوبہ کانگیرس کمیٹی کے صدر (اور اس عہدہ کی وجہ سے اس کی مجلس انتظامیہ اور دیہی کمیٹی کے صدر) مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی تھے، جو ایک مشہور زمینداری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے جنرل سکرٹری، سری پرکاش جی، اور مجلس انتظامیہ کے بہت سی ممتاز رکن خود زمیندار تھے یا زمینداری کاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ باقی ممبر متوسط طبقہ کے پیشہ ور لوگ تھے۔ صوبہ کی مجلس انتظامیہ میں ایک بھی اسامی یا غریب کسان نمائندہ نہ تھا۔ کسان ہماری ضلع کمیٹیوں میں ضرور ہوتے تھے، لیکن صوبہ کی مجلس انتظامیہ تک پہنچنے کے لئے جو کئی

انتخابات ہوتے ہیں یہ غریب ان سے نکل کر آگے نہیں بڑھ پاتے تھے۔ چنانچہ ہماری مجلس انتظامیہ میں تمام متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کا غلبہ تھا اور اس میں زمینداروں کی بھی خاصی آمیزش تھی۔ اس لئے کسی معنی میں بھی یہ انتہاپسند جماعت نہ تھی، اور کسانوں کے مسئلہ پر تو ہرگز نہیں۔

صوبہ میں میری حیثیت بس مجلس انتظامیہ اور دیہی کمیٹی کے رکن کی تھی، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ باہمی مشوروں اور مجلس کے دوسرے کامون میں خوب حصہ لیتا تھا۔ مگر میرے کام کو رہنمائی کا کام کسی طرح نہیں کہہ سکتے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے صوبہ میں تو کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رہنمائی کی اس لئے کہ ہم لوگوں نے عرصہ سے اپنے کو مل جل کر کام کرنے کا خوگر بنالیا تھا اور ہمارے یہاں زور ہمیشہ نظام پر دیا جاتا ہے فرد پر نہیں۔ سال بھر کے لئے جو صدر ہوتا وہ عارضی طور پر ہمارا سردار ہوتا اور ہماری نمائندگی کرتا تھا مگر خود اس کو بھی کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا۔

میں مقامی طور پر الہ آباد ضلع کی کانگریس کمیٹی کا رکن بھی تھا۔ دیہی مسئلہ کے نشو ونما میں اس کمیٹی نے اپنے صدر پرشوتم داس ٹنڈن کی قیادت میں بڑا اہم حصہ لیا تھا ۱۹۳۰ء میں اسی نے ٹیکس نہ دینے کی تحریک شروع کی تھی۔ وجہ یہ نہ تھی کہ الہ آباد میں ضلع میں زرعی کساد بازاری کا اثر کچھ اور جگہ سے زادہ تھا یوں تو اودھ کے تعلقداری اضلاع کی حالت کہیں ابتر تھی۔ بات اصل یہ تھی کہ الہ آباد کا ضلع زیادہ منظم تھا اور یہاں سیاسی احساس زیادہ تھا اس لئے کہ الہ آباد شہر سیاسی کامون کا مرکز تھا اور ممتاز کام کرنے والے اکثر آس پاس کے گاؤں میں جاتے رہتے تھے۔

مارچ ۱۹۳۱ء میں، دہلی کے سمجھوتہ کے فوراً ہی بعد ہم انے دیہات میں چھپے ہوئے اعلان بھیجے اور اپنے کام کرنے والے بھی کہ کسانوں کو بتا دیان کہ سول نافرمانی اور سیاسی تحریک روک دی گئی ہے لہٰذا سیاسی وجہ سے لگان ادا کرنے میں اب

کوئی چیز مانع نہیں ہے' اور انہیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ لگان ادا کر دیں ہاں یہ ضرور ساتھ کہہ دیا تھا کہ چونکہ قیمتوں میں بے حساب کمی ہوگئی ہے اس لئے ہمارا خیال ہے کہ انہیں بہت کچھ چھوٹ ملنی چاہیے اور یہ تجویز کی تھی کہ ہم سب مل کر اس چھوٹ کے حاصل کرنے کی کوشش کریں عام حالات میں بی لگان کا بوجھ اکثر نا قابل برداشت ہوتا تھا لیکن اب تو قیمتوں کے یوں گرنے سے بالکل ناممکنا ہو گیا تھا کہ پورا لگان یا اس کے کچھ بھی لگ بھگ ادا کیا جا سکے ہم نے کسانوں کے نمائندوں سے ملکر مشورے کئے اور آزمائشی طور پر یہ تجویز کی کہ پچاس فیصدی اور بعض صورتوں میں اس سے بھی زیادہ کی چھوٹ لگان میں دیجائے۔

ہماری کوشش تھی کہ کسانوں کے مسئلہ کو عام سول نافرمانی کے مسئلہ سے بالکل الگ کر دیں۔ کم سے کم ۱۹۳۱ء میں ہماری خواہش یہ تھی کہ اس مسئلہ کو سیاست سے جدا کر کے خالص معاشی نقطہ نظر سے دیکھا جائے یہ بات تھی مشکل' اس لئے کہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور پہلے بھی یہ دونون پہلو باہم وابستہ رہ چکے تھے۔ ہم لوگ خود بہ حیثیت کانگریس کے بالکل سیاسی جماعت تھے۔ وقتی طور پر ہم ضرور یہ کوشش کر رہے تھے کہ کسانوں کی یونین کا کام کریں (جس پر قابو غیر کسانوں بلکہ زمینداروں تک کا تھا!) مگر ہم نہ اپنے سیاسی رنگ کو چھوڑ سکتے تھے نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ ادھر حکومت تھی کہ ہمارے نہ اپنے سیاسی رنگ کو چھوڑ سکتے تھے نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ ادھر حکومت تھی کہ ہمارے نہ اپنے سیاسی کام گردانتی تھی۔ آنے والی سول نافرمانی کا سایہ آگے آگے چلتا دکھائی دیتا تھا' اور اگر نوبت آتی تو اس میں کیا شک تھا کہ سیاست اور معیشت دست درست آگے بڑھیں۔

ان تمام کھلے ہوئے موانع کے باوجود دہلی کے سمجھوتہ کے بعد سے برابر ہماری یہ کوشش رہی کہ ہم کسانوں کے مسئلہ کو طے نہیں کیا تھا' اور ہم اس بات کو حکومت اور قوم دونوں پر پوری طرح واضح کر دینا چاہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دہلی کی بات

چیت کے بھی کانفرنس کے دوران میں ول نافرمانی شروع نہ کروں گا۔ اور کانگریس سے درخواست کروں گا کہ کانفرنس کو پورا پورا موقع دے اور اس کے نتیجہ کا انتظار کرے۔ لیکن اس وقت بھی گاندھی جی نے یہ بات صاف کردی تھی کہ اس وعدہ کا اطلاق کسی ایسی مقامی کشمکش پر نہ ہوگا جس پر کہ ہم بعد کو مجبور ہوں۔ صوبجات متحدہ کے کسانوں کا مسئلہ تو اس وقت ہم سب کے سامنے ہی تھا، اس لئے کہ یہاں منظم کارروائی ہوچکی تھی۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ سارے ہندوستان میں کسانوں کی حالت یہی تھی۔ شملہ کی گفتگو میں گاندھی جی نے اس بات کو پھر دہرایا تھا اور اس کا ذکر شائع شدہ خط وکتابت میں بھی آچکا ہے۔(۱) عین اس وقت کہ وہ یورپ جارہے تھے۔ گاندھی جی نے یہ بات گول میز کانفرنسے اور سیاسی مسائل سے قطع نظر، کانفرنس کو اس بات کی ضرورت ہوسکتی ہے کہ معاشی کشاکش میں وہ قوم کے اور خصوصاً کسانوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ انھیں اس کشاکش میں پڑنے کی خواہش نہ تھی، بلکہ وہ تو اس سے بچنا چاہتے تھے لیکن اگر یہ ناگزیر ہوجائے تو پھر تو کرنا ہی چاہئے کہ ہم قوم کے عوام کو نہیں چھوڑ سکتے ان کا کہنا تھا کہ دہلی کا سمجھوتہ جو عام اور سول نافرمانی سے متعلق ہے ہمیں اس سے نہیں روک سکتا۔

میں اس بات کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی اور اس کے رہنماؤں کے خلاف برابر الزام لگا گیا کہ ٹیکس روکنے کی مہم شروع کرکے انھوں نے دہلی کے سمجھوتہ کو توڑ دیا۔ الزام لگانے والوں کو الزام لگانے میں یہ سہولت تھی کہ جس کے خلاف الزام تھا اور جو اس کا جواب دے سکتے تھے وہ سب قید خانوں میں بند پڑے تھے اور ہر اخبار اور ہر مطبع پر سخت سرکاری نگرانی تھی۔ اس واقعہ سے بالکل قطع نظر کہ ۱۹۳۱ء میں صوبہ متحدہ کی کانگریس نے ٹیکس نہ دینے کی کوئی مہم سرے سے شروع ہی نہیں کی، میں جس بات کو صاف کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر معاشی غرض کے لئے سول نافرمانی سے الگ ایسی کوئی تحریک شروع بھی کی جاتی تو اس سے دہلی

کے سمجھوتہ کی خلاف ورزی نہ ہوتی۔ خود حالات کی بنا پر ایسا کرنا حق بجانب ہوتا یا نہ ہوتا، یہ دوسری بات ہے۔ مگر کسانوں کو اس تحریک کے شروع کرنے کا ایسا ہی حق تھا جیسا کہ اپنی معاشی شکایات رفع کرنے کے لئے کسی کارخانہ کے مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا ہوتا ہے دہلی سے لے کر شملہ تک ہمارا کہنا یہی تھا اور حکومت اسے سمجھتی ہی نہ تھی ٹھیک بھی مانتی تھی۔

۱۹۲۹ء میں اور اس کے بعد زرعی قیمتوں میں جو سخت اتار ہوا وہ دراصل بگڑتے ہوئے حالات کی آخری منزل تھی۔ پہلے کئی سال تک تو زرعی پیداوار کی قیمت بڑھی اور ہندوستانی زراعت چونکہ دنیا کی منڈی سے وابستہ ہے اس لئے اس چڑھاؤ میں شریک رہی۔ ساری دنیا میں صنعت اور زراعت کے درمیان نشوونما کا جو تفاوت تھا اس نے ہر جگہ زرعی پیداوار کی قیمتوں کو چڑھا دیا تھا۔ ہندوستان میں بھی جب قیمتیں چڑھیں تو سرکاری مال گزاری اور زمینداری لگان بھی بڑھا اور اصل بونے اور جوتنے والوں کو قیمتوں کے اس بڑھنے سے بہ مشکل ہی کوئی فائدہ پہنچا بلکہ بعض خوش قسمت علاقوں کو چھوڑ کر عام طور سے تو کسانوں کی حالت کچھ ابتر ہوئی۔ صوبجات متحدہ میں لگان مالگزاری سے کہیں زیادہ تیزی سے بڑھا۔ ان دونوں میں اضافہ کی امتیازی نسبت اس صدی کے پہلے ۳۰ برس میں (میں حافظہ سے لکھتا ہوں) پانچ اور ایک کی نسبت ہے۔ یوں اگر زمین سے حکومت کی آمدنی میں معقول اضافہ ہوا تو زمیندار کی آمدنی میں اس سے بہت زیادہ ہوا، اور بے چارہ کسان ہمیشہ کی طرح، اسی مربھکوں والی سطح پر رہا۔ کہیں قیمتیں کم بھی ہوئیں یا مقامی قدرتی مصیبتوں کا سامنا رہا جیسے خشک سالی، طغیانی، ٹیڑھی، اولے وغیرہ، تو بھی لگان اور مالگزاری وہی رہی، کہیں کچھ چھوٹ دی بھی گئی تو بہت رک رک کر اسی ایک فصل کے لئے۔ یوں تو اچھے سے اچھے زمانہ میں بھی لگان ضرورت سے زیادہ تھا۔ پھر وقت جو ذرا بگڑا تو مہاجن کی مدد کے بغیر یہ مطالبہ ناقابل برداشت ہو گیا اور دیہاتی قرض خوب

بڑھا۔

سارے زرعی طبقے، زمیندار، مالک آراضی کسان' اور اسامی سب کے سب مہاجن کا شکار بنے' اس لئے کہ مہاجن ان حالات میں گاؤں کی ابتدائی معیشت میں ایک لازمی فرض انجام دے رہا تھا۔ چنانچہ اس فرض کی انجام دہی میں اس نے خوب خوب بیجا فائدے اٹھائے اور زمین سے تعلق رکھنے والوں پر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہوگئی۔ روک ٹوک اس پر کچھ تھی نہیں' قانون تھا سو اس کا مددگار یہ بس اپنے معاہدہ کے لفظوں پر اڑتا (اور شائلاک یہودی کی طرح) بس اپنے پونڈ بھر گوشت کا مطالبہ کرتا اور پات اتھا! رفتہ رفتہ زمین بھی اس کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور کسان مالکان آراضی کی زمین کی حیثیت سے نمودار ہوئے! کسان مالک آراضی جواب تک خود اپنی زمین جوتتا بوتا تھا۔ اب اس بنئے زمیندار یا ساہوکار کا غلام بن گیا۔ اسامیوں کا حال کچھ اس سے بھی برا تھا یہ بھی یا تو ساہوکار کے غلام تھے یا بے زمین پرولی تاریات کی بڑھتی ہوئی فوج میں شامل تھے۔ اس مہاجن یا ساہوکار کو جواب زمیندار بن بیٹھا تھا' زمین سے یا اسامیوں سے کوئی زندہ تعلق نہ تھا یہ عموماً شہر کا رہنے والا ہوتا تھا' وہیں اپنا لین دین کا کاروبار کرتا' لگان جمع کرنے کا کام اپنے کارندوں پر چھوڑ دیتا اور یہ کام کو مشینوں کی سی بے دردی اور بے رحمی سے انجام دیتے۔

دیہی قرض کا اس کا بڑھنا خود اپنی جگہ پر نظام زرعی کے غلط اور ناپائدار ہونے کا ثبوت ہے۔ آبادی کی بڑی اکثریت کے پاس کسی قسم کا پس انداز نہیں نہ جسمانی نہ مادی نہ اس میں مقابلہ کی طاقت' بس فاقہ اور بھوک کے کنارے زندگی ہے۔ ناموافق قسم کا کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا تو یہ اس کی تاب کیسے لائیں کوئی وبا آجائے تو لاکھوں کو ختم کر جائے۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء میں خود سرکار کی مقرر کی ہوئی صوبجاتی ساہوکارہ کی تحقیقاتی کمیٹی نے تخمینہ کیا تاھ کہ ہندوستان بھر کا (جس میں برما بھی

شامل ہے) دیہی قرضہ ۸۶۰ کروڑ روپیہ ہے۔ اس میں زمینداروں، کسان مالکان آراضی، اور اسامیوں سب کے قرضے شامل ہیں مگر زیادہ تر قرض انہی پر ہے جو جوتتے بوتے ہیں۔ ذرائع سے متعلق حکومت کی جو سیاست ہے وہ تمام تر قرض خواہوں کے موافق ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرض کا بوجھ اور بڑھ گیا ہے مثلاً سخت ہندوستانی مخالفت کے باوجود روپیہ کی قیمت ۱۶ فی پنس کی جگہ ۱۸ پنس مقرر کرنے کے معنی کیا تھے؟ یہی نا کہ ایک اشارہ میں دیہی قرض میں ۱۲.۵ فی صد یا تقریباً ۱۰۷ کروڑ کا اضافہ ہوگیا۔(۲)

جنگ کے بعد پہلے تو قیمتیں بڑھی تھیں مگر پھر رفتہ رفتہ برابر گرتی گئیں اور دیہات کا حال بگڑتا گیا۔ مصیبت پر مصیبت ۱۹۲۹ء اور اس کے بعد کے حالات سے آئی۔

۱۹۳۱ء میں صوبجات متحدہ کی بابت ہمارا کہنا یہ تھا کہ لگان قیمتوں کے مطابق ہونا چاہیے یعنی لگان کو گھٹا کر اتنا کر دینا چاہیے جتنا اس زمانہ میں تھا۔ جب قیمتیں ۱۹۳۱ء کی سی کم تھیں۔ اور یہ صورت کوئی ۳۰ سال پہلے ۱۹۰۱ء میں تھی۔ یہ ایک موٹا سا معیار تھا اور اس سے جانچنا اس لئے بھی مشکل تھا کہ اسامیوں کی بہت سی قسمیں تھیں، موروثی غیر موروثی شکمی وغیرہ اور سب سے زیادہ مصیبت میں وہ تھے جو سب سے نیچے درجہ میں تھے۔ اس کے علاوہ بس ایک معیار اور تھا اور بلاشبہ وہی سب سے زیادہ منصفانہ معیار یونی یہ کہ کسان کے مصارف پیدائش اور اس کی اجرت کو منہا کر دینے کے بعد اس کی لگان ادا کرنے کی صلاحیت کو دیکھا جائے۔ لیکن اس دوسرے معیار سے تو ہندوستان کا بہت کچھ زرعی کاروبار بالکل غیر معاشی ہو جاتا ہے، چاہے آپ کسان کی زندگی گزارنے کے مصارف کو کتنا ہی کم کیوں نہ مانئے۔ اور جیسا کہ ہم نے ۱۹۳۰ء میں صوبجات متحدہ کی چند مثالون سے ظاہر کیا تھا، بہت سے کسان لگان ادا کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ اپنی املاک نہ بیچیں (اگر کچھ بیچنے کو ہو)

یا بہت زیادہ شرح سود پر روپیہ ادھار نہ لیں۔

ہمارے صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے پہلی اور گویا آزمائشی تجویز جو کی وہ یہ کہ موروثی اسامیون کو عام طور پر ۵۰ فیصدی کی چھوٹ ملے اور دوسرے اسامیون کے لئے جن کا حال ان سے بھی گیا گزرا تھا اس سے بھی زیادہ۔ جب گاندھی جی مئی ۱۹۳۱ء میں صوبجات متحدہ میں آئے اور گورنر' سر میلکم ہیلی سے ملے تو اس وقت اس وقت ان میں کچھ اختلاف رائے تھا۔ اور وہ دونوں کسی ایک بات پر متفق نہ ہو پائے تھے اس کے جلد ہی بعد گاندھی جی نے صوبہ کے زمینداروں اور اسامیوں کے نام اپیلیں شائع کیں۔ اسامیوں والی اپیل میں انہوں نے کہا تاھ کہ جس قدر ادا کر سکتے ہو ادا کر دو کچھ حساب بھی بتایا تھا جو اس عدد سے جو ہم پہلے پیش کر چکے تھے۔ کچھ زیادہ ہوتا تھا۔ ہماری صوبہ کی کمیٹی نے گاندھی جی والے حساب کو منظور کر لیا۔ مگر اس سے بھی کچھ زیادہ کام نہ چلا' اس لئے کہ حکومت نے تو اسے بھی نہ مانا۔

اس میں شک نہیں کہ صوبہ کی حکومت بڑی مشکل میں تھی۔ مال گزاری اس کی آمدنی کا خاص جزو تھا' اسے غائب ہو جانے دے یا بہت گھٹا دے تو دیوانے کا سامنا دوسری طرف اسے دیہی بے چینی کا ڈر بھی تھا اور جہان تک ہو سکتا تھا لگان میں چھوٹ دے کر یہ کسانون کو مطمئن بھی کرنا چاہتی تھی۔ دونوں باتوں کا ایک ساتھ کرنا سہل نہ تھا۔ حکومت اور کسان کے بیچ میں تھا زمیندار معاشی لحاظ سے بالکل بے سود اور غیر ضروری اضافہ۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس سے کچھ لیکر حکومت اور کسان دونوں کا کام چل جائے۔ لیکن برطانوی حکومت' جیسی کچھ کہ ہے اس کے ساتھ ہیں ہی کتنے طبقے' وہ اپنے سیاسی مفاد کی خاطر' ان کو کہ ابھی اس سے لپٹے ہوئے ہیں کس طرح دھتکار سکتی تھی۔

آخر کار صوبہ کی حکومت نے زمینداروں اور اسامیوں دونوں کے لئے چھوٹ کا اعلان کیا اس چھوٹ کا حساب ایک پیچیدہ سے قاعدہ پر مبنی تھا' اور پہلے پہل تو یہ

سمجھنا بھی دشوار تھا کہ کتنی چھوٹ ملی۔ یہ بات البتہ صاف تھی کہ جتنی چوٹ ملنی چہائے تھی اس سے بہت کم تھی۔ اسکے علاوہ اس چھوٹ کا تعلق بس اس وقت کے مطالبہ سے تھا' اور کسان پر جو بقایا تھا جو قرض تھا اس کا ذکر ہی نہ تھا۔ بات بالکل صاف تھی کہ اگر اسامی اس ایک شمشماہی کا لگان ادا نہیں کر سکتا تو پچھلے برسوں کا بقایا اور قرضہ تو اور بھی نہ دے پائے گا۔ اور زمینداروں کا طریقہ یہی تھا کہ جو کچھ وصول ہوتا اسے پچھلے بقایا کی وصولی میں ڈال دیتے تھے۔ اسامی کے نقطہ نظر سے اس میں بڑا خطرہ تھا۔ اس لئے کہ اس غریب پر ہر وقت مقدمہ چل سکتا تھا اور واجب الادا رقم کا کوئی حصہ بھی اگر ادا ہونے سے رہ گیا ہے تو اسے بے دخل کرایا جا سکتا تھا۔

صوبہ کانگریس مجلس انتظامیہ سخت مشکل میں پڑ گئی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اسامیوں سے جو سلوک ہو رہا ہے ناروا ہے لیکن ہم بے بس تھے اور اپنے اوپر یہ ذمہ داری نہ لینا چاہتے تھے کہ کسانوں سے کہہ دیں کہ جاؤ کچھ ادا نہ کرو۔ ہم تو بس یہی کہتے رہے کہ جس قدر بھی ادا کر سکتے ہو کر دو' ہاں ان کی مصیبت میں عام طور سے ہمدردی کرتے اور ان کی ڈھارس ضرور بندھاتے رہے۔ ہم ان کے اس خیال سے بالکل متفق تھے کہ چھوٹ کے بعد بھی مطالبہ زیادہ ہے۔

اب وہ وقت آیا کہ جبر کی مشین نے' قانونی اور غیر قانونی شکل میں؛ اپنا کام شروع کای ہزاروں کے خلاف بے دخلی کے مقدمات دائر ہوئے' گائے بیل شخصی پونجی سب کی قرقی ہونے لگی' زمیندار کے آدمیوں نے ٹھکائی شروع کی۔ بہتیرے اسامیوں نے مطالبہ کا ایک حصہ ادا بھی کر دیا اور ان کا کہنا یہ تھا کہ جتنا دے سکتے تھے سب دے دیا۔ بہت ممکن ہے کہ بعض لوگ اس سے زیادہ بھی ادا کر سکتے ہوں مگر یہ بات بالکل صاف تھی کہ بڑی اکثریت کے لئے بہت زیادہ تھا۔ اور یوں تھوڑا تھوڑا لگان ادا کر کے بھی انہیں نجات نہ ملی۔ قانون کا بھاری بھرکم رولر تھا کہ بڑھا جاتا تھا اور جو راہ میں آتا اسے بے رحمی سے کچلتا چلتا تھا۔ بے دخلی کے مقدمہ ڈگری ہو رہے

تھے۔ چاہے لگان کا ایک حصہ لیا بھی جا چکا ہو۔ شخصی املاک اور مویشی کی قرقیاں اور نیلام جاری تھے۔ اسامی اگر کچھ ادا نہ کرتے تو بھی اس سے برے حال میں تو نہ ہوتے کچھ اچھے ہی رہتے' اس لئے کہ کم سے کم وہ روپیہ تو پاس بچ رہتا جو لگان میں ادا کر دیا۔

ہمارے پاس کسان جوق جوق آتے تھے' سخت شاکی کہ آپ کا کہا مانا جو دے سکتے تھے دے دیا' نتیجہ یہ ہوا۔ اکیلے الہ آباد کے ضلع میں ہزاروں کسان بے دخل کئے گئے تھے اور ان کے علاوہ اور ہزاروں پر کسی نہ کسی قسم کی قانونی کارروائی کی گئی تھی۔ ضلع کی کانگریس کمیٹی کا دفتر دن بھر ایک پریشان حال انبوہ سے گھرا رہتا تھا۔ کودمیرا گھر بھی گھرا رہتا اور اکثر یہ جی چاہتا تھا کہ بھاگ جاؤں اور جہاں بن پڑے اپنے کو چھپالوں اور اس دردانگیز صورت حال سے بچ نکلوں۔ جو کسان ہمارے پاس آتے ان میں سے بہتوں کے جسم پر چوٹوں کے نشان ہوتے تھے' وہ ہمیں بتاتے تھے کہ زمیندار کے آدمیوں نے مارا ہے۔ ہم ہسپتال میں ان کا علاج کراتے تھے۔ یہ غریب کیا کر سکتے تھے؟ ہم ہی کیا کر سکتے تھے؟ ہم صوبہ کی حکومت کو لمبے لمبے خط لکھتے تھے۔ ہماری کمیٹی نے گووند بلبھ کو نینی تال اور لکھنو میں صوبہ کی حکومت سے تعلق قائم رکھنے کے لئے درمیانی افسر مقرر کر رکھا تھا۔ یہ بھی برابر حکومت کو لکھتے رہے تھے۔ ہمارے صوبہ کے صدر تصدق احمد خاں شیروانی بھی وقتاً فوقتاً لکھتے تھے اور میں بھی۔

جون جولائی میں بارش شروع ہوئی تو ایک اور دشواری پیدا ہوئی یہ جوتنے بونے کا زمانہ ہوتا ہے۔ جو کسان بے دخل کر دیئے گئے تھے وہ کیا کرتے؟ کیا بیٹھے منہ تکا کرتے اور اپنے کھیتوں کو بنجر پڑا رہنے دیتے؟ کسان کے لئے تو یہ بڑی مشکل بات تھی' اسے الٹی چھری سے کاٹنا تھا۔ اکثر صورتوں میں بے دخلی بس قانون اور ضابطہ کی بات تھی یہ کچھ زمین سے واقع طور پر تو ہٹ نہیں گئے تھے' بس عدالت کی

ڈگری ہوگئی تھی اس کے بعد اور اکچھ نہ ہوا تھا کیا یہ لوگ اپنی زمین جوت لیتے؟ اس میں مداخلت بیجا کا جرم سرزد ہو جاتا اور چھوٹ موٹے بلوہ کا ڈر تھا۔ مگر بیٹھے بیٹھے یہ دیکھنا بھی تو دشوار تھا کہ دوسرے اس کی پرانی زمین کو جوتیں۔ کسان بھلا اسے کیسے برداشت کرے؟ بیچارے ہمارے پاس مشورہ کو دوڑے آتے تھے ہم کیا مشورہ دیتے؟

گرمی میں جب میں گاندھی جی کے ساتھ شملہ گیا تو حکومت ہند کے ایک اعلیٰ عہدہ دار سے مین نے یہ دشواری بیان کی اور ان سے پوچھا کہ آپ ہماری جگہ ہوتے تو ان کسانوں کو کای مشورہ دیتے؟ ان کے جواب سے معاملہ پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی کسان جسے بے دخل کر دیا گیا ہے مجھ سے یہ سوال کرے تو میں جواب دینے سے احتراز کروں گا۔ یعنی یہ اعلیٰ عہدہ دار صاحب تک اس کے لئے تار نہ تھے کہ کسان سے بس یہ کہہ دین کہ کھیت نہ ہو تو' ہر چند کہ قانوناً کسان کھیت سے بے دخل کی جا چکا ہے وہ چملہ کی بلندیوں پر تھے ان کے لئے آسان تھا کہ مسلوں پر اس طرح احکام جاری کیا کریں گویا ریاضی کے کسی مجرد مسئلہ کے متعلق کچھ تحریر فرما رہے ہیں' مسئلہ کے انسانی پہلو سے نہ انہیں واسطہ تھا نہ نینی تال کے اعلیٰ حکام کو نہ ان کی آنکھوں کے سامنے انسانی تکلیف وفلاکت کی وہ تصویر آتی تھی جو اس معاملہ کے ساتھ وابستہ تھی۔

شملہ میں ہم سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ تم کسانون کو بس ایک مشورہ دو' یعنی یہ کہ کل مطالبہ ادا کر دو یا جتنا بھی ادکرنا ممکن ہو۔ گویا ہمیں زمینداروں کے کارندوں کا کام کرنا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے جب ان سے کہا تھا کہ جتنا دے سکتے ہو دے دو تو ہم اس فرمائش کی تعمیل پہلے ہی کر چکے تھے ہاں' ہم نے ساتھ میں اتنا اور ضرور کہا تھا کہ اپنے مویشی نہ بیچنا اور قرض نہ لینا۔ اس کا نتیجہ جو ہوا تھا ہم دیکھ چکے تھے۔

ہم سب کے لئے یہ گرمی کا موسم بڑھا ہی سخت تھا۔ اور سر پر وہ بوجھ تھا کہ الا

ماں۔

ہندوستانی کسان میں مصیبت جھیلنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے' اور اس کے حصہ میں مصیبت آتی بھی بہت رہتی ہے قحط' طغیانی بیماری اور مسلسل افلاس اور فلاکت۔ اور جب یہ انہیں انہیں جھیل پاتا تو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چپ چپاتے حرف شکایت زبان پر لائے بغیر پڑ رہتا ہے اور مر جاتا ہے۔اس کا مصیبت سے بچنے کا طریقہ بس یہ ہے۔ ان وقتی مصیبتوں کے مقابلہ میں تو ۱۹۳۱ء کے یہ واقعات قدرت کے بن بوجھے ارادوں کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتے تھے کہ اس وجہ سے انہیں صبر کے ساتھ جھیل لیتا۔ وہ سوچتا تھا کہ یہ تو سب آدمیوں کی کارستانی ہے اور اس وجہ سے ان پر بگڑتا تھا۔ اس کی نئی سیاسی تعلیم کا پودا پھل لا رہا تھا۔ ۱۹۳۱ء کے یہ ذمہ دار اجانتے تھے۔ کای یہ بات نہ تھی کہ کسانون نے اکثر ہماری نصیحت مانی تھی؟ لیکن پھر بھی مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ہم برابر مدد نہ کرتے تو کانون کی حالت اور بھی ابتر ہوتی۔

ہم ان کا جتھا بنائے رہے اور اس لئے وہ ایک قوت بنے رہے جس کا نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ اور اس وجہ سے انہیں اس سے زیادہ چھوٹ مل گئی تھی جتنی کہ دوسرے حالات میں ملتی۔وہ جبر اور بدسلوگی جوان غریبوں کے حصہ میں آتی ہر چند کہ بہت بری تھی' پر ان ناشاد لوگوں کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔فرق تھا تو کچھ تو درجہ کا کہ اس زمانہ میں بہت زیادہ سختی ہوئی اور کچھ اس بدلوکی کی تشہر کا۔ معمول تو یہ ہے کہ اگر زمیندار کے آدمی نے کسان سے بدسلوکی کی یا اسے ایزا بھی پہنچائی تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا تو ہوتا ہی ہے اور اگر اس مارتوڑ میں وہ بیچارہ مر ہی نہ جائے تو اس علاقہ کے بارہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔ لیکن اب ہمارے نظام کی وجہ سے معاملہ اور ہو گیا تھا' کسانوں میں ایک نیا احساس تھا' جس کی وجہ سے یہ متحد بھی تھے اور ہر واردات کی خبر کانگریس کے دفتر کو دیتے رہتے تھے۔

گرمیوں کا موسم ذرا اور گذرا تو جبریہ تحصیل وصول میں کمی ہوئی اور ظالمانہ کارروائیاں بھی کچھ گھٹیں۔ اب جو سوال ہمیں پریشان کر رہا تھا وہ یہ کہ جو کسان بے دخل ہوئے ہیں ان کا کیا ہو؟ ان کے لئے کیا کیا جائے؟ ہم حکومت پر زور ڈال رہے تھے کہ ان کے کھیت انہیں واپس مل جائیں کہ یہ کھیت اکثر یوں ہی خالی پڑے تھے۔ اس سے بھی زیادہ اہم سوال مستقبل کا تھا۔ اکتوبر سے اگلی تحصیل وصول کا زمانہ شروع ہونے کو تھا اس وقت کا ہی ہوگا؟ اس پر غور کرنے کے لئے صوبہ کی حکومت نے ایک چوٹی سی کمیٹی مقرر کی جس میں کچھ تو خود اس کے عہدہ دار تھے اور کچھ سرکاری کونسل کے زمیندار ممبر۔ اس کمیٹی میں کسانوں کا کوئی نمائندہ نہ تھا۔ بالکل آخر وقت میں جب کہ کمیٹی اپنا کام بھی شروع کر چکی تھی حکومت نے گووند بلبھ پنتھ سے کہا کہ ہماری طرف سے کمیٹی میں شریک ہو جائیں۔ اتنی دیر کے بعد جبکہ اہم معاملات پر فیصلے بھی ہو چکے تھے انہوں نے شرکت کو بے سود سمجھا۔

صوبجات متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے بھی ایک چھوٹی سی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی کہ اس وقت کے اور پچھلے زمانہ کے دیہاتی امور پر معلومات جمع کرے اور موجود صورت حال پر رپورٹ دے۔ اس کمیٹی نے ایک لمبی رپورٹ پیش کی جس میں صوبہ کی زرعی حالت پر نہایت اچھا تبصرہ ہے اور قیمتوں کے گرنے سے جو مصیبت نازل ہوئی تھی اسے نہایت خوبی سے کھول کر بتایا ہے ان کی سفارشیں بھی بڑی دوررس تھیں۔ اس رپورٹ پر جو کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے، گووند بلبھ پنتھ، رفیع احمد قدوائی اور یکشن ٹرائن تواری کے دستخط ہیں۔

اس رپورٹ کے نکلنے سے بہت پہلے گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جا چکے تھے۔ وہ بہت ہی پس و پیش کے بعد گئے تھے اور اس پس و پیش کی ایک وجہ صوبجات متحدہ کے دیہاتی حالات بھی تھے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر گول میز کانفرنس کے لئے ولایت جانا نہ ہوتا تو وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ صوبجات متحدہ

میں جاؤں گا اور پیچیدہ مسئلہ کو سلجھانے میں لگ جاؤں گا۔ شملہ میں حکومت سے جو آخری گفتگو ہوئی ان میں منجملہ اور امور کے صوبجات متحدہ کا معاملہ بھی بحث میں آیا تھا۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد ہم لوگ انھیں سب باتوں سے برابر مطلع کرتے رہے۔ پہلے مہینہ دو مہینہ تک تو میں انھیں ہر ہفتہ خط لکھتا تھا، ہوائی ڈاک سے بھی اور معمولی ڈاک سے بھی۔ ان کے قیام لندن کے آخری زمانہ میں میں اتنا پابند نہ رہا تھا، اس لئے کہ اس کے جلد لوٹنے کی امید تھی۔ انھوں نے ہمیں توقع دلائی تھی کہ اگر بہت دیر بھی ہوئی تو بھی وہ تین مہینہ کے اندر اندر لوٹ آئیں گے یعنی نومبر کی کسی تاریخ کو اور ہمیں امید تھی کہ اس وقت تک ہندوستان میں کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا نہ ہوگی۔ ان کی غیر موجودگی میں ہم حکومت سے خاص طور پر کوئی لڑائی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن جب ان کی واپسی میں دیر ہوئی اور دیہات کے معاملات نے تیزی سے بڑھنا شروع کیا، تو ہم نے انھیں ایک لمبا تار بھیجا جس میں سب باتوں سے انھیں باخبر کر دیا اور یہ بتا دیا کہ ہمیں کس کس طرح مجبور کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے تار ہی سے جواب دیا کہ میں اس معاملہ بے بس ہوں اور یہاں سے تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا تم اپنی سمجھ سے کام لے کر آگے بڑھو۔

صوبہ کی مجلس انتظامیہ بڑی مجلس عاملہ کو بھی برابر اطلاع دیتی رہی۔ میں خود اس مجلس میں سب باتیں بتانے کے لئے موجود تھا۔ لیکن معاملہ چونکہ ذرا بڑھتا جاتا تھا اس لئے مجلس عاملہ نے ہمارے صوبہ کے صدر تصدق احمد خان شیروانی اور الہ آباد ضلع کے صدر پرشوتم داس ٹنڈن سے بھی مشورہ کیا۔

اسی اثناء میں حکومت کی دیہاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع کی۔ اس میں کمیٹی نے بہت سی سفارشیں کیں، جو پیچیدہ بھی تھیں اور مہم بھی، اور جن سے معاملہ بہت کچھ مقامی حکام میں رہتا تھا۔ مجموعی طور پر جو چھوٹ تجویز کی گئی تھی وہ پچھلی فصل کے مقابلہ میں ضرور زیادہ تھی مگر ہمارے خیال میں اب بھی کافی نہ تھی، ہمیں ان

سفارشوں کے اصول پر بھی اعتراض تھا اور ان کے عمل پر بھی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ اس رپورٹ میں صرف مستقبل کا ذکر تھا، پچھلے بقایا، قرض، اور بے دخل کئے ہوئے کسانوں کا نام نہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ ہم کیا کریں؟ بس یہی جیسے پچھلے موسم بہار اور گرمیوں میں کیا تھا۔ کہ کسان کو مشورہ دیا جائے کہ جتنا ادا کر سکتے ہو کرو، اور پھر انھیں نتائج سے دو چار ہوں جن سے پہلے ہوئے تھے؟ مگر ہم اب یہ سمجھ گئے تھے کہ یہ مشورہ تو سراسر حماقت کا مشورہ ہے اور اسے دہرانا کسی طرح ممکن نہیں۔ اب تو صورت بس یہ تھی کہ یا تو کسان بڑی کوشش کر کے نئے مطالبہ کو پورا پورا چکا دے یا یہ نہو سکے تو فی الحال کچھ ادا نہ کرے اور دیکھے کہ کیا ہوتا ہے۔ مطالبہ میں سے کچھ تھوڑا سا ادا کر دینا تو کچھ بات نہ ہوئی، نہ ادھر نہ ادھر۔ کسان بیچارہ کے ہاتھ سے جو کچھ روپیہ تھا وہ بھی نکل گیا اور پھر زمین بھی چھن گئی۔

صوبہ کانگریس کی مجلس انتظامیہ نے خوب اچھی طرح اور توجہ سے اس معاملہ پر غور کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ اگر چہ حکومت کی نئی تجویزیں پچھلی گرمی والی چھوٹ کے مقابلہ میں بہتر ہیں مگر پھر بھی ایسی نہیں کہ انھیں اسی صورت میں قبول کر لیا جائے۔ ان میں اب بھی ایسی تبدیلیوں کا امکان تھا جن سے کسانوں کو فائدہ ہوتا۔ چنانچہ ہم نے حکومت کے یہاں اسی پر زور دیا۔ لیکن وہاں محسوس ہوا کہ اب امید نہیں رکھنی چاہئے اور ہم جس جھگڑے کو ٹالنے کی کوشش میں ہیں وہ تیزی سے سامنے بڑھا آ رہا ہے۔ صوبہ کی حکومت اور حکومت ہند دونوں کا رویہ کانگریس کی طرف سے برابر بدلتا جا رہا تھا۔ اور روز روز اس میں سرد مہری ظاہر ہو رہی تھی۔ ہم لمبے لمبے خط لکھتے تھے، وہاں سے نہایت مختصر جواب آتے تھے جن میں مقامی عہدہ داروں سے رجوع کرنے کو کہہ دیا جاتا تھا۔ یہ بات صاف دکھائی دیتی تھی کہ حکومت کسی طرح ہماری ہمت بڑھانا نہیں چاہتی۔ حکومت کی ایک شکایت اور ایک مشکل یہ تھی کہ کسانوں کو چھوٹ ملنے سے کانگریس کا اقتدار بڑھ جائے گا۔ حکومت عادت سے مجبور، اقتدار

اور اثر کے نقطہ نظر ہی سے سوچ سکتی تھی اور اس خیال سے کہ عوام کو چھوٹ ملنے کی وجہ کانگریس کو قرار دیں گے اسے الجھن تھی وہی چاہتی تھی کہ جہاں تک بن پڑے ایسا نہ ہو۔

اسی زمانہ میں دہلی سے اور دوسرے مقامات سے ہمیں خبریں مل رہی تھیں کہ حکومت ہند کل کانگریس کی تحریک کے خلاف بڑے پیمانہ پر یلغار شروع کرنے والی ہے۔ خبریں گرم تھیں کہ بی چھنگلیا اب ذرا زور دکھائیں گی اور بچھوؤں کے ڈنگ ہمیں سزا دیں گے۔ نومبر کے مہینہ میں ڈاکٹر انصاری نے مجھے (اور علیحدہ ولبھ بھائی پٹیل، صدر کانگریس کو بھی) ایک پیام بھیجا جس میں ان بہت سی خبروں کی تصدیق تھی جو ہمیں ملتی رہتی تھیں اور خاص کر کے ان آرڈی نینسوں کی تفصیل دی تھی جو صوبہ سرحد اور صوبجات متحدہ میں نافذ ہونے والے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بنگال کو تو اس وقت ایک نئے آرڈی نینس کا تحفہ مل ہی چکا تھا یا شاید عنقریب ملنے والا تھا۔ کئی ہفتہ بعد جب اس شان سے کہ گویا کوئی نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے نئے آرڈی نینس نکلے تو ڈاکٹر انصاری کے پیام کی پوری تصدیق تفصیلات تک میں ہوگئی۔ عام خیال یہ تھا کہ گول میز کانفرنس میں جو خلاف توقع طوالت ہوئی اس کی وجہ سے حکومت نے اپنی کارروائی شروع کرنے میں ذرا دیر کی۔ حکومت چاہتی تھی کہ جب تک گول میز کانفرنس کے لوگ میٹ میٹی مگر لا یعنی کانا پھوسیوں میں مبتلا ہیں بس اس وقت تک ہندوستان میں کھلم کھلا تشدد کو ٹالے۔

چنانچہ کھینچ تان بڑھی، اور ہم سب کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ہماری ننھی ننھی بے حقیقت ہستیوں کے باوجود واقعات اپنی راہ پر تیزی سے گامزن ہیں اور ان کی مقدار رفتار کو کوئی بھی روک نہیں سکتا۔ ہامرے بس میں بس یہ تھا کہ ان سے دوچار ہونے کے لئے اپنے کو تیار کریں اور زندگی کے اس ڈرامہ میں غالباً المناک ڈرامہ میں الگ الگ اور مل کر اپنا اپنا حصہ لیں۔ مگر ہمیں یہ امید ضرور تھی کہ قوتوں کے

تصادم کے اس ڈرامہ کا پردہ اٹھنے سے پہلے گاندھی جی لوٹ آئیں گے اور اپنے کندھوں پر ذمہ داری لے لیں گے چاہے جنگ کی۔ ان کی غیر حاضری میں اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے ہم من سے کوئی تیار نہ تھا۔

صوبجات متحدہ میں حکومت نے ایک قدم اور اٹھایا' جس سے سارے دیہات میں ہل چل مچ گئی۔ کسانوں چھوٹ کے متعلق پرچیاں بانٹی گئیں جن میں لکھا تھا کہ کتنی چھوٹ دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی تھی کہ اس چھوٹ کے بعد جو رقم واجب الادا نہ ہے وہ اگر مہینہ بھر کے اندر (اور بعض حالتوں میں یہ مدت اس سے بھی کم رکھی گئی تھی) ادا نہ ہوگئی تو چھوٹ منسوخ' پھر پورا مطالبہ قانونی طور پر وصول کیا جائے گا یعنی وہی بے دخلی تھے۔ اور اب تو اتنی مہلت بھی انہیں نہ دی گئی۔ سارے دیہات میں ایک سخت مصیبت کا سامنا تھا اور غریب اسامی ہاتھ میں پرچی لئے ادھر سے اُدھر بھاگے پھرتے تھے۔ کہیں بگڑتے کہیں شکایت کرتے' کہیں صلاح مشورہ کرتے۔ حکومت اور مقامی افسروں کی طرف سے یہ دھمکی بڑی حماقت کی بات تھی اور بعد میں تو ہمیں یہ بتایا گیا کہ اس پر عمل کرنا مقصود نہ تھا بس یونہی دھمکی دے دی تھی! لیکن اس نے پر امن تصفیہ کے امکانات کو بہت دور کر کے رفتہ رفتہ مقابلہ اور کشمکش کو ناگزیر بنا دیا۔

اب موقع وہ آ گیا تھا کہ کسانوں کو اور کانگریس کو فیصلہ کرنا تھا' یا ادھر یا ادھر اور گاندھی جی کی واپسی تک معاملہ کو ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ ہاں' تو کرنا کیا چاہیے تھا؟ کیا مشورہ دینا چاہئے تھا؟ کای ہم بجا طور پر کسانوں سے یہ کہہ سکتے تھے کہ جو تھوڑا سا وقت تمہیں دیا گیا ہے اس میں مطلوبہ رقم ادا کر دو' اور یہ ایسی حالت میں کہ ہم خوب جانتے تھے کہ ان میں سے بہت سوں کے لئے ایسا کرنا ممکن ہی نہین اور پھر جو بقایا ہے اس کا کای کیا جاتا؟ کیا اس کا اندیشہ نہ تھا کہ اگر رقم مطلوبہ کا بڑا حصہ بھی ادا کر دای۔ یا اس ایک فصل کا پورا مطالبہ بھی ادا کر دیا تب بھی اسے بقایا کے حساب میں

ڈال کر بے دخل نہ کرا دیا جائے گا۔

الہ آباد ضلع کی کانگریس کمیٹی نے جس میں کسان بھی خاصی تعداد میں شریک تھے مقابلہ کی ٹھانی۔ اس نے طرے کیا کہ وہ کسی حال میں کسانوں کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ مطالبہ ادا کر دو۔ لیکن اسے بتایا گیا کہ صوبہ کی مجلس انتظامیہ اور کانگریس کی مجلس عاملہ کی باضابطہ اجازت کے بغیر اسے کوئی جارحانہ قدم اٹھانے کا حق نہیں لے۔ چنانچہ معاملہ مجلس عاملہ کے سامنے گیا تصدق شیروانی اور پرشوتم داس ٹنڈن دونوں صوبہ اور ضلع کی طرف سے معاملہ سمجھانے کے لئے وہاں موجود تھے ہمارے سامنے سوال بس ایک الہ آباد ضلع کا تھا اور معاملہ تھا خالص معاشی۔ لیکن ہم نے سوچا کہ اس وقت ملک مین جو عام سیاسی ہیجان ہے اس میں ہماری کاروائی کے نتائج بہت دور تک پہنچ سکتے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں الہ آباد ضلع کی کمیٹی کو یہ اجازت دینے میں کچھ مضائقہ تھا کہ تم کسانون کو مشورہ دو کہ فی الحال اس وقت تک لگان اور لگذاری روک دیں جب تک کہ بات چیت ہو کر بہت شرائط طے نہ ہو جائیں۔ اصلی معاملہ بس اتنا ہی تھا ارہم چاہتے بھی تھے کہ بس اسی تک رہیں آگے نہ بڑھیں۔ مگر ایسا ممکن بھی تھا؟ مجلس عاملہ اس بات کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہتی تھی کہ گاندھی جی کی واپسی سے پہلے حکومت سے ان بن نہ ہو اور خاص کی ایک معاشی معاملہ پر۔ وہ اس ان بن کو اس لئے اور بھی ٹالنا چاہتی تھی کہ یہ پھر مختلف طبقات معاشی کا معاملہ بن سکتا ہے۔ مجلس عاملہ سیاسی اعتبار سے بہت آگے ہو مگر معاشی اعتبار سے اتنی آگے نہ تھی اور اسے یہ پسند نہ تھا کہ اسامی اور زمیندار کا سوال اٹھا جائے۔

میری طبیعت کا رجحان چونکہ اشتراکیت کی طرف ہے اس لئے معاشی اور معاشرتی امور پر صلاح مشورہ کے لئے مجھے کچھ بہت مناسب آدمی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ادھر میں خود بھی چاہتا تھا کہ مجلس عاملہ سمجھ لے کہ صوبہ متحدہ کا مامالہ ایسا ہے کہ

ہمارے معتدل مزاج اراکین خود باوجود مخالف میلان طبع کے واقعات کے ہاتھوں کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور رہیں۔

چنانچہ میں بہت خوش تھا کہ مجلس عاملہ کے جلسہ میں ہمارے صوبہ سے شیروانی (ہمارے صوبہ کے صدر) اور دوسرے لوگ موجود ہیں' اس لئے کہ شیروانی کوئی شعلہ مزاج انتہا پسند نہ تھے سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے وہ کانگریس کے اعتدال پسندوں میں تھے اور سال کے شروع شروع میں صوبہ کانگریس کمیٹی کی دیہاتی سیاست کے خلاف رائے رکھتے تھے۔لیکن جب یہ خود کمیٹی کے صدر ہوئے اور ذمہ داری کا بوجھ خود ان پر پڑا تو انہوں نے سمجھا کہ ہامرے لئے تو کوئی اور راہ ہے ہی نہیں۔ اس کے بعد سے صوبہ کی کمیٹی نے جو چکھ بھی کیا اس میں ان کی پوری پوری مدد شاملہ تھی اور اکثر کارروائیاں تو بحیثیت صدر انہیں کی وساطت سے ہوئیں۔

چنانچہ تصدق شیروانی نے جب مجلس عاملہ کے سامنے ہماری وکالت کی تو اس کا ممبروں پر ابڑا اثر ہوا' اس سے کہیں زیادہ جتنا کہ میری وکالت سے ہوتا۔ بہت کچھ رک رک کر لیکن یہ جان کر کہ انکار کیا نہیں جا سکتا' مجلس عاملہ نے صوبہ کی کمیٹی کو یہ اختیار دیدیا کہ جس علاقہ میں چاہے لگان اور مالگزاری کا ادا کرنا کوادے' مگر ساتھ ہی اس پر بھی زور دیا کہ صوبہ والے جہاں تک ہو سکے اس بات سے بچیں اور صوبہ کی حکومت سے بات چیت جاری رکھیں۔

یہ نامہ و پیام کچھ دنوں ہوتا رہا مگر بے نتیجہ۔ میرا خیال ہے کہ اس سے الہ آباد ضلع مس چھوٹ کی تعین کچھ بہتر ہوگئی۔ حالات معمولی ہوتے تو ممکن تھا کہ کوئی تصفیہ بھی ہو جاتا یا کم سے کم لڑائی تو ٹل ہی جاتی۔اس لئے کہ اختلاف خیال کی خلیج تنگ ہو رہی تھی۔لیکن حالات بہت غیر معمولی تھے اور دونوں طرف' حکومت کی طرف بھی اور کانگریس کی طرف بھی یہ گمان تھا کہ جو مقابلہ سمنے آرہا ہے وہ ٹالے نہیں ٹل سکتا۔اور یہ نامہ و پیا سب بے حقیقت ہے۔جو قدم بھی اٹھنا تھا' ادھر سے ہو

یا ادھر سے، تو سمجھا یہ جاتا تھا کہ فریق مخالف اپنے مورچہ کی مضبوطی کی تدبیریں کر رہا ہے۔ حکومت کی تیاریاں تو چھپے چھپے راز میں پوری ہو سکتی تھیں اور اور چنانچہ ہوئیں بھی۔ ہماری ساری قوت عام لوگوں کے حوصلوں اور امنگوں کی بلندی پر منحصر تھی اور اسے خفیہ کارروائیوں سے پیدا کرنا یا ابھارنا معلوم۔ ہم میں سے بعض (اور ان مجرموں میں میں بھی تھا) اپنی تقریروں میں بار بار کہہ چکے تھے کہ آزادی کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ جلد ہی بہت سی آزمائشوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہم اپنی قوم سے کہتے تھے کہ ان مصیبتوں کے لئے تیار رہے اور اس وجہ سے لوگ ہمیں جو بتاتے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے متوسط طبقہ کے کانگریسی کام کرنے والے حقیقی واقعات کا سامنا کرنے سے بچتے ہیں اور امید رکھتے تھے کہ جیسے بھی ہو پھر مقابلہ کی نوبت نہ آئے گی۔ جو لوگ اخبار پڑھتے ہیں اور ان کی توجہ گاندھی جی کے لندن میں ہونے کی وجہ سے ادھر بٹ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی تعلیم یافتہ طبقہ کی اس بے عملی کے باوجود واقعات تھے کہ بڑھے چلے آتے تھے، خصوصاً بنگال میں صوبہ سرحد میں اور صوبہ متحدہ میں چنانچہ نومبر میں تو بہتوں کو دکھائی دینے لگا تھا کہ توڑ کا وقت آن پہنچا۔

صوبہ کی کانگریس کمیٹی اس ڈر سے کہ کہیں واقعات متوقع وقت سے پہلے سامنے نہ آجائیں اور جنگ شروع نہ ہو جائے اپنے کچھ نجی انتظامات بھی کر لئے تھے۔ الہ آباد کی کمیٹی نے ایک کسان سبھا بھی کی جس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ اگر بہتر شرائط نہ حاصل ہو پائیں تو کسانوں کو یہ مشورہ دینا چاہئے کہ لگان اور مالگزاری ادا کرنا بند کر دو۔ اس قرارداد سے صوبہ کی حکومت بہت بگڑی اور اسے وجہ جنگ قرار دے کر انھوں نے کہہ دیا کہ بس اب ہم تم سے کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہتے۔ اس طرز عمل کا ازر ادھر صوبہ کی کانگریس پر بھی ہوا۔ انھوں نے اسے آنے والے طوفان کا پیش خیمہ جانا اور جلدی جلدی اپنی تیاریاں شروع کر دیں۔ الہ آباد میں ایک کسان

سبھا اور منعقد ہوئی اور اس میں پہلے سے زیادہ سخت اور واضح قرارداد منظور کی گئی۔ اس میں کسانوں سے کہا گیا تھا کہ مزید گفتگو کے ختم ہونے اور بہتر شرطوں کے طے پانے تک سب ادائیگیاں روک دو۔ اس وقت بھی ہم نے جو رویہ اختیار کیا، اور اس وقت کیا بالکل آخر تک، وہ یہ نہیں تھا کہ لگان ادا ہی نہ کیا جائے۔ بلکہ یہ تھا کہ مناسب لگان ادا کیا جائے۔ ہم برابر نامہ و پیام کی درخواست بھی کرتے رہے، ہر چند کہ دوسرا فریق تو نہایت طظنہ کے ساتھ ہمیں چھوڑ کر الگ جا چکا تھا۔ الہ آباد والی قرار داد زمینداروں اور اسامیوں کے لئے یکساں تھی۔ مگر ہم جانتے تھے کہ دراصل اس کا اطلاق صرف اسامیوں اور کچھ چھوٹے چھوٹے زمینداروں ہی پر ہوگا۔

نومبر کے آخر اور دسمبر ۱۹۳۱ء کے شروع میں صوبجات حال یہ تھی ادھر بنگال اور صوبہ سرحد میں بھی معاملات دگرگوں تھے۔ بنگال میں تو ایک نیا اور سخت ہمہ گیر آرڈیننس نافذ ہی کر دیا گیا تھا۔ یہ سب نشانیاں امن کی نہ تھیں، جنگ کی تھیں۔ اور سوال بس یہ تھا کہ گاندھی جی کب واپس آئیں گے؟ حکومت نے اتنے دنوں سے جس یلغار کی تیاری کی تھی کیا اس کے شروع ہونے سے پہلے گاندھی جی ہندوستان پہنچ جائیں گے؟ یا اس وقت آئیں گے کہ ان ساتھی قید میں پہنچ چکے ہوں گے اور معرکہ چل رہا ہوگا؟ معلوم ہوا کہ وہ واپس آرہے ہیں اور سال کے آخری ہفتہ میں بمبئی پہنچ جائیں گے۔ ہم میں سے ایک ایک، کیا صدر مقام پر، کیا صوبوں میں، کانگریس کا ایک ایک رکن چاہتا تھا کہ ان کی واپسی تک معرکہ کو ٹالے۔ خود اس معرکہ کے خیال یہ بہتر تھا کہ ہم ان سے مل لیتے ان سے ہدایت اور مشورہ لے لیتے لیکن یہ ایک دوڑ تھی جس میں ہم بے بس تھے کہ چال برطانوی حکومت کے ہاتھ میں تھی۔

---

(۱) ذیل کے خطوط ۲۷ اگست والے شملہ کے مفاہمت نامہ کا جزو تھے
مسٹر گاندھی بنام مسٹر ایمرسن، سکرٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ، حکومت ہند شملہ ۲۷ اگست

۲۹۳۱ء

ڈی مسٹر ایمرسن!

آپ کا آج والا خط ملا جس کے ساتھ آپ نے ایک نیا مسودہ بھیجا ہے۔ اس کا شکریہ۔ سر کاؤس جی نے بھی مجھے ان ترمیموں کی اطلاع دی تھی جو آپ نے تجویز کی ہیں میرے ساتھیوں نے اور میں نے اس ترمیم کئے ہوئے مسودہ پر غور کرلیا ہے اور مندرجہ ذیل ملاحظات کے ساتھ ہم اسے قبول کرنے کو تیار ہیں۔

پیراگراف نمبر ۱۱ میں میرے لئے ممکن نہیں کہ میں کانگریس کی طرف سے اس بات کو قبول کرلوں جو حکومت نے پیش کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے خیال میں اگر سمجھوتہ پر کاربند ہونے کے سلسلہ میں کانگریس کی رائے میں کوئی شکایت پیدا ہو تو اس کی تحقیقات تو لازم ہی ہے' اس لئے کہ جب تک دہلی کا سمجھوتہ نافذ ہے سول نافرمانی بند رہے گی لیکن اگر حکومت ہند یا صوبجاتی حکومتیں تحقیقات کو منظور نہ کریں تو میرے ساتھی اور میں اس دفعہ کے رکھنے پر اعتراض نہ کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس ان دوسرے معاملات کے متعلق جو اس کی طرف سے اس قدر شدت سے پیدا ہوئی کہ تحقیقات نہ ہونیکی صورت میں کانگریس نے اپنا فرج جانا کہ تلافی کی کوئی فوری تدبیر براہ راست مد انعانہ عمل کی قسم سے تلاش کرے تو اس وقت کانگریس اس تدبیر کے اختیار کرنے کے لئے آزاد سمجھی جائے گی ہر چند سول نافرمانی بند کی جا چکی ہے۔

میں حکومت کو اس بات کا یقین دلانے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا کہ کانگریس برابر یہ کوشش کرے گی کہ براہ راست کارروائی سے بچے اور باہمی بحث و گفتگو ترغیب وغیرہ سے کام نکالے۔ یہاں جو کانگریس کے نقطہ نظر کا اظہار کردیا گیا وہ اس لئے کہ آئندہ غلط فہمی نہ ہو اور کانگریس پر عہد شکنی کا الزام نہ لگایا جائے۔ اگر اس وقت کی گفتگو ئیں کامیابی کے ساتھ ختم ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ سرکاری بیان' یہ خط اور آپ کا جواب سب ایک ساتھ شائع کردیئے جائیں گے۔ آپ کا مخلص

م۔ک۔گاندھی

مسٹر ایمرسن بنام مسٹر گاندھی!

شملہ

۲۷ اگست ۱۹۳۱ء

ڈیر مسٹر گاندھی! آپ کے آج والے خط کا شکریہ' جس میں آپ نے سرکاری بیان کے مسودوں کو قبول فرمالیا ہے ان ملاحظات کے ساتھ جو آپ کے خط میں درج ہیں' گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل نے نوٹ فرمالیا ہے کہ کانگریس کا ارادہ ان معاملات کی تحقیقات پر اصرار کرنے کا نہیں ہے جو اب تک اس کی طرف سے اٹھائے گئے ہیں۔

جہاں آپ یہ یقین دلاتے ہیں کہ کانگریس برابر اس بات کی کوشش کرے گی کہ براہ راست کاروائی سے احتراز کرے اور باہمی بحث ومباحثہ ترغیب اور اسی قسم کی تدابیر سے مداوا چاہے اس کے ساتھ آپ ان آئندہ کارروائیوں کے متعلق کانگریس کی حیثیت کو واضع کردینا چاہتے ہیں۔ جن کے اختیار کرنے کی کبھی آگے جا کر ضرورت ہوسکتی ہے۔ مجھے عرض کرنا ہے کہ گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل اس امید میں آپ کے ہمنوا ہیں کہ کوئی براہ راست کاروائی نہ کی جائے گی۔حکومت کے عام رویہ سے متعلق ہیں حضور وائسرائے بہادر کے اس خط کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو ۱۹ اگست کو آپ کے نام ارقام فرمایا تھا۔ مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ سرکاری بیان، آپکا آج والا خط اور اس کا یہ جواب حکومت کی طرف سے ساتھ ساتھ شائع کردیئے جائیں گے۔

آپ کا مخلص

ہ۔و۔ایمرسن

(۲) سارے ہندوستان کے دیہی قرض کے لئے ۸۶۰ کروڑ کا تخمینہ غالباً بہت کم ہے اور بہر حال پچھلے ۴۔۵ سال میں اس میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے۔اس قرض میں پنجاب کے حصہ کا تخمینہ پنجاب کی ساہوکارہ کمیٹی نے ۱۹۲۹ء میں پیش ہوا تھا اس پر مجلس قانون ساز کی منتخبہ کمیٹی نے جو رپورٹ دی ہے اس میں لکھا ہے کہ اہل زراعت پر قرض کا بوجھ اتنا ہے کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔کم کم تخمینہ سے بھی کوئی ۲۰۰ کروڑ، یہ نیا عدد ساہوکارہ کمیٹی کے تخمینہ سے کوئی ۵۰ فیصدی زیادہ ہے۔اگر قرض میں اضافہ کی رفتار دوسرے صوبوں میں بھی یہی ہے تو اس وقت ۱۹۳۴ء سارے ہندوستان کے دیہی قرض کا تخمینہ کوئی ۱۲۰۰ کروڑ روپیہ سے اوپر ہوگا۔

عارضی صلح کا خاتمہ

صوبجات متحدہ میں اپنی مشغولیت کے باجود مجھے عرصہ سے یہ فکر تھی کہ طوفان کے جو، دو مرکز اور ہیں، صوبہ سرحد اور بنگال، کسی طرح وہاں پہنچوں۔ جی چاہتا تھا کہ موقع پر جا کر حالات کا مطالعہ کروں اور پرانے ساتھیوں سے بھی ملوں، کہ ان میں سے بہتوں سے تو اب کوئی دو سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس سب زیادہ میری خواہش یہ تھی کہ ان صوبوں کے لوگوں نیجو ہمتاور شجاعت دکھائی ہے اور قومی جنگ میں جو قربانیاں کی ہیں ان پر خود جا کر اپنا خراج عقیدت پیش کروں۔ اس زمانہ میں صوبہ سرحد تو میری پہنچ سے باہر تھا، اس لئے کہ حکومت ہند اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی کہ کوئی ممتاز کانگریسی وہاں جائے، اور حکومت کی اس ناپسندیدگی کے باوجود ہم جانا چاہتے تھے کہ کہیں خواہ مخواہ کوئی گتھی نہ پڑ جائے۔

بنگال میں معاملات بد سے بدتر ہوتے جاتے تھے اور اگرچہ دل اس صوبہ کی طرف بہت کھنچتا تھا مگر جانے سے پہلے میں بہت کچھ جھجکا۔ میں جانتا تھا کہ وہاں بے بس ہوں گا اور کچھ زیادہ فائدہ نہ پہنچا سکوں گا۔ اس صوبہ میں دو کانگریسی جماعتوں میں مدت سے ایک افسوس ناک جھگڑا چلا آتا تھا۔ باہر کے کانگریس والے اس سے ڈرتے تھے اور الگ الگ رہتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں خود ایک طرف سے یا دوسری طرف سے اس جھگڑے میں الجھ نہ جائیں۔ یہ طریقہ تھا کمزوریکا اور وہی شتر مرغ کا سا۔ اس سے نہ بنگال میں سکون پیدا ہو سکتا تھا نہ وہاں کے مسائل حل ہو سکتے تھے۔ گاندھی جی کے لندن جانے کے کچھ عرصہ بعد دو واقعات ایسے پیش آئے کہ سارے ہندوستان کی توجہ بنگال کے معاملات کی طرف ہو گئی یہ حادثے ہگلی اور چاٹ گام میں ہوئے تھے۔

ہگلی میں نظر بندوں کے رکھنے کے لئے ایک خاص جیل تھا۔ سرکاری طور پر اعلان ہوا کہ اس جیل میں بلوہ ہوا تھا، نظر بندوں نے جیل کے اسٹاف پر حملہ کیا اور

اسٹاف والے گولی چلانے پر مجبور ہوئے۔ ایک نظر بند گولی سے مارا گیا اور زخمی تو بہتیرے ہوئے۔ واقعہ کے فوراً ہی بعد مقامی طور پر ایک سرکاری تحقیقات ہوئی جس میں اسٹاف والوں کو گولی چلانے اور اس کے نتائج سے بالکل بری الذمہ کر دیا گیا۔ لیکن اس واقعہ میں بہت سی نرالی باتیں تھیں، بعض واقعات جو رفتہ رفتہ ظاہر ہوئے تو وہ سرکاری بیان سے مطابقت نہ کھاتے تھے، لہذا تفصیلی تحقیقات کے لئے بڑا سخت مطالبہ شروع ہوا۔ ہندوستان میں جو عام سرکاری رسم ہے اس سے بالکل خلاف حکومت بنگال نے اعلی عدالتی عہدہ داروں کی ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی۔ یہ کمیٹی بالکل سرکاری تھی۔ مگر اس نے جو شہادتیں لیں اور معاملہ پر پوری طرح غور کیا تو معاملہ کو جیل کے اسٹاف کے خلاف پایا۔ انھوں نے قرار دیا کہ غلطی زیادہ تر اسٹاف کی تھی اور گولی کا چلانا ناواجب تھا۔ یوں گویا اس باب میں حکومت کے جملہ سابقہ بیانات سراسر جھوٹے پڑے۔

یوں تو ہگلی کے حادثہ میں کوئی بہت غیر معمولی بات نہ تھی۔ بدقسمتی سے ایسے واقعات یا حادثات ہندوستان میں کوئی نادر چیز نہیں ہیں۔ جیل کے بلوؤں کا ذکر اکثر پڑھنے میں آتا ہے جن میں نہتے اور بے بس قیدیوں کو مسلح نگران اور دوسرے لوگ بہادری سے دبا دیتے ہیں۔ ہگلی میں جو غیر معمولی بات تھی وہ یہ کہ اس واقعہ نے اس قسم کے حادثات کے متعلق سرکاری بیانات کے یکطرفہ ہونے بلکہ جھوٹا ہونے کو کھول کر ظاہر کر دیا اور لطف یہ کہ سرکاری طور پر ظاہر کر دیا۔ پہلے بھی لوگ ان سرکاری بیانات کو کچھ بہت باور نہ کرتے تھے۔ لیکن اب تو بالکل پول ہی کھل گیا۔

ہگلی کے واقعہ کے بعد سے ہندوستان بھر میں بہت سے ایسے جیل کے حادثات کے ہوئے ہیں، کبھی اور قسم کا تشدد کیا گیا ہے۔ اور کچھ عجیب بات ہے کہ ان بلوؤں میں ہمیشہ بس قیدی ہی ضرر اٹھاتے ہیں۔ تقریباً ہمیشہ ایک سرکاری بیان شائع ہوتا ہے کہ قیدی طرح طرح کی بدکرداریوں کے مرتکب تھے اور اسٹاف سراسر بے قصور

تھا۔ شاذ ہی ایسا ہوا ہے کہ اسٹاف والوں کو محکمہ کی طرف سے کوئی سزا دی گئی ہو۔ تفصیلی تحقیقات کے سب مطالبوں کا جواب بس نکا سا نفی میں ملا۔ صرف محکمہ کی طرف سے دریافت حال کو کافی سمجھا گیا۔ ظاہر ہے کہ ہگلی کا سبق حکومت نے خوب اچھی طرح سیکھا تھا یعنی یہ کہ باضابطہ اور غیر جانبدار تحقیقاتیں کرانا ٹھیک نہیں اور یہ کہ الزام لگانے والا ہی بہتر یجن فیصلہ کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ پھر کیا عجب ہے کہ لوگ بھی ہگلی کے واقعہ سے یہ سبق سیکھیں کہ سرکاری بیانات میں بس وہ ہوتا ہے جو حکومت منوانا چاہتی ہے اصلی واقعات سے انھیں کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

چاٹ گام کا معاملہ اس سے بہت سخت تھا کسی تشدد پسند نے ایک مسلمان پولیس کے انسپکٹر کو گولی سے مار ڈالا تھا۔ اس پر ہندو مسلم فساد ہوا یا کم سے کم اسے ہندو مسلم فساد بتایا گیا۔ یہ بات واضح تھی کہ معاملہ اس سے بہت کچھ زیادہ تھا۔ اور معمولی فرقہ وارانہ فسادات سے ذرا مختلف تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ تشدد پسند کے فعل کو فرقہ واریت سے کوئی واسطہ نہ تھا، وہ تو بس ایک پولیس کے افسر کے خلاف تھا۔ بالکل اس سے قطع نظر کہ وہ افسر ہندو تھا یا مسلمان۔ پھر بھی اس قتل کے بعد کچھ ہندو مسلم فساد ضرور ہوا تھا۔ فساد کیسے شروع ہوا اور فساد کا یہ موقع کیا تھا یہ بات صاف نہ ہوئی ہر چند کہ اس باب میں ذمہ دار لوگوں نے سخت سخت الزامات لگائے۔ اس فساد میں ایک اور خاص بات یہ تھی کہ بعض بعض خاص گروہوں نے مثلاً اینگلو انڈین ملازمین ریلوے نے اور دوسرے سرکاری ملازموں نے اس میں بڑا حصہ لیا اور کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے نہایت وسیع پیمانہ پر انتقامی کارروائیاں کیں۔ ج۔م۔ سین گپتا اور بنگال کے دوسرے رہنماؤں نے چاٹ گام کے واقعات کے متعلق معین الزامات لگائے اور مطالبہ کیا کہ ان کی تحقیقات کرلی جائے، یا ہمارے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلایا جائے۔ مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی اور یہی مناسب سمجھا کہ کچھ نہ کرے۔

چاٹ گام کے ان ذرا غیر معمولی واقعات نے دو خطرناک امکانات کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی۔ تشدد پسندی کو یوں تو مختلف پہلوؤں سے برا بتایا جا چکا ہے حتی کہ جدید انقلابی طریقہ کار کے نزدیک بھی یہ بری قرار پا چکی ہے لیکن اس کے امکانی نتائج میں سے ایک نے مجھے ہمیشہ بہت متوحش رکھا ہے یعنی ہندوستان میں غیر منظم اور فرقہ وارانہ تشدد کے پھیل جانے کے خطرے نے۔ میں کچھ ایسا بودا ہندو نہیں ہوں کہ تشدد سے اس لئے خائف ہوں کہ وہ تشدد ہے، مگر یہ تشدد مجھے پسند نہیں۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان میں ابھی انتشار کی قوتیں بہت ہیں اور بے ضابطہ تشدد سے انھیں تقویت پہنچے گی اور ایک متحدہ اور منظم قوم کی تعمیر کا کام جتنا دشوار ہے اس سے دشوار تر ہو جائے گا۔ جب لوگ مذہب کے نام پر قتل کریں یا بہشت میں اپنے لئے جگہ محفوظ کرانے کے لئے تو انہیں سیاسی تشدد پسندی کا عادی بنانا ذرا خطرہ کی بات ہے۔ سیاسی قتل بھی بری چیز ہے۔ مگر پھر بھی سیاسی تشدد پسند کے ساتھ دلیل و بحث ممکن ہے اور اسے دوسری راہ پر ڈالا جا سکتا ہے اس لئے کہ گمان یہ ہے کہ وہ جس مقصد کے لئے کوشاں ہے وہ دنیاوی مقصد ہے شخصی نہیں بلکہ قومی مقصد ہے۔ مگر مذہبی قتل اس سے بھی بری چیز ہے اس لئے کہ اس کا تعلق دوسری دنیا سے ہے اور اس کے متعلق بحث و دلیل کی کوشش بھی نہیں کی جا سکتی بعض وقت ان دونوں قسموں کا فرق بہت باریک ہو جاتا ہے بلکہ تقریباً کچھ نہیں رہتا اور سیاسی قتل بھی کسی فوق الطبعی عمل سے نیم مذہبی قتل بن جاتا ہے۔

چاٹ گام میں ایک پولیس افسر کے قتل اور اس کے نتائج سے صاف صاف سامنے آ گیا کہ ایسی تشدد کی کاروائیوں کے کیسے خطرناک امکانات ہیں اور اس سے ہندوستانی اتحاد اور آزادی کو کیسا سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس قتل کے بعد جو انتقامی کاروائیاں ہوئیں اس سے پتہ چلا کہ ہندوستان میں بھی فاشٹی طریقے پہنچ گئے ہیں اس کے بعد سے خصوصاً بنگال میں اس قسم کی انتقامی کاروائیوں کی بہت سی

مثالیں پیش آچکی ہیں اور یہاں کے یورپین اور اینگلو انڈین باشندوں میں فاشٹی روح پھیل چکی ہے۔ برطانوی سامراج کے بعض ہندوستانی دم چھلوں نے بھی اس روح کو اپنایا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ خود سیاسی تشدد پسندوں میں یا ان میں سے بہتوں میں یہی فاشٹی روح کارفرما ہے' لیکن اس کا رخ دوسری طرف ہے ان کا فاشزم کا مد مقابل ہے۔

میں نومبر ۱۹۳۱ء میں چند روز کے لئے کلکتہ گیا۔ ان دنوں مصروفیت بہت رہی' نجی طور پر بہت سے افراد اور جماعتوں سے ملنے کے علاوہ کئی عام جلسوں میں تقریریں بھی کیں۔ ان سب جلسوں میں میں نے سیاسی تشدد پسندی پر بحث کی اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ تشدد پسندوں کو برا بھلا نہیں کہا نہ انہیں نامرد اور بزدل بتایا جس طرح ہمارے بعض وہ ہم وطن کہا کرتے ہیں جس سے شاید ہی کبھی کوئی ایسا کام اتفاق سے بھی سرزد ہوا ہو جس مین ایسے مرد یا عورت کو جو ہر دم جان جوکھوں میں ڈالتا ہو کوئی بزدل کہے۔ اس شخص پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بودے نکتہ چینیوں کو جو دور سے پڑے چلاتے ہیں اور خود کچھ نہیں کر سکتے ذرا اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

کلکتہ کے قیام کے آخری دن شام کو رخصت ہو کر اسٹیشن جانے سے پہلے دو نوجوان مجھ سے ملنے آئے۔ یہ دونوں بہت کم عمر تھے، کوئی بیس بیس سال عمر ہوگی ذرا گھبرائے گھبرائے چہرے اور چمکتی ہوئی آنکھیں۔ مجھے خبر بھی نہ تھی کہ یہ کون تھے، مگر ان کے آنے کا مقصد میری سمجھ میں آگیا۔ یہ مجھ سے بہت خفا تھے کہ میں نے سیاسی تشدد کے خلاف تلقین کی۔ انھوں نے بتایا کہ نوجوانوں پر اس کا بہت برا اثر ہو رہا ہے اور وہ اس قسم کی مداخلت کو گوارا نہیں کر سکتے۔ ان سے کچھ بحث ہوئی بہت جلدی جلدی میں اس لئے کہ میری روانگی کا وقت قریب تھا۔ شاید دوران بحث میں ہمارا

لہجہ سخت ہو گیا تھا اور مزاج میں کچھ گرمی پیدا ہو گئی تھی اور میں نے شاید کچھ سخت باتیں بھی ان سے کہیں۔ جب ان سے رخصت ہوا تو چلتے چلتے انھوں نے تنبیہہ کی،، اب آگے ذرا خیال رہے ایسی باتیں نہ ہوں ورنہ تمھارے ساتھ بھی وہی کیا جائے گا جو اوروں کے ساتھ کیا گیا ہے۔،،

میں یوں کلکتہ سے رخصت ہوا۔ رات کو جب ریل گاڑی میں لیٹا تو دیر تک ان دولڑکوں کے گھبرائے گھبرائے چہرے نظر کے سامنے رہے۔ یہ زندگی سے لبریز اور عصبی قوت سے بھرے ہوئے تھے، کیا ہی اچھا سامان تھا اگر انھیں کوئی ٹھیک راہ پر لگادے! مجھے افسوس تھا کہ میں نے ان سے اس قدر عجلت میں اور ذرا درشتی سے برتاؤ کیا اور جی چاہتا تھا کہ ان سے ذرا دیر تک باتچیت کا موقع ملا ہوتا۔ شاید میں انھیں سمجھا سکتا کہ اپنی ہونہار زندگیوں کو کسی اور راہ پر ڈالیں۔ ہندوستان اور آزادی کی خدمت کی کسی راہ پر کہ ان راہوں میں جرات اور قربانی کے مواقع کی کیا کمی ہے۔ پچھلے برسوں میں مجھے اکثر ان نوجوانوں کا خیال آیا ہے مجھے کبھی ان کے ناموں کا علم نہ ہوا نہ پھر کہیں ان کا کوئی اور پتہ چلا، اور کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا ہے کہ کیا معلوم وہ مر گئے کہ کالے پانی میں جیل کی کسی کوٹھری میں جیتے ہیں۔

دسمبر کا مہینہ تھا، لالہ اباد میں دوسری کسان سبھا کا جلسہ ہوا اور میں جلدی جلدی جنوب میں کرناٹک پہنچا۔ اپنے پرانے ساتھی ہندوستانی سیوا دل والے ڈاکٹر ن۔ س ہرڈیکر سے ایک پرانا وعدہ تھا اسے پورا کرنا تھا۔ سیوا دل قومی تحریک کے رضا کاروں والا حصہ ہے۔ اس کا انتظام بالکل الگ تھا مگر یہ برابر کانگریس کے ساتھ رہا تھا۔ ۱۹۳۱ء کے موسم گرما میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے اسے کانگریس کے نظام میں بالکل ملانے اور کانگریس کا شعبہ رضا کاران بنا لینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ یہ ہو گیا اور ہرڈیکر نے مجھے آمادہ کیا کہ وہ جا کر دل مختلف تقریبوں میں شریک ہوں۔ پھر وہ مجھے کچھ سن کے لئے کرناٹک کے دورہ پر لے گئے اور مجھے ہر جگہ لوگوں کا جوش دیکھ کر

بڑی حیرت ہوئی۔ واپسی میں شولاپور گیا جو مارشل لا کے نفاذ کی وجہ سے مشہور ہو چکا تھا۔

کرناٹک کے اس دورہ کی حیثیت ایک الوداعی رسم کی سی ہوگئی۔ میری تقریریں گویا ہنس کا آخر گیت تھیں۔ اگرچہ تھیں ذرا تیز و تند اور میں تو سمجھتا ہوں کہاں میں ایسی موسیقی بھی نہ تھی۔ صوبہ متحدہ سے جو خبریں آئی تھیں وہ بالکل قطعی اور واضح تھیں۔ حکومت نے وار کر دیا تھا اور وار بھی کاری۔ الہ آباد سے کرناٹک جاتے ہوئے میں کملا کے ساتھ بمبئی بھی گیا تھا۔ وہ پھر بیمار تھی۔ میں نے بمبئی میں ان کے علاج کا انتظام کیا۔ الہ آباد سے بمبئی پہنچنے کے بعد ہی ہمیں خبر ملی تھی کہ حکومت ہند نے صوبجات متحدہ کے لئے ایک خاص آرڈیننس جاری کر دیا ہے۔ گاندھی جی جہاز میں تھے اور عنقریب بمبئی پہنچنے والے تھے، مگر حکومت نے یہی فیصلہ کیا کہ ان کی واپسی کا انتظار نہ کرے۔ آرڈیننس کی غرض تو دیہی شورشکو دبانا بتائی گئی تھی مگر اس کا جال اتنی اتنی دور تک پھینکا گیا تھا کہ ہر قسم کی سیاسی زندگی ناممکن ہوگئی تھی حد یہ کہ قدیم انجیل والی رسم کو پلٹ کر اس نے اولاد کے گناہوں پر والدین اور سرپرستوں کو سزا دینے کا اہتمام تک کیا تھا!

اسی زمانہ میں گاندھی جی کے اس انٹرویو کی خبر پڑھنے میں آئی جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انھوں نے روما کے اخبار ژورنال اطالیا کو دیا ہے۔ اس پر بڑی حیرت یوں ہوئی کہ یوں سرسری طور پر روما میں کوئی انٹرویو دے گاندھی جی کی عادت کے بالکل خلاف بات تھی۔ پھر جو اس بیان کو ذرا غور سے پڑھا تو اس میں بہت سے لفظ اور فقرے ایسے ملے جو گاندھی جی کے ہو ہی نہ سکتے تھے چنانچہ قبل اس کے کہ ان کی طرف سے انکار ہوتا ہم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ انٹرویو جس شکل میں شائع ہوا ہے اس میں تو ہرگز نہیں دیا گیا ہوگا۔ ہم سمجھتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہوگا اس بہت توڑ مروڑ کر شائع کیا گیا ہے اتنے میں گاندھی جی کی طرف سے اس کی قطعی تردید نکلی اور

ان کا یہ بیان شائع ہوا کہ انھوں نے روما میں سرے سے کوئی انٹرویو دیا ہی نہیں، اس وقت یہ بات صاف ہوگئی کہ کسی نے گاندھی جی کے ساتھ چال چلی ہے، لیکن حیرت تو اس پر ہوئی کہ برطانوی اخباروں اور سیاسی کارکنوں نے گاندھی جی کی تردید کو باور نہیں کیا اور حقارت کے ساتھ انھیں جھوٹا کہہ کہہ کر پکارا اس سے بڑا ہی دکھ ہوا اور بہت غصہ آیا۔

میرا جی بہت چاہتا تھا کہ کرناٹک کا دورہ چھوڑ دوں اور الہ آباد پہنچوں۔ دل کہتا تھا کہ میری جگہ صوبہ متحدہ میں اپنے ساتھیوں کے دوش بدوش ہے۔ جب گھر میں یہ کچھ ہو رہا ہو تو خود دور ہونا بڑی ہی تکلیف دہ آزمائش تھی۔ لیکن میں نے فیصلہ یہی کیا کہ کرناٹک کے پروگرام کی پابندی کروں۔ بمبئی واپس آیا تو بعض دوستوں نے صلاح سی کہ گاندھی جی ٹھیک ہفتہ بھر میں آجائیں گے ان کے پہنچنے تک بمبئی ہی میں ٹھیروں۔ لیکن یہ تو ناممکن تھا۔ الہ اباد سے پرشوتم داس ٹنڈن اور دوسرے لوگوں کی گرفتاریوں کی خبر آئی تھی۔ اس کے علاوہ ہماری صوبہ کی کانفرنس کا اجلاس اسی ہفتہ میں اٹاوہ میں ہونا قرار پایا تھا۔ چنانچہ میں نے الہ آباد کی واپسی کا فیصلہ کیا اگر آزاد رہا تو چھ روز بعد بمبئی لوٹ آؤں گا، گاندھی جی سے بھی مل لوں گا اور مجلس عاملہ کے جلسہ میں شریک ہو جاؤں گا۔ کملا کو وہیں بمبئی میں بستر علالت پر چھوڑا۔

ابھی الہ آباد پہنچا بھی نہ تھا کہ چیوکی اسٹیشن پر نئے آرڈیننس کے ماتحت ایک حکم کی تعمیل مجھ پر کی گئی۔ الہ آباد کے اسٹیشن پر پھر اسی حکم کے ثنیٰ کی تعمیل کی کوشش کی گئی اور گھر پہنچا تو ایک تیسرے صاحب نے تیسری مرتبہ کوشش فرمائی۔ بات صاف تھی کہ بھول چوک کا احتمال بھی نہیں رکھا گیا تھا۔ اس حکم نے مجھے الہ آباد میونسپل کے حدود میں نظر بند کر دیا تھا اور مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں کسی عام جلسہ یا تقریب میں شریک نہ ہوں نہ کسی جلسہ میں تقریر کروں نہ کسی اخبار یا پرچہ میں کچھ لکھوں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی پابندیاں تھیں۔ پھر معلوم ہوا کہ ایسا ہی حکم بہت سے

ساتھیوں کو ملا تھا جس میں تصدق شیروانی بھی تھے۔ دوسرے دن صبح میں نے مجسٹریت ضلع کو جس نے یہ حکم جاری کیا تھا خط لکھا جس میں ان کے حکم رسید دی اور ان کو اطلاع دی کہ میں ان سے اس بات کی ہدایات لینے کا قصد نہیں رکھتا کہ کروں اور کیا نہ کروں، میں اپنے معمولی طریق پر اپنا معمولی کام کرتا رہوں گا اور اسی کام کے سلسلہ میں میرا ارادہ ہے کہ جلد بمبئی واپس جاؤں کہ وہاں گاندھی جی سے ملوں اور مجلس عاملہ کے جلسہ میں شریک ہوں جس کا میں سکرٹر ہوں۔

اب ایک نئے مسئلہ کا سامنا تھا۔ صوبہ کی کانفرنس کا جلسہ اسی ہفتہ اٹاوہ میں ہونا مقرر تھا۔ میں بمبئی سے اس ارادہ سے آیا تھا کہ جلسہ کو ملتوی کرنے کی رائے دوں گا اس لئے کہ اس کی تاریخیں گاندھی جی کے پہنچنے کی تاریخوں سے ٹکرتی تھیں اور اس لئے بھی کہ میں حکومت سے مقابلہ کو بچانا چاہتا تھا۔ لیکن میرے الہ آباد واپس آنے سے پہلے ہمارے صدر شیروانی کے نام صوبہ کی حکومت کا ایک تاکیدی پیام پہنچ چکا تھا۔ ان سے دریافت کیا گیا تھا کانفرنس میں دیہی مسئلہ پر بحث ہوگی یا اس لئے کہ اگر بحث ہونے والی ہو تو حکومت کانفرنس ہی کو روک دے۔ یہ بات تو سب جانتے تھے کہ کانفرنس کا خاص مقصد ہی دیہی مسئلہ پر بحث نہ کرنا تو حماقت اور اپنے کو معطل کر دینے کی انتہا ہوتی۔ اور بہر حال ہمارے صدر کو یا اور کسی شخص کو یوں یہ اختیار تھا ہی نہیں کہ کانفرنس کو یوں پہلے سے پابند کر دے۔ حکومت کی دھمکی سے بالکل قطع نظر ہم میں سے بعض کا ارادہ خود کانفرنس کو ملتوی کرا دینے کا تھا۔ مگر اب جو دھمکی ملی تو بات اور ہوگئی۔ ایسے معاملوں میں ہم میں سے اکثر ذرا ضدی واقع ہوئے تھے اور یہ خیال کہ حکومت یوں جو چاہتی ہے کرواتی ہے کچھ خوش آئند نہ تھا۔ مگر بہت کچھ دلیل و بحث کے بعد ہم نے فیصلہ یہی کیا کہ اپنے غرور کو دبا جائیں اور کڑوا گھونٹ پی ہی لیں، کانفرنس کو ملتوی کر دیں۔ یہ اس لئے کیا کہ ہم سب جانتے تھے، کہ جن داموں بھی ممکن ہو گاندھی جی آنے تک اس جھگڑے کو جو شروع تو ہو ہی گیا تھا بڑھنے نہ

دیں۔ ہم یہ نہ چاہتے تھے کہ وہ جب آئیں تو انھیں ایک ایسی صورت حال کا سامنا ہو جس میں وہ رہنمائی کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لے سکیں۔ ہماری طرف سے کانفرنس کے ملتوی کر دیئے جانے کے باوجود اٹاوہ میں پولیس اور فوج کا بڑا مظاہرہ ہوا، کچھ اکے دکے نمائندے بھی گرفتار کئے گئے اور فوج نے سودیشی نمائش پر قبضہ کرلیا۔

شیروانی نے اور میں نے ۲۶ دسمبر کی صبح کو الہ آباد سے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ شیروانی کو مجلس عاملہ نے خاص طور پر بلایا تھا کہ صوبہ متحدہ کے حالات پر مشورہ کرے۔ ہم دونوں کو آرڈیننس کے ماتحت حکم مل چکا تھا کہ الہ آباد شہر سے باہر نہ جائیں۔ کہا یہ جاتا تھا کہ آرڈیننس الہ آباد اور صوبہ متحدہ کے بعض اور ضلعوں کے دیہات میں لگان روکنے کے کام کے خلاف نافذ کیا گیا ہے، اس لئے یہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آسکتی تھی کہ حکومت ہمیں ان دیہی علاقوں میں نہ جانے دے لیکن یہ بات تو صاف تھی کہ ہم بمبئی شہر میں یہ دیہی شورش پر پا نہ کر سکتے اور اگر آرڈیننس کا مقصد واقعی دیہات کی شورش سے متعلق تھا تو ہمارے صوبہ سے باہر جانے پر تو اور خوش ہونا چاہئے تھا۔ جب سے آرڈیننس نافذ ہوا تھا ہم لوگوں کا طرز عمل برابر مدافعت کا تھا اور اگر چہ کہیں کہیں انفرادی طور پر احکام کی نافرمانی ہوئی تھی مگر فی الجملہ ہم نے اس نئے قانون سے قوت آزمائی کو ٹالا تھا۔ جہاں تک صوبہ کی کانگریس کا تعلق تھا یہ بات بالکل صاف تھی کہ یہ کم سے کم اس وقت حکومت سے لڑائی کرنے سے بچنا یا اس کو ملتوی کرنا چاہتی تھی۔ شیروانی اور میں بمبئی اس لئے جا رہے تھے کہ وہاں گاندھی جی اور مجلس عاملہ ان معاملات پر غور کریں گے اور کسی کو خبر نہ تھی، کم سے کم مجھے تو ہرگز یقین نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا ہوگا؟

ان سب باتوں سے تو یہ خیال ہوتا تھا کہ ہمیں بمبئی جانے دیا جائے گا اور نظر بندی کے حکم کی محض ضابطہ کی نافرمانی کو کم سے کم اس وقت حکومت گوارا کرلے گی۔ مگر دل کچھ اور ہی گواہی دیتا تھا۔

ریل گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ صبح کے اخبارات میں صوبہ سرحد کے نئے آرڈیننس کا ذکر اور عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب کی گرفتاری کی خبر پڑھی۔ تھوڑی دیر بعد ہماری گاڑی بمبئی میل، یکا یک بیچ کے ایک اسٹیشن ارادت گنج پر کھڑی ہوگئی، جہاں عموماً یہ گاڑی نہیں ٹھہرا کرتی تھی اور پولیس کے افسر ہمیں گرفتار کرنے کے لئے گاڑی میں چڑھ آئے۔ جیل خانے کی ایک گاڑی لائن کے پاس کھڑی تھی، شیروانی اور میں قیدیوں کی اس بند گاڑی میں سوار ہوئے اور ہچکولے کھاتے نینی پہنچے۔ انگریز پولیس کپتان جس نے ہمیں ۲۶ دسمبر کی صبح کو کہ تحفہ تحائف دینے کا دن ہوتا ہے گرفتار کیا تھا کچھ گم سم اور افسردہ افسردہ سا تھا۔ شاید ہم نے اس غریب کا بڑا دن خراب کیا۔

غرض ہم یوں قید خانہ کو چلے۔ بقول شاعر،

"راحت و شادمانی سے اب ذرا منھ موڑو
اور کچھ دن کرب والم کے سانس کھینچو،

گرفتاریاں۔تعزیری قوانین اور ضبطیاں

ہماری گرفتاری کے بعد گاندھی جی یورپ سے بمبئی پہنچے۔اس وقت انھیں تازہ واقعات کا علم ہوا۔لندن میں انھوں نے یہ سن لیا تھا کہ بنگال میں تعزیری قانون نافذ ہوگیا ہے اور اس سے انھیں سخت تشویش تھی، لیکن یہاں پہنچ کر انھیں علم ہوا کہ صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد کے تعزیری قوانین کی شکل میں ان کے لئے بڑے دن کے چند تحفے اور موجود ہیں اور دونوں صوبوں میں ان کے عزیز ترین رفقاء گرفتار کر لئے گئے ہیں۔معاملہ حد سے گذر چکا تھا اور صلح کی تمام امیدیں ختم ہوگئی تھیں۔پھر بھی انھوں نے اس گتھی کو سلجھانے کی آخری کوشش کی اور لارڈ ولنگڈن وائسرائے سے درخواست کی کہ مجھے ملاقات کا موقع دیا جائے۔نئی دہلی سے ان کے پاس یہ جواب پہنچا کہ چند شرائط کے ماتحت ملاقات ممکن ہے۔ میرے پاس وائسرائے کے جواب کی نقل موجود نہیں ہے۔لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے شرائط یہ تھیں کہ بنگال صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد کے تازہ واقعات، تعزیری قوانین اور ان کے ماتحت گرفتاریوں کا اگر آپ کوئی ذکر نہ کریں تو تشریف لا سکتے ہیں۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گاندھی جی یا کسی کانگریسی رہنما کے لئے ان ممنوعہ مسائل کو چھوڑ کر جن سے سارے ملک میں ایک ہیجان برپا تھا وائسرائے سے باضابطہ گفتگو کرنے کا اور کون سا موضع باقی رہ جاتا تھا۔اب یہ صاف ظاہر تھا کہ حکومت ہند کانگریس کو کچل ڈالنے پر تلی ہوئی ہے اور اس سے کوئی معاملہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ورکنگ کمیٹی کو اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ سول نافرمانی پھر شروع کر دے۔اس کے ممبر جانتے تھے کہ ان کے لئے ہر وقت گرفتاری کا خطرہ ہے اس لئے فطرتاً ان کی خواہش تھی کہ جیل میں جانے سے پہلے قوم کے سامنے ایک صحیح راہ عمل پیش کر دیں۔پھر بھی سول نافرمانی کی قرارداد محض عارضی طور پر منظور کی گئی اور گاندھی جی نے وائسرائے سے ملنے کی ایک اور کوشش کی۔انھوں نے وائسرائے کو دوسرا تار بھیجا کہ مجھے غیر مشروط

ملاقات کا شرف بخشا جائے۔ اس کے جواب میں حکومت نے گاندھی جی اور کانگریس کے صدر دونوں کو گرفتار کرلیا اور وہ بٹن دبا دیا جس سے سارے ملک میں تشدد کی مشین کام کرنے لگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چاہے اور کوئی لڑائی کا خواہش مند ہو یا نہ ہو لیکن حکومت لڑنے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔

ہم جیل میں تھے اور یہ تمام خبریں مبہم اور بے ربط شکل میں ہمارے پاس پہنچی تھیں۔ ہمارا مقدمہ نیا سال شروع ہونے تک ملتوی ہوگیا تھا۔ اس لئے زیر سماعت حوالاتی کی حیثیت سے ہم عام قیدیوں کے مقابلہ میں باہر والوں سے زیادہ مل سکتے تھے۔ ہم نے سنا کہ ملک میں یہ اہم بحث چھڑ یہوئی ہے' کہ آیا وائسرائے نے ملاقات سے انکار کر کے غلطی کی یا نہیں؟ گویا ان کے ملاقات کرنے یا نہ کرنے پر ہر بات کا دارومدار تھا۔ اس وقت ملاقات کا یہ مسئلہ تمام دوسرے معاملوں پر چھا گیا تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ اگر لارڈ ارون یہاں موجود ہوتے تو ہرگز انکار نہ کرتے اور اگر وہ گاندھی جی مل بیٹھتے تو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو جاتا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستانی اخبارات کتنی سطحی نظر سے اس مسئلہ کو دیکھ رہے ہیں اور اصل حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ ہندوستانی قوم پرستی اور برطانوی سامراج دراصلد و متضاد چیزیں ہیں اس لئے ان دونوں کا ٹکرانا ضروری ہے۔ تو کیا یہ جنگ چند افراد کے ذاتی رویہ کپر منحصر ہے؟ کیا ان دونوں تاریخی قوتوں کی ٹکر باہمی اخلاق اوور دل آویز مسکراہٹ سے رک سکتی ہے؟ گاندھی جی نے ایک خاص طرز عمل اس وجہ سے اختیار کیا کہ ہندوستان کی قومی تحریک خودکشی نہیں کرسکتی تھی۔ یعنی زندگی اور موت کے معاملہ میں بدیشیوں کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو تیار نہ تھی۔ اسی طرح ہندستان کے برطانوی وائسرائے نے ایک دوسرا رویہ اس لئے اختیار کیا کہ قومی تحریک کا مقابلہ اور برطانوی مفاد کی حفاظت کی کوشش کرے۔ پھر اس کا کیا سوال ہے کہ اس وقت کون وائسرائے تھا کون نہیں تھا۔ اگر لارڈ ارون وائسرائے

ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے جو لارڈ ولنگڈن نے کیا۔ کیونکہ دونوں برطانوی سامراج کے آلہ کار تھے اور ذاتی طور پر مقررہ پالیسی میں محض جزوی ترمیم کر سکتے تھے قدیم لارڈ ارون خود اس وقت حکومت برطانیہ کے ایک رکن تھے اس لئے ہندوستان میں حکومت نے جو قدم اٹھایا اس میں وہ بھی شریک تھے۔ ہندوستان میں برطانوی حکمت عملی کے معاملہ میں کسی وائسرائے کو ذاتی حیثیت سے اچھا یا برا کہنا بالکل لغو بات ہے۔ اور ہمارا ان فضولیات کو اہمیت دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو ہم حقیقت حال کو سمجھتے ہی نہیں یا جان بوجھ کر اس سے اعراض کرتے ہیں۔

۴ جنوری ۱۹۳۲ء ایک یادگار تاریخ تھی۔ اس روز دلیل اور بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ صبح تڑکے گاندھی جی اور کانگریس کے صدر ولبھ بھائی پٹیل گرفتار کر لئے گئے اور شاہی قیدی کی حیثیت سے بغیر عدالتی تحقیقات کے نظر بند کر دئے گئے۔ چار نئے تعزیری قانون نافذ ہوئے جن کی رو سے مجسٹریٹوں اور پولیس افسروں کو نہایت وسیع اختیارات مل گئے۔ شہری آزادی کا خاتمہ ہو گیا کیونکہ حکام اپنی مرضی سے افراد کو قید اور املاک کو ضبط کر سکتے تھے۔ گویا سارے ہندستان میں ایک طرح فوجی محاصرے کا اعلان ہو گیا۔ رہی اس محاصرے کی وسعت وشدت' مقامی حکام کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی گئی تھی۔ (۱)

اسی روز صوبہ متحدہ کے ضابطہ اختیار رات ہنگامی کے ماتحت نینی جیل میں ہمارے مقدمہ کی پیشی ہوئی۔ شیروانی کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور ڈیڑھ سو روپے جرمانہ کی سزا ملی اور مجھے دو سال کی قید بامشقت اور پانچ سو روپے جرمانہ (بصورت عدم ادائیگی مزید چھ ماہ) کی سزا ہوئی۔

ہم دونوں کا جرم ایک تھا۔ دونون کو حکم دیا گیا تھا کہ الہ آباد شہر سے باہر نہ نکلیں۔ ایک ساتھ بمبئی جانے کی کوشش کر کے دونون نے یکساں ان کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس کے باوجود ہمین سزائیں مختلف ملیں۔ البتہ ایک فرق ضرور تھا۔

میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ تحریری اطلاع دے دی تھا کہ میں اس حکم کے باوجود بمبئی جانے والا ہوں۔ شیروانی نے اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ لیکن ان کی روانگی کا بھی سب کو علم تھا اور اخباروں میں بھی خبر شائع ہوگئی تھی۔ سزا کا حکم سننے کے بعد ہی شیروانی نے مجسٹریٹ سے ایک نہایت ہی دلچسپ سوال کیا جس سے سارا مجمع کھل کھلا ہنس پڑا اور بیچارہ مجسٹریٹ گھبرا گیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کای مجھے کم سزا دینے میں فرق وارانہ تناسب کا لحاظ رکھا گیا ہے؟

اسی تاریخی دن یعنی ۴ جنوری کو سارے ملک میں بہت سے اہم واقعات پیش آئے م سے تھوڑی دور پر یعنی الہ آباد شہر میں بہت بڑے مجمع کا پولیس اور فوج سے مقابلہ ہوگیا۔ حسب معمول لاٹھی چارج ہوا جس سے بہت سے لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ سول نافرمانی کے قیدیوں سے جیل پھر بھرنے شروع ہو گئے پہلے یہ ڈسٹرکٹ جیلوں میں نینی کے سنٹرل جیل مین بھیجے گئے اور جب وہاں گنجائش نہیں رہی تو دوسری سنٹرل جیلوں کی باری آئی آخر جیل بھر گئے اور بڑے بڑے جیل کیمپ کھولنا پڑے۔

نینی میں ہمارے چھوٹے سے احاطے میں بہت کم لوگ آئے' یعنی صرف میرے پرانے ساتھی نربدا پرشاد' رنجیت پنڈت اور میرے رشتہ کے بھائی موہن لال نہرو۔ چند روز کے بعد بارک نمبر ۶ کی اس چھوٹی سی برادری میں ایک اور مہمان کا اضافہ ہو جن کے آنے سے ہم سب کو بہت تعجب ہوا۔ یہ ہمارے سیلون کے نوجواب دوست برنرڈ لیو وہارے تھے جو حال ہی میں انگلستان سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے۔ میری بہن نے انہیں خوب سمجھا دیا تھا کہ تم مظاہروں میں نہ پڑنا لیکن جوش میں آکر وہ کانگریس کے جلوس میں شریک ہو گئے اور قیدیوں کی گاڑی نے انہین جیل خانہ پہنچا دیا۔ کانگریس کلاف قانون قرار دے دی گئی۔ فہرست میں سب سے اوپر ورکنگ کمیٹی کا نام تھا۔ اس کے بعد صوبوں کی کمیٹیاں اور بے شمار

مقامی کمیٹیاں تھیں۔ کانگریس کے ساتھ ساتھ وہ تمام ادارے بھی خلاف قانون ٹھیرائے گئے جو اس سے کسی قسم کا تعلق رکھتے تھے یا محض اس کے ہمدرد تھے یا انتہا پسند سمجھے جاتے تھے۔ کسان سبھائیں، کاشتکاروں کی انجمنیں' نوجوانون کی انجمنیں' طلبا کے ایسوسی ایشن، انتہاپسند سیاسی ادرے' قومی یونیورسٹیاں اور اسکول' قومی اسپتال' سودیشی ادارے کتب خانے سبھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ فہرست بہت طویل تھی اور ہر بڑے صوبہ کے ذی میں سینکڑوں نام درج تھے۔ سارے ہندوستان کی میزان لگائی جاتی تو یقیناً ہزاروں تک پہنچتی۔ خلاف قانون اداروں کی اتنی زبردست تعداد خود کانگریس اور قومی تحریک کی کامیابی کی ایک روشن دلیل تھی۔

میری بیوی بمبئی میں بیمار پڑی تھیں اور سول نافرمانی میں حصہ لینے کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ میری والدہ اور دونوں بہنیں بہت جلد ایک ایک سال کی سزا پا کر جیل پہنچ گئیں۔ ہمیں نئے آنے والوں کے ذریعہ سے باہر کی تھوڑی بہت خبریں مل جاتی تھیں یا کچھ حال ایک مقامی ہفتہ وار پرچہ سے جو ہمیں پڑھنے کو ملتا تھا معلوم ہو جاتا تھا۔ لیکن باہر کے واقعات کا پورا پرچہ سے جو ہمیں پڑھنے کو ملتا تھا معلوم ہو جاتا تھا۔ لیکن باہر کے واقعات کا پورا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں قیاس سے کام لینا پڑتا تھا۔ کیونکہ ہم جانتے تھے کہ خبروں کا احتساب بڑی سکٹ وے ہوتا ہے اور اخباروں اور خبر رساں ایجنسیوں کو ہمیشہ بھاری سزاؤن کا ڈر لگا رہتا ہے۔ بعض صوبوں میں تو گرفتار ہونے والون یا سزا پانے والون کا نام لکھنا بھی جرم تھا۔

غرض ہم نینی جیل میں باہر کی جنگ سے دور تھے پھر بھی ہمارا دل اسی میں پڑا تھا۔ ہم وقت گزارنے کے لے چرخہ کاتتے' کتابین پڑھتے' دوسرے مشاغل میں مصروف رہتے۔ ادھر اُدھر کی بتیں کرتے لیکن دل میں ہر وقت یہی سوچتے رہتے کہ جیل خانے کی دیواروں کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ غرض ہم اس تحریک سے

جدا ہونے کے باوجود اس میں شریک تھے۔ کبھی انتظار کی خلش دل کو بے چین کرتی کسی غلطی پر غصہ آجاتا' کمزوری یا کمینہ پن کی حرکت سے نفرت ہوتی اور کبھی ہم جذبات سے الگ ہو کر نہایت سکون اور غیر جانبداری سے تمام حالات پر غور کرتے اور یہ سمجھ لیتے کہ جب بڑی بڑی قوتیں کام کر رہی ہوں اور قہر و غضب کی چکیاں چل رہی ہوں تو چھوٹی چھوٹی انفرادی غلطیاں اور کمزوریاں لازمی ہیں۔ ہم سوچتے تھے کہ دیکھیں اس جنگ و جدل' اس شور و شغب' اس دلیرانہ جوش و خروش' اس ظالمانہ جبر و تشدد اور نفرت انگیز بزدلی کا کیا رنگ رہتا ہے اور ان سب چیزوں کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ مستقبل ہم سب کی نظروں سے پوشیدہ تھا اور یہی اچھا تھا' بلکہ ہم قیدیوں کو تو حال کی بھی خبر نہ تھی۔ لیکن اتنا ہم ضرور جانتے تھے کہ ہمیں جنگ و مصیبت اور قربانی کا آج بھی سامنا ہے اور کل بھی رہے گا۔

میتھو آرنلڈ نے کیا خوب کہا ہے۔

''لوگ کل میدان میں نکل کھڑے ہوں گے اور جنگ از سر نو شروع ہو جائے گی۔''

زنتھس (۲) کا سارا میدان خون سے سرخ نظر آئے گا۔

ھکڑ (۲) اور آجکس (۲) پھر میدان میں اتریں گے۔

اور ہیلن (۲) پھر دیوار پر کھڑے ہو کر اس خوں چکاں جنگ میں چمکیں گے۔ کبھی اندھی امیدوں سے ابھریں گے کبھی اندھی مایوسی میں ڈوبیں گے۔

دل و جان سے سعی و عمل میں مصروف ہو جائیں گے مگر یہ پتہ نہ چلے گا کہ ہامرے روح کا کای حشر ہوتا ہے۔

---

(۱) وزیر ہند سر سیمول ہور نے ۲۴ مارچ ۱۹۳۲ء کو دارالعلوم میں یہ اقرار کیا تھا مجھے تسلیم ہے کہ ہم نے جو تعزیری قانون نافذ کئے ہیں وہ نہایت سخت ہیں اور ہندوستانیوں

کی زندگی کے قریب قریب ہر شعبہ پر حاوی ہیں۔''

(۲) یونان کے شاعر ہومر نے ایتھنس اور ٹرائے کا جنگ نامہ لکھا ہے۔ اس میں زنے تھس میدان جنگ کا نام ہے ھکٹر اور آجکس فریقین کے سورما ہیں اور ہیلن وہ عورت ہے جس کی خاطر جنگ ہوئی تھی۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بازی پروپیگنڈا

۱۹۳۲ء کے ابتدائی مہینوں میں۔اور بہت سی عجیب باتوں کے ساتھ ایک یہ بھی تھی کہ برطانوی حکومت دل کھول کر بازاری طرز کے پروپیگنڈے سے کام لے رہی تھی۔چھوٹے بڑے تمام افسر بڑی بلند آہنگی سے دعوے کرتے تھے کہ ہم بڑے نیک ارامن پسند ہیں اور کانگریس بڑی پاپی اور جھگڑالو ہے۔ہم جمہوریت کے حامی ہیں اور کانگریس ڈکٹیٹری کی موید ہے۔اس تقدس کے جوش میں شاید انہیں اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد نہیں رہیں' جیسے تعزیری قوانین کا نفاذ' ہر طرح کی آزادی کا سلب کرلینا' اخباروں اور مطبعوں کا گلا گھونٹنا' بلا مقدمہ چلائے لوگوں کو قید میں ڈال دینا' جائداد اور روپے کی ضبطی یا اسی طرح کی اور بہت سی باتیں جو اُے دن دیکھنے میں آتی تھیں اور شاید وہ یہ بھی بھول گئے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کن اصولون پر قائم ہے۔سرکاری وراء' جو ہمارے ہی ہم وطن تھے' جوش خطابت میں یہ فرماتے تھے کہ کانگریس والے تو اپنے ذاتی اغراض حاصل کرتے ہیں (جیل میں!) اور ہم چند ہزار روپیہ ماہوار کی حقیر تنخواہ پر دن رات قوم کی خدمت کیا کرتے ہیں۔ ماتحت عدالتیں نہ صرف ہمیں بھاری بھاری سزائیں دیتی تھین بلکہ اس موقع پر وعظ و نصیحت بھی فرماتی تھیں اور کبھی کبھی کانگریس اور اس کے کارکنوں کو جی بھر کے گالیں بھی دیتی تھیں۔سر سیموئل ہور نے بھی وزارت ہند کی کرسی پر بیٹھ کر یہ گل افشانی فرمائی تھی کہ کتے بھونکا کرتے ہیں۔ اور قافلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔شاید وہ اس وقت یہ بھول گئے تھے کہ سب کتے تو جیل میں بند تھے اور وہاں آسانی سے بھونک نہیں سکتے تھے اور جو باہر تھے ان کے منہ پر کس کر چھینکا چڑھا دیا گیا تھا۔

سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ کانپور کے فساد کا الزما کانگریس کے سر تھوپا گیا۔ اس خوفناک فساد کی تباہ کاریوں کو بیان کرکے بار بار یہ کہا گیا کہ کانگریس اس کی ذمہ داری ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر صرف کانگریس ہی نے

شرافت ارہمدردی سے کام لیا۔ اس کے ایک لائق ترین فرزند نے امن قائم کرنے کی کوشش میں اپنی جان دے دی اور کانپور کی ہر جماعت اور فرقہ نے اس کا ماتم کیا۔ کانگریس کے کراچی کے اجلاس میں جب یہ خبر پہنچی تو فوراً ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی نے بہت تفصیلی تحقیقات کی مہینوں کی محنت کے بعد اس نے ایک ضخیم رپورٹ تیار کی جسے حکومت نے فوراً ممنوع قرار دیا اس کے تمام مطبوعہ نسخے ضبط کر لئے اور شاید انہیں ضائع کر دیا۔ ہمارے تحقیقات کے نتائج کو اس طرح دبا دینے کے باوجود سرکاری معترفین اور انگریزوں کے اخبارات برابر یہی رٹ لگائے گئے کہ یہ فساد کا کانگریس کی وجہ سے ہوا۔

ایک دن اس معاملہ اور دوسرے معاملات کی حقیقت آشکارا ہو کر رہے گی۔
لیکن بعض اوقات جھوٹ بہت دن تک سچ سے آگے آگے رہتا ہے۔

جھوٹ اپنا کام اور اسی کا بول بالا ہو گا۔
مگر اس وقت جب اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

اس وقت جنگ کی سی حالت تھی اس لئے شاید جذبات کا یہ ہیجان ایک قدرتی چیز تھی اور یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ حکومت سچائی یا ضبط سے کام لے گی مگر پھر بھی ہیجان کی یہ شدت حیرت انگیز تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہندوستان کی حکمران جماعت کے اعصاب کی کیا حالت تھی اور اس نے کس طرح اپنے جذبات کو ایک مدت سے دبا رکھا تھا۔ غالباً اس کے اس غیظ و غضب کا سبب ہمارا کوئی قول یا فعل نہیں تھا۔ بلکہ خود اس کا یہ خوف کہ سلطنت ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ جن حکمرانوں کو اپنی قوت پر اعتماد ہوتا ہے وہ اس طرح بدحواس نہیں ہو جایا کرتے، تصویر کا دوسرا رخ اس رخ سے بہت مختلف تھا دوسری طرف خاموشی طاری تھی یہ کوئی اختیاری اور پروقار خاموشی نہیں تھی بلکہ قید خانہ کی، خوف کی، اور عالمگیر احتساب کی خاموشی تھی۔ اگر اس طرح جبر و تشدد نہ کیا جاتا تو ممکن ہے دوسری طرف بھی یہی

ہیجان نظر آتا اور اسی طرح مبالغے اور بدزبانی سے کام لیا جاتا۔ البتہ شہروں سے کبھی کبھی شائع ہوتے تھے۔

انگریزوں کے جو اخبار ہندوستان میں ہیں' وہ بھی اس بازاری پروپیگنڈے میں بڑے شوق سے شریک ہو گئے اور ان خیالات کو علی الاعلان ظاہر کرنا شروع کر دیا جو شاید مدت سے وہ اپنے سینوں میں دبائے بیٹھے تھے۔ عموماً انھیں اپنی تحریر میں ذرا احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ ان کے ناظرین میں ہندوستانیوں کی تعداد بہت کافی ہے لیکن اس طوفان میں یہ احتیاط بھی بہہ گئی۔ اور ہمیں انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے دلوں کی گہرائی کی ایک جھلک نظر آ گئی۔ ہندوستان میں ایک ایک کر کے بیشتر انگلو انڈین اخبار ختم ہو چکے ہیں۔ صرف تھوڑے سے باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن جو باقی ہیں وہ نہایت اعلیٰ معیار کے اخبار ہیں۔ ان کا خبروں کا انتظام بھی نہایت معقول ہے اور ترتیب اور طباعت بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ دنیا کی سیاست کے متعلق ان میں جو افتتاحیہ مقالے شائع ہوتے ہیں گو انکا نقطہ نظر رجعت پسندانہ ہوتا ہے لیکن بڑی قابلیت سے لکھے جاتے ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنے والے کو اپنے موضوع پر پورا عبور حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اخباری حیثیت سے وہ ہندوستان میں سب سے ممتاز ہیں۔ لیکن ہندوستان کے سیاسی مسائل میں وہ اپنی سطح سے بہت نیچے گر جاتے ہیں اور ایسی یک طرفہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور جب قومی تحریک کا زور ہوتا ہے تو یہ جانبداری وحشت اور سوقیانہ پن کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ حکومت ہند کی آواز کو دہرانے لگتے ہیں اور اس مسلسل پروپیگنڈے میں ضبط اور احتیاط کے تمام پردے اٹھا دیتے ہیں۔

ان چند منتخب اینگلو انڈین اخباروں کے مقابلے میں ہندوستانی اخبار عموماً ادنیٰ قسم کے ہیں' ان کی مالی حالت خراب ہے اور ان کے مالک اسے سنبھالنے کی کوشش

بھی نہیں کرتے۔ ان کا روز کا خرچ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے اور بیچارے ادارتی عملے کو بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ان کی طباعت وغیرہ خراب ہوتی ہے اور اشتہارات بھی نامناسب قسم کے ہوتے ہیں' زندگی کے عام مسائل اور سیاسیات میں یہ والہانہ روش رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ہماری قوم جذبات پرست واقع ہوئی ہے کچھ یہ کہ (جہاں تک انگریزی اخباروں کا تعلق ہے) انگریزی ان کے لئے بدیسی زبان ہے اور اس میں ایسا طرز بیان اختیار کرنا کہ سادگی کے ساتھ زور بھی ہو' آسان نہیں ہے۔ لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ ایک عرصہ تک محکوم رہتے رہتے اور جبر و تشدد سہتے سہتے ہمارے جذبات گھٹ کر اور دب کر رہ گئے ہیں اور جب ذرا سا موقع ملتا ہے ابل پڑتے ہیں۔

ہندوستانیوں کے انگریزی اخباروں میں طباعت ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے مدراس کا ہندو سب سے بہتر ہے۔ اس کی وہ شان ہے جو ایک ثقہ اور تقدس مآب بوڑھی بن بیاہی عورت کی ہوتی ہے کہ جہاں کسی نے کوئی ایسا ویسا لفظ زبان سے نکالا اور وہ حیا اور غصہ کے مارے آپے سے باہر ہوگئی۔ ہندو خاص طور پر اوسط طبقے کے شہریوں کا پرچہ ہے اور اس کا کاروبار خوب جما ہوا ہے۔ زندگی کے تاریک پہلو' حیات کی کش مکش اور نشیب و فراز سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ بہت سے اعتدال پسند اخباروں کا معیار بھی یہی ثقاہت اور تقدس مآبی ہے۔ یہ رنگ تو وہ پیدا کر لیتے ہیں لیکن ہندو کی اور خصوصیات نہیں پیدا کر سکتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے روکھے پھیکے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ حکومت نے اس حملہ کے لئے عرصہ سے تیاری کی تھی اور چاہتی تھی کہ پہلی ہی ضرب نہایت شدید اور موثر ہو۔ ۱۹۳۰ء میں اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ نئے نئے تعزیری ضابطوں سے تحریک کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکے۔ گویا اس وقت پیش قدمی کانگریس کی طرف سے ہوئی تھی اور حکومت مدافعت کرتی تھی۔ ۱۹۳۴ء کا

طریقہ اس کے بالکل برعکس تھا یعنی اب حکومت نے چاروں طرف سے حملہ شروع کردیا۔ سارے ملک کے لئے اور اس کے علاوہ علیحدہ علیحدہ تمام صوبوں کے لئے طرح طرح کے تعزیری ضابطے نافذ کئے اور ان کی رو سے حکام کو دنیا بھر کے اختیارات دیدئے۔ ادارے خلاف قانون قرار دیئے گئے۔ عمارتیں، جائداد، موٹریں اور بنک کی رقمیں ضبط کرلی گئیں۔ جلسہ اور جلوس کی ممانعت کردی گئی اور اخبار اور مطبعے پوری طرح جکڑ دیئے گئے۔ دوسری طرف بہ خلاف ۱۹۳۰ء کے گاندھی جی قطعی رائے تھی کہ سول نافرمانی فی الحال شروع نہ کی جائے۔ اور ورکنگ کمیٹی کے اراکین بھی زیادہ تر ان کے ہم خیال تھے۔ بعض لوگوں کا اور میرا بھی یہی خیال تھا کہ چاہے ہم جنگ کو کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں مگر جنگ یقینی ہے اس لئے ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہئے، صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد میں کشمکش برابر بڑھ رہی تھی اس لئے لوگوں کا ذہن آنے والی جنگ کی طرف خود بخود منتقل ہونے لگا تھا۔ لیکن بحیثیت مجموعی تعلیم یافتہ اور اوسط طبقہ اس وقت جنگ کے خیال میں نہ تھا۔ گو وہ اس کو بالکل ناممکن نہیں سمجھتا تھا۔ نہ جانے کیوں لوگوں کو یہ امید بندھ گئی تھی کہ گاندھی جی کی واپسی پر جنگ ٹل جائے گی ظاہر ہے کہ خواہش نے خیال کی صورت اختیار کرلی تھی۔

غرض ۱۹۳۲ء کے شروع میں حکومت نے سراسر پیش قدمی کی اور کانگریس اول سے آخر تک مدافعت کرتی رہی، تعزیری ضوابط کے یکا یک نافذ ہوجانے اور سول نافرمانی کے شروع ہوجانے سے اکثر مقامی کارکن ہکا بکا رہ گئے۔ پھر بھی کانگریس کی دعوت پر چاروں طرف سے لبیک کی آواز بلند ہوگئی اور ہر طرف سے سول نافرمانی کرنے والے اٹھ آئے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ۱۹۳۲ء حکومت برطانیہ کا ۱۹۳۰ء سے کہیں زیادہ مضبوطی سے مقابلہ کیا گیا کیونکہ ۱۹۳۰ء میں عموماً سب کہیں اور خصوصاً بڑے بڑے شہروں میں نمود و نمائش زیادہ تھی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اگرچہ ۱۹۳۲ء میں لوگوں نے پہلے سے زیادہ استقلال کا ثبوت دیا اور غیر معمولی طور پر

پر امن رہے لیکن ۱۹۳۰ء کے مقابلہ میں جوش بہت کم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کو مجبوراً جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ ۱۹۳۰ء کی جنگ میں ایک خاص شان تھی جواب باقی نہیں رہی تھی۔ حکومت نے اپنی پوری طاقت سے کانگریس کو آزادی عمل یا پیش قدمی کا کوئی موقع نہیں ملا۔ پہلے ہی وار نے اسے اور اس کے اوسط طبقہ کے حامیوں کو جو اس کے خاص ہمدرد تھے بیکار کر دیا۔ اسکی چوٹ ان کی جیبوں پر پڑی اور انھیں یقین ہو گیا کہ جو کوئی سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہو گا یا کسی طرح اس کی مدد کرے گا اسے نہ صرف اپنی آزادی سے بلکہ شاید تمام املاک سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ صوبہ متحدہ میں ہم پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا کیونکہ یہاں تو کانگریس غریبوں کی جماعت ہے البتہ بمبئی جیسے بڑے بڑے شہروں میں املاک کی ضبطی کے خوف نے بڑا اثر ڈالا کیونکہ اس سے تاجروں کا طبقہ تو بالکل برباد ہو جاتا اور اونچے پیشوں کے لوگوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا۔ محض اس دھمکی نے (جو کبھی عمل میں بھی لائی گئی) شہر کے تمام کھاتے پیتے لوگوں کو سن کر دیا چنانچہ بعد میں مجھے ایک سیدھے سادے لیکن خوش حال تاجر کا ایک عجیب واقعہ معلوم ہوا۔ اس بچارے کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا بجز اس کے کہ شاید وہ کبھی کچھ چندہ دے دیتا تھا۔ مگر پولیس نے اسے دھمکی دی کہ تم پر پانچ لاکھ روپیہ جرمانہ کیا جائے گا اور لمبی سزا الگ ہو گی۔ اس قسم کی دھمکیاں بہت عام تھیں۔ اور یہ خالی خولی دھمکیاں نہ تھیں کیونکہ اس وقت پولیس کا راج تھا اور آئے دن دیکھنے میں آتا تھا کہ وہ گرجتی نہیں بلکہ برستی بھی ہے۔

میرے نزدیک حکومت کے اس رویہ پر کسی کانگریسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے گو اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت نے اس انتہائی پر امن تحریک کے خلاف جو جبر و تشدد اختیار کیا وہ تہذیب کے ہر معیار سے گرا ہوا اور سخت قابل اعتراض تھا۔ اگر ہم عملی جدوجہد اور انقلابی طریقے اختیار کریں گے تو چاہے وہ کتنے ہی پر امن کیوں نہ ہوں ان کا مقابلہ ضرور ہو گا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انقلاب کا

کھیل نہیں کھیلا جا سکتا۔ لیکن بعض حضرات انقلاب بھی چاہتے ہیں اور مقابلہ سے بھی بچتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ جو شخص انقلابی جدوجہد کی راہ میں قدم رکھنا چاہتے ہے اسے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ کھاتے پیتے خوش حال لوگ بہت کم انقلاب پسند ہوتے ہیں گو ان میں سے ایک آدھ ایسے بھی نکل آتے ہیں، وہ حضرات جو دنیاوی عقل رکھتے ہیں، انھیں بیوقوف سمجھتے ہیں اور ان پر اپنے سے غداری کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔

عام لوگوں کو جن پر قومی تحریک اصل میں منحصر تھی دبانے کے لئے حکومت کو اور تدبیروں سے کام لینا پڑا۔ اس لئے کہ ان کے پاس نہ موٹریں تھیں نہ بینکوں میں رقم تھی نہ کوئی اور ایسی املاک تھیں جن پر قبضہ کیا جا سکتا۔ تحریک کو دبانے کے لئے حکومت نے طرح طرح سختیاں شروع کیں اور ان کا ایک دلچسپ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حضرات بھی جو (بقول ایک مصنف کے جس کی کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے) ''سرکاری آدمی'' کہلاتے ہیں، خوب جھنجوڑے گئے۔ ان میں سے بعض نے یہ سمجھ کر نہ جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھے کچھ دن سے کانگریس سے لگاوٹ کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ بھلا حکومت اسے کب برداشت کرنے والی تھی۔ اس کے لئے مجہول وفاداری کافی نہیں تھی۔ بقول فریڈرک کوپر کے جو ۱۹۵۷ء کی شورش کے سلسلہ میں مشہور ہیں، حکومت ''کامل عملی اور ثبوتی وفاداری چاہتی تھی۔ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ رعایا کی رواداری کے برتے پر قائم رہنے'' ایک سال پہلے مسٹر لائڈ جارج نے اپنے پرانے رفقاء کار یعنی برطانوی لبرل پارٹی کے لیڈروں کے متعلق جو ''نیشنل گورنمنٹ'' میں شامل ہو گئے تھے یہ فرمایا تھا کہ وہ ''گرگٹ کی طرح جیسا موقع دیکھتے ہیں ویسا ہی رنگ بدل لیتے ہیں'' ہندوستان کے نئے حالات میں اب غیر جانبداری کا رنگ نہیں چل سکتا تھا (اس لئے ہمارے بعض ہم وطن وفاداری کے گہرے اور شوخ رنگوں میں جو حکومت کو مرغوب تھے، ڈوب گئے اور بڑی دھوم

دھام سے ہمارے حکمرانوں سے اظہار محبت کرنے لگے۔ انھیں تعزیری ضوابط، فوجی قواعد، مغرب کے بعد گھر سے نہ نکلنے کے احکام' اور دوسری بے شمار مخالفتوں اور دوسری بے شمار مخالفتوں اور مزاحمتوں کا تو کوئی خوف تھا نہیں' کیونکہ سرکاری طور پر اعلان ہو چکا تھا کہ یہ سب کچھ باغیوں اور مخالفوں کے لئے ہے' وفاداروں کے خوف کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ مزے سے بیٹھے اس شور اور ہنگامے کا تماشہ دیکھتے تھے' جو چاروں طرف برپا تھا۔ اور اس خوف و ہراس سے ذرا بھی متاثر نہ تھے جو ان کے بہت سے ہم وطنوں پر طاری تھا۔ گویا وہ '' وفادار چرواہے'' کی ہیروئن '' گلو'' کے ہم زبان ہو کر کہتے تھے۔

ایک چیز کا تو مجھے خوف ہی نہیں
یعنی مجھ پر دست درازی کرنا ناممکن ہے
کیونکہ میں تو پہلے سے راضی ہوں۔

نہ جانے کیوں حکومت کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ کانگریس خاص کر کے عورتوں کو جیل بھیجنا چاہتی ہے اس امید میں کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے گا اور انھیں معمولی سزائیں ملیں گی۔ یہ محض احمقانہ خیال تھا۔ دنیا میں کوئی بھی اپنی عورتوں کو جیل میں جھونکنا نہیں چاہتا۔ عموماً عورتوں نے اپنے والد' خاوند یا بھائیوں کی مرضی کے خلاف' یا کم سے کم بغیر ان کی خوشی کے اس تحریک میں حصہ لیا۔ بہر حل حکومت نے عورتوں کو لمبی لمبی سزائیں دے کر اور جیل خانہ میں ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کر کے اس کی انتہائی کوشش کی کہ وہ ہمت ہار بیٹھیں۔ میری بہنوں کی گرفتاری اور سزایابی کے بعد ہی چند پندرہ سولہ برس کی لڑکیاں الہ آباد میں غور کرنے کے لئے جمع ہوئیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ انھیں دنیا کا کوئی تجربہ نہ تھا لیکن وہ جوش سے سرشار تھیں اور انھیں مشورہ کی ضرورت تھی۔ وہ ایک نجی مکان میں جمع تھیں کہ انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اور ہر ایک کو دو سال قید سخت کی سزا دے دی گئی۔ یہ تو بہت معمولی

سا واقعہ تھا اسی قسم کے متعدد واقعات ہندوستان کے کونے کونے میں آئے دن ہو رہے تھے۔ جن عورتوں اور لڑکیوں کو تحریک کے سلسلہ میں سزا ہوگئی انہیں جیل خانہ میں مردوں سے زیادہ مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ میں نے بہت سے تکلیف دہ واقعات سنے ہیں لیکن سب سے عجیب سرگزشت جو میری نظر سے گزری میری بہن (میڈلین سلیڈ) کی ترتیب دی ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے اپنے اور سول نافرمانی کی دوسری قیدی عورتوں کے بمبئی جیل کے تجربے درج کئے تھے۔

صوبہ متحدہ میں ہماری تحریک کا زیادہ زور دیہاتی علاقہ میں تھا۔ کسانوں کی طرف سے کانگریس حکومت پر برابر دباؤ ڈالتی رہی تھی۔ اس لئے حکومت نے خاص رقم کی چھوٹ کا وعدہ کرلیا تھا اگرچہ ہمارے نزدیک وہ کافی نہ تھی۔ ہماری گرفتاری کے بعد ہی اور چھوٹ کا اعلان کیا گیا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ یہی اعلان ذرا پہلے نہ کیا گیا ورنہ حالات میں بہت بڑا فرق پڑ جاتا۔ ہم ہرگز بے سوچے سمجھے اس کی مدد نہ کر سکتے لیکن دراصل حکومت کو تو یہ فکر تھی کہ اس چھوٹ کا سہرا کانگریس کے سر نہ ہو۔ اس لئے کہ ایک طرف تو اس نے کانگریس کو کچلنے کی کوشش کی اور دوسری طرف کسانون کو خاموش کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ چھوٹ دی۔ ہمارا یہ بھی اندازہ ہے کہ جہاں کہیں کانگریس کا سب سے زیادہ زور پڑا تھا وہیں سب سے زیادہ چھوٹ ملی۔

اگرچہ بہت معقول چھوٹ دی گئی تھی لیکن اس سے کسانوں کی مشکلات کا حل نہیں ہوا البتہ انہیں کچھ سہولت ضرور ہوگئی۔ گویا حکومت نے کسانوں کی مخالفت کی شدت میں کمی کر دی جس سے ملک کی عام تحریک وقتی طور پر کچھ کمزور پڑ گئی۔ اس تحریک کی وجہ سے یوپی کے ہزاروں کسانون پر طرح طرح کی آفتیں نازل ہوئی تھیں جن سے بہت سے غریب بالکل تباہ ہو گئے تھے۔ اسی تحریک کی وجہ سے لاکھوں کسانوں کو اس وقت جو زیادہ سے زیادہ چھوٹ مل سکتی تھی مل گئی اور (سول

نافرمانی کے شدائد سے قطع نظر) وہ زبدرست پریشانیوں سے بچ گئے۔ ان چھوٹے چھوٹے وقتی فائدوں سے کسانون کا کچھ زیادہ کام نہیں چلا' لیکن اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ جو کچ بھی ملا وہ ان کوششوں کا نتیجہ تھا جو کسانون کی حمایت میں صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی برابر کرتی رہی تھی۔ عارضی طور پر تمام کسانوں کو اس سے فائدہ پہنچا لیکن ان میں جو سب سے بہادر تھے وہ اس جنگ میں کام آ گئے۔

دسمبر ۱۹۳۱ء میں جب صوبہ متحہد میں خاص تعزیری ضابطہ نافذ ہوا تو اس کے ساتھ ایک تو جھپسی بیان بھی شائع ہوا۔ اس بیان میں' اس کے علاوہ اور بیونوں میں بھی جو دوسرے تعزیری ضوابط کے ساتھ شائع ہوئے بہت کچھ جھوٹ سچھ درج تھا۔ جس سے پروپیگنڈے کا کام لینا مقصود تھا یہ بھی اس ابتدائی بازاری پروپیگنڈے کا ایک جزو تھا اور ہمیں اس کا موقع بھی حاصل نہ تھا کہ ہم اس کا جواب دیں یا اس سفید جھوٹ کی تردید کر سکیں۔ البتہ ایک مرتبہ شیروانی پر اس طرح کا جھوٹ تراشا گیا تھا تو انہوں نے اپنی گرفتاری سے پہلے اس کی تردید کر دی تھی۔ حکومت کے ان مختلف بیانوں اور معذوروں کا مطالعہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ حکومت کتنی بوکھلائی ہوئی تھی اور اس کے حواس کس حد تک جواب دے ہو چکے تھے۔ کل اتفاق سے میں شاہ اسپین چارلس سوم کا ایک فرمان پڑھ رہا تھا جس کی رو سے انہوں نے یسوعی فرقے کو اپنی سلطنت سے نکالنے کا حکم صادر فرمایا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے خواہ مخواہ حکومت ہند کے تعزیری ضوابط اور ان وجوہ کا خیال آ گیا جو ان کی تائید میں پیش کی گئی تھیں۔ شاہ چارلس نے فروری ۱۷۶۷ء میں میں یہ فرمان جاری کیا تھا اور اس میں اپنے فعل کو اس طرح حق بجانب ٹھیرایا تھا کہ ''رعایا میں فرمانبرداری' امن و امان اور عدل و انصاف برقرار رکھنے کے سلسلے میں میری جانب پر جو فرض عاید ہوتا ہے اس کی وجہ سے' نیز اور دوسری فوری جائز اور ضروری وجوہ کی بنا پر جو ایں جانب کے سینہ میں محفوظ رہیں۔ ایں جانب یہ فرمان نافذ کرنے پر مجبور ہوئے

ہیں۔

اسی طرح تحریری ضوابط کی اصل وجوہ وائسرائے کے سینہ میں یا ان مشیروں کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ اگرچہ ہر شخص انہیں جانتا تھا۔ سرکاری طور پر جو وجوہ بیان کی گئیں ان سے ہمیں پروپیگنڈے کی اس نوعیت کا پتہ چلا جو حکومت برطانیہ ہندوستان میں شروع کرنے والی تھی۔ چند ماہ بعد ہمیں معلوم ہوا کہ نیم سرکاری رسائل و اشتہارات بہت بڑی تعداد میں تمام دیہاتی علاقوں میں تقسیم کئے گئے۔ ان میں طرح طرح کی بے سروپا باتیں درج تھیں خصوصاً کانگریس پر یہ اتہام لگایا گیا تھا کہ اس کی وجہ سے زرعی پیداوار کا بھاؤ گر گیا جس سے کسانوں کو سخت نقصان پہنچا۔ یہ تو کانگریس کی انتہائی تعریف تھی۔ کیونکہ اگر وہ ساری دنیا میں کساد بازاری پیدا کر سکتی ہے تو اس کی قوتوں کا کیا ٹھکانا ہے۔ لیکن اس جھوٹ کی بڑے اہتمام کے ساتھ متواتر اشاعت کی گئی تا کہ کانگریس کے وقار کو صدمہ پہنچے،

ان سب باتوں کے باوجود، صوبہ متحدہ کے خاص خاص اضلاع کے کسانوں نے سول نافرمانی کی دعوت کا جو بعض جگہ لازمی طور پر چھوٹ وغیرہ کے مقامی جھگڑوں کے ساتھ گڈمڈ ہو گئی تھی بڑا پر جوخیر مقدم کای ۱۹۳۰ء کے مقابلہ میں اس مرتبہ کسان زیادہ منظم طریقہ سے اور زیادہ بڑی تعداد مین تحریک میں شریک ہوئے۔ شروع شروع میں تو اس میں خاصا خوش دلی کا رنگ تھا۔ میں نے اس قسم کا ایک بہت دلچسپ قصہ سنا ہے۔ ضلع رائے بریلی کے موضع بکولیہ میں پولیس کے کچھ لوگ عدم ادائی لگان کی وجہ سے قرقی لے کر گئے۔ یہ گاؤں بہت خوش حال تھا اور اس کے باشندے ذرا دل والے تھے۔ وہ پولیس اور مال کے افسروں سے بڑے اخلاق سے پیش آئے اور اپنے گھروں کے دروازے کھلے چھوڑ کر خندہ پیشانی سے ان سے کہا کہ جہاں آپ کا جی چاہے تشریف لے جائیے۔ ان لوگوں نے چند مویشی وغیرہ قرق کر لئے۔ اس کے بعد گاؤں والون نے ان افسروں کی پان تمباکو سے

خاطر کی اور یہ بیچارے بہت خفیف اور شرمندہ ہو کر واپس گئے۔ لیکن یہ تو ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ رفتہ رفتہ رواداری کوش دلی اور انسانی شرافت کا یہ جذبہ بہت کم ہو گیا۔ بیچارہ موضع بکولیہ اپنی خوش دلی کی وجہ سے سزا سے نہ بچ سکا اور اسے اپنی دلیری کی سزا بھگتنی پڑی۔

ان اضلاع میں مہینوں لوگوں نے لگان ادا نہیں کیا۔ اور غالباً گرمیوں کے شروع میں تھوڑا بہت لگان پہنچنا شروع ہوا۔ یہاں بڑی بڑی تعداد میں گرفتاریاں بھی ہوئیں۔ لیکن یہ حکومت کی عام پالیسی کے خلاف تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ عموماً خاص خاص کارکنوں اور دیہات کے لیڈروں کو گرفتار کرتی تھی۔ باقی لوگ صرف مار پیٹ کر چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ جیل بھیجنے اور گولی چلانے سے مار پیٹ زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کا حسب ضرورت بار بار اعادہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ دور دراز دیہاتی علاقوں میں ہوتی تھی۔ اس لئے باہر والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس طرح جیل خانوں میں قیدیوں کی تعداد بھی زیادہ بڑھنے نہیں پاتی تھی۔ مار پیٹ کے علاوہ لاتعداد بے دخلیاں اور قرقیاں بھی ہوئیں اور املاک و مویشی بھی کثرت سے فروخت کئے گئے۔ کسان اپنے کلیجہ پر پتھر رکھ کر یہ دیکھتے تھے کہ ان کے پاس جو تھوڑا بہت اساسہ ہے وہ بھی ان سے چھن رہا ہے اور ان کی آنکھ کے سامنے کوڑیوں کے مول بک رہا ہے۔

حکومت نے ہندوستان بھر کی بے شمار عمارتوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی سلسلہ میں اس نے سوراج بھون بھی ضبط کر لیا۔ اس عمارت میں کانگریس کا اسپتال قائم تھا چنانچہ اس کے تمام قیمتی ساز و سامان پر بھی حکومت کا قبضہ ہو گیا۔ چند روز تک تو یہ اسپتال بالکل بند رہا۔ پھر قریب ہی کے ایک چمن میں کھلے میدان میں دوبارہ جاری کر دیا گیا۔ چند روز بعد وہ سوراج بھون کے متصل ایک چھوٹی سی عمارت میں منتقل ہو گیا اور یہاں کوئی دو ڈھائی سال تک جاری رہا۔

یہ افواہ بھی تھی کہ ہمارا سکونتی انند بھون بھی ضبط ہو جائے گا کیونکہ میں نے انکم ٹیکس کا معتد بہ حصہ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ رقم ۱۹۳۰ء میں والد کی آمدنی پر تشخیص ہوئی تھی۔ لیکن انہوں نے سول نافرمانی کی وجہ سے ادا نہیں کی تھی ۱۹۳۱ء میں دہلی کے صلح نامہ کے بعد انکم ٹیکس افسروں سے میری کچھ بحث ہوئی۔ آخر کار میں اسے ادا کرنے کو تیار ہو گیا۔ بلکہ ایک قسط ادا بھی کر دی تھی۔ اس کے بعد ہی تعزیری ضوابط نافذ ہوئے اور میں نے طے کیا کہ اب کوئی رقم ادا نہیں کروں گا۔ مجھے یہ قطعاً نامناسب بلکہ ناجائز معلوم ہوتا تھا کہ کسانوں کو تو میں لگان ادا نہ کرنے کی تلقین کروں اور کود انکم ٹیکس سے میرا دل دکھتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس طرح میری والدہ کو گھر چھوڑنا پڑے گا' ہماری کتابیں' کاغذات اور وہ سازوسامان جو ہمیں بعض ذاتی وجوہ کی بنا پر بہت عزیز تھا' غیروں کے ہاتھ میں چلا جائے گا اور ممکن ہے سب برباد ہو جائے۔ نیز قومی جھنڈا اتار کر یونین جیک لہرا دیا جائے گا بخلاف اس کے گھر ہاتھ سے نکل جانے میں مجھے ایک خوبی بھی معلوم ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ اس طرح میں کسانوں سے جو بیچارے اپنے گھر بار سے محروم کئے جا رہے ہیں نزدیک تر ہو جاؤں گا۔ اور ان کے دل بڑھ جائیں گے۔ تحریک پر یقیناً اس کا بہت اچھا اثر پڑتا لیکن حکومت نے یہ مناسب نہ سمجھا اور ہمارے گھر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ شاید اس نے میری ماں کا کچھ خیال کیا ہو۔ یا شاید یہ صحیح اندازہ کر لیا ہو کہ اس سے سول نافرمانی کو تقویت پہنچے گی۔ کئی مہینہ بعد حکومت کو میرے ریلوے کے چند حصوں کا پتہ چلا اور وہ اس نے انکم ٹیکس کے حساب میں قرق کر لئے میری اور میرے بہنوئی کی موٹریں تو پہلے ہی قرق کر کے فروخت ہو چکی تھیں۔

اس زمانہ میں ایک چیز سے مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ یعنی مختلف مونسپل کمیٹیوں اور پبلک اداروں نے خصوصاً کلکتہ کارپوریشن نے جس میں کانگریس اراکین کی اکثریت بیان کی جاتی تھی اپنی عمارتوں پر سے قومی جھنڈا اتار دیا۔ انہوں نے یہ

حرکت حکومت اور پولیس کے دباؤ سے کی تھی کیونکہ انہیں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم نے حکم کی تعمیل نہ کی تو سخت تدارک کیا جائے گا۔ عدول حکمی کا زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ ہوتا کہ مونسپلٹی کو معطل کر دیا جاتا یا ممبروں کو سزا ہوتی لیکن ادارے جو مستقل حقوق رکھتے ہیں عموماً بزدل ہوتے ہیں اس لئے انہیں وہی کرنا چاہیے تھا جو انہوں نے کیا۔ پھر بھ مجھے اس سے سخت تکلیف ہوئی یہ جھنڈا ہمارے لئے ان چیزوں کا نشان بن گیا ہے جو ہمیں بہت عزیز ہیں اور اس کے سایہ کے نیچے ہم نے بارہا اس کی عزت وقار کو برقرار رکھنے کی قسمیں کھائی ہیں۔ اس لئے اسے اپنے ہاتھ سے اتارنا یا اپنی رضامندی سے اتروانا نہ صرف عہد شکنی بلکہ ہتک حرمت ہے۔ یہ گویا روح کی ذلت اور حق کا انکار یا زبردست کے ڈر سے باطل کا اقرار ہے جن لوگوں نے اس طرح حکومت کے آگے سر جھکا دیا۔ انہوں نے قوم کو ذلیل کیا اور اس کی کوداری کو صدمہ پہنچایا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ انہیں سورما بن کر آگ میں کود پڑنا چاہیے تھا۔ دوسروں کو اس بنا پر الزام دینا بالکل غلط بلکہ حماقت ہے ک وہ صف اول میں کیوں نہیں آئے جیل کیون نہیں گئے مصیبتیں اور نقصان کیوں نہیں اُٹھائے۔ ہر شخص پر بہت سے فرائض اور ذمہ داریوں کا بار ہوتا ہے اور ہر ایک اپنے حالات کو خود بہتر سمجھ سکتا ہے اس لئے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ حکم بن کر اس کا فیصلہ کرے لیکن میدان میں نہ آنا اور چیز ہے۔ اور حق سے یا اس چیز سے جسے انسان حق سمجھتا ہو منہ موڑنا اور بات ہے۔ میونسپلٹی کے ممبروں کو اگر قومی عزت کے خلاف کوئی حکم دیا جاتا اور اس کی خلاف ورزی کی ان میں جرات نہ ہوتی تو انہیں رکنیت سے استعفے دے دینا چاہیے تھا۔ لیکن عام طور پر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنی نشستوں سے لپٹے رہے۔

تھامس مور نے کہا ہے" جس طرح شہد کی مکھیاں پھولوں پر بیٹھ کر بھنبھنانا بند

کر دیتی ہیں۔

اسی طرح دھگ جماعت والے جب وزارت کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو ان کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں''۔

بہر حال ایسے ناگہانی نازک موقع پر جہاں انسان بدحواس ہو جاتا ہے کسی کے رویہ راعتراض کرنا بے انصافی ہے کبھی کبھی بڑے بڑے بہادروں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں جیسا کہ گذشتہ جنگ عظیم میں بارہا دیکھنے میں آیا ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۱۲ء میں جب ٹائٹانک جہاز تباہ ہوا تو بڑے بڑے مشہور لوگوں نے جن کے متعلق خواب میں بھی بزدلی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا جہاز رانوں کو رشوت دے دے کر بچنے کی کوشش کی۔ اور دوسروں کو ڈوبنے کے لئے چھوڑ دیا۔ حال ہی میں جب مورو کاسل جہاز میں آگ لگی اس وقت بھی بڑے شرمناک حالات دیکھنے میں آئے۔ کون جانتا ہے کہ ایسے ناگہانی موقع پر جب ضبط و عقل پر حیوانی جبلت غالب آجاتی ہے خود ہمارا کای عمل ہو۔ اس لئے ہمیں دوسروں کو برا نہیں کہنا چاہئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم صحیح راستہ سے بھٹکنے پر خاموش رہیں اور آئندہ اس کی احتیاط نہ کریں کہ قوم کی کشتی کو کھینچنے کا کام ایسے ہاتھوں میں نہ دیا جائے جو تھرتھراتے ہوں اور ضرورت کے وقت جواب دے دیں۔ اپنی ناکامی کی تاویلیں کرنا اور اسے صحیح قرار دینا اس سے بھی برا ہے۔ عزر گناہ بدتر از گناہ۔

دو قوتوں کی جنگ زیادہ تر اخلاقی نظم اور ہمت پر مبنی ہوتی ہے۔ سخت سے سخت لڑائی کا دارومدار انہیں چیزوں پر ہے۔ مارشل فوش فرماتے ہیں۔ آخر کار جنگ میں اسی کو فتح ہوتی ہے جس کی ہمت بندھی رہے'' پر امن جنگ میں تو اخلاقی نظم اور ہمت کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ اس لئے جو شخص اپنے عمل سے اس اخلاقی نظم کو نقصان پہنچاتا ہے یا قوم کی ہمت کو پست کرتا ہے وہ اپنے ملک کے ساتھ غداری کرتا ہے۔

مہینے گزرتے گئے اور روز کی اچھی بری خبریں ہمارے پاس پہنچتی رہیں یہاں تک کہ ہم اپنی اپنی جیلوں میں وہاں کی کندا رو بے مزہ زندگی کے عادی ہو گئے۔ اس کے بعد قومی ہفتہ کا زمانہ (۶ اپریل تا ۱۳ اپریل) آیا۔ ہم جانتے تھے کہ اس زمانہ میں بہت سے غیر معمولی واقعات ہوں گے۔ اور یہی ہوا۔ لیکن میرے لئے تو ایک حادثہ کے سامنے سب کچھ ماند پڑ گیا۔ الہ آباد میں میری والدہ ایک جلوس میں شامل تھیں۔ پولیس نے اس جلوس کو راستے میں روکا اور لاٹھی چارج کیا۔ جس وقت جلوس روکا گیا تو کسی نے میری والدہ کے لئے ایک کرسی لا کر ڈال دی۔ وہ سڑک پر جلوس کے آگے بیٹھی تھیں۔ چند لوگ خاص طور پر ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے جن میں میرا سکرٹری بھی شامل تھا۔ ان سب کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی۔ اس کے بعد حملہ شروع ہوا۔ میری والدہ کرسی پر سے گر پڑیں اور پے در پے ان کے سر پر کئی بید پڑے ان کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ جس کی وجہ سے وہ بیہوش ہو گئیں۔ اس حالت میں وہ سڑک پر پڑی ہوئی تھیں جو اب پبلک اور جلوس والوں سے صاف ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ایک پولیس افسر نے انہیں وہاں سے اٹھایا اور اپنی موٹر میں آنند بھون پہنچا دیا۔

اسی رات کو الہ آباد میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ان کا انتقال ہو گیا' چنانچہ فوراً غصہ سے بپھرے ہوئے لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے امن اور عدم تشدد کو پس پشت ڈالا کر پولیس پر حملہ کر دیا پولیس نے گولی چلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے۔

ہمیں صرف ایک ہفتہ وار اخبار پڑھنے کو ملتا ہے۔ جب اس حادثہ کے چند روز بعد ہمیں یہ خبر ملی تو میرے دل پر یہ قصور کر کے ایک چوٹ سی لگی کہ میر نحیف بوڑھی ماں سڑک کے گرد و غبار میں خون میں لت پت پڑی تھیں۔ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو نہ جانے خود میرا کیا رویہ ہوتا معلوم نہیں خود میں عدم تشدد پر کہاں تک قائم رہتا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ پچھلے بارہ برس میں میں نے جو سبق سیکھنے کی کوشش کی تھی، یہ دردناک منظر دیکھ کر میں وہ سب کچھ بھول جاتا۔ اور شاید مجھے ذاتی یا قومی مصالح کا بھی کوئی خیال نہ رہتا۔

رفتہ رفتہ وہ اچھی ہو گئیں۔ لیکن اگلے مہینہ میں جب وہ مجھ سے بریلی جیل میں ملنے آئی ہیں اس وقت تک ان کے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بہر حال وہ بہت خوش تھیں اور اس پر فخر کرتی تھیں کہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ انہیں بھی بید اور لاٹھیاں کھانے کا موقع ملا۔ لیکن ان کی یہ صحت یابی حقیقی نہیں بلکہ محض ظاہری تھی۔ اور اس ضعیف العمری میں انہیں جو شدید صدمہ پہنچا تھا اس نے ان کے سارے نظام کو ہل ڈالا۔ اور ان پرانی شکایات کو ابھار دیا جنہوں نے ایک سال بعد بڑی خطرناک صورت اختیار کر لی۔

بریلی اور دہرہ دون کے جیلوں میں

چھ ہفتے نینی جیل میں رہنے کے بعد میں بریلی کے ڈسٹرکٹ جیل میں بھیج دیا گیا۔ میری صحت پھر خراب ہوگئی تھی اور روز حرارت ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے طبیعت پریشان تھی۔ چار مہینے کے بعد جب کہ شدید گرمی پڑ رہی تھی میں بریلی جیل سے منتقل کر دیا گیا اور اب کی بار ایک ٹھنڈی جگہ بھیجا گیا۔ یعنی دہرہ دون کی جیل میں جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں میں مسلسل ساڑھے چودہ مہینے یعنی قریب قریب اپنی دو سال کی میعاد کے ختم ہونے تک رہا۔ ملاقاتوں، خطوں اور منتخب اخباروں کے ذریعہ سے مجھے باہر کی تھوڑی بہت خبریں تو پہنچ جاتی تھیں مگر پھر بھی مجھے بہت سی باتوں کی مطلق خبر نہ تھی صرف خاص خاص واقعات کا ایک دھندلا سا تصور ذہن میں تھا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد میں اپنے ذاتی معاملات اور اس وقت کے سیاسی حالات میں الجھا رہا۔ کوئی ساڑھے پانچ مہینے کے بعد پھر قید خانے میں پہنچ گیا اور اب بھی یہیں ہوں۔ اس طرح پچھلے ساڑھے تین برس میں میرا وقت زیادہ تر جیل میں گذرا اور میں واقعات سے بے خبر رہا۔ مجھ کو اس کا موقع ہی کب ملا کہ جو کچھ ملک میں ہو رہا تھا اس سے تفصیلی واقفیت حاصل کرتا۔ مجھے ابھی تک اچھی طرح سے نہیں معلوم ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس میں، جس میں گاندھی جی نے شرکت کی تھی پردے کے پیچھے کیا کیا ہوا۔ میں نہ ان سے اس مسئلہ پر گفتگو کر سکا نہ اور واقعات پر جو اس عرصے میں پیش آئے۔

مجھے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے حالات کا اتنا علم نہیں ہے کہ اس زمانہ میں قومی تحریک کی نشو و نما دکھا سکوں مگر چونکہ میں اس کی بنیاد سے واقف تھا اور کام کرنے والوں کو بھی جانتا تھا اس لئے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات کی حقیقی اہمیت کو سمجھ سکتا تھا۔ اس طرح مجھے تحریک کی عام رفتار کا خاصا اندازہ تھا۔ پہلے چار پانچ مہینے

سول نافرمانی بڑے زور وشور سے چلتی رہی اس کے بعد رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی گئی۔ البتہ بیچ میں کبھی کبھی پھر بھڑک اٹھتی تھی عملی جدوجہد کی انقلابی شدت تھوڑے ہی دن رہ سکتی ہے۔ اس کا ایک حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے یا بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے۔ چنانچہ سول نافرمانی بھی، پہلی ہلے کے بعد آہستہ آہستہ گھٹنے لگی مگر اس دھیمی رفتار سے وہ بہت مدت تک جاری رہ سکتی تھی۔ خلاف قانون قرار دئے جانے کے باوجود کانگریس کا نظام خاصی کامیابی سے چلتا رہا۔ وہ صوبوں کے کارکنوں کے کام سے باخبر رہتی تھی، انھیں ہدایتیں بھیجتی تھی، ان سے رپورٹیں منگاتی تھی اور کبھی کبھی انھیں مالی امداد بھی دیتی تھی۔

صوبوں کی کانگریس کمیٹیاں بھی کم وپیش کامیابی سے چلتی رہیں۔ اس سارے عرصے میں جب میں جیل میں تھا مجھے دوسرے صوبوں کے کچھ زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے مگر رہائی کے دنوں میں صوبہ متحدہ کی جدوجہد کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ اس صوبہ کی کانگریس ۳۲ء کے وسط تک باقاعدہ کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ کانگریس کے قائم مقام پریزیڈنٹ نے گاندھی جی کے مشورہ سے سول نافرمانی ملتوی کردی۔ اس عرصے میں اکثر اضلاع کو ہدایتیں بھیجی جاتی تھیں چھپے ہوئے یا سائکلو اسٹائل کئے ہوئے خبرنامے باقاعدہ شائع کئے جاتے تھے، اضلاع کے کام کا وقتاً فوقتاً معائنہ کیا جاتا تھا اور قومی کارکنوں کو الاؤنس تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ کام زیادہ تر خفیہ طور پر کرنا پڑتا تھا مگر صوبہ کی کانگریس کمیٹی کا ہر سیکرٹری جو دفتر وغیرہ کا نگران ہوتا تھا کھلم کھلا کام کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ گرفتار ہو جاتا تھا اور اس کی جگہ دوسرا شخص آجاتا تھا۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے تجربہ سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہم تمام ہندوستان میں خفیہ خبر رسائی کا سلسلہ آسانی سے قائم کر سکتے ہیں اگرچہ کچھ زیادہ کوشش نہیں کی گئی اور برابر مزاحمت ہوتی رہی پھر بھی ہمیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی مگر ہم میں سے

بہت لوگوں کا یہ خیال تھا کہ خفیہ طور پر کام کرنا سول نافرمانی کے اصول کے ساتھ نہیں کھپتا اور اس سے عام لوگوں میں بیداری پیدا نہیں ہوتی بلکہ افسردگی سی چھا جاتی ہے۔ اگر عام تحریک بڑے پیمانے پر جاری ہو تو اس کے ساتھ تھوڑے بہت خفیہ کارروائی بھی مفید ہو سکتی ہے مگر اس میں ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے۔ (خصوصاً اس وقت جب تحریک کا زور گھٹ رہا ہو کہ کہیں یہ کم وبیش بے اثر خفیہ کارروائیاں عام تحریک کی جگہ نہ لے لیں۔ گاندھی جی نے جولائی ۱۹۳۳ء میں خفیہ کارروائیوں کو ناپسندیدہ قرار دیا)

صوبہ متحدہ کے علاوہ گجرات اور کرناٹک میں بھی کچھ دن تک کسانوں کی محصول نہ دینے کی تحریک چلتی رہی۔ گجرات اور کرناٹک دونوں جگہ کاشتکار اپنی زمین کے مالک ہیں۔ انھوں نے حکومت کو مالگزاری ادا کرنے سے انکار کیا اور اس کی وجہ سے انھیں بہت سخت نقصان پہنچا۔ کانگریس کی طرف سے تھوڑی بہت کوشش کی گئی کہ مصیبت زدوں کی مدد کی جائے اور حلیوں اور املاک کی ضبطیوں سے جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی کی جائے ظاہر ہے کہ کوشش بہت محدود تھی۔ صوبہ متحدہ میں کانگریس کمیٹی نے بے دخل کسانوں کی مدد کی کوئی کوشش نہیں کی یہاں مسئلہ بہت بڑا تھا۔ اس صوبے میں اسامیوں کی تعداد زمیندار کاشتکاروں سے بہت زیادہ ہے' اور رقبہ بھی بہت وسیع تھا اور کانگریس کمیٹی کے پاس روپیہ بہت کم تھا۔ یہاں بیسیوں ہزاروں آدمیوں کو اس تحریک کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا۔ ان سب کی مدد کرنا ناممکن تھا اور ان میں اور دوسرے کاشتکاروں میں جو خردی قے کر رہے تھے تفریق کرنا بھی مشکل تھا اگر دو چار ہزار آدمیوں کی مدد بھی کی جاتی تو اس سے جھگڑے پڑ جاتے اور بددلی پھیل جاتی اس لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم کوئی مالی امداد نہیں دیں گے۔ یہ بات کاشتکار عس کو پہلے ہی سے سمجھا دی گئی تھی اور انھوں نے ہماری مشکلات کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ انھوں نے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں اور اف

تک نہ کی۔ البتہ جہاں تک ممکن تھا ہم نے بعض افراد کی خصوصاً جیل جانے والے کارکنوں کے بال بچوں کی مدد کی۔ اس بدنصیب ملک کے افلاس کا یہ حال ہے کہ ایک روپیہ مہینہ بھی ان کے لئے بڑی نعمت تھی۔

اس سارے عرصہ میں صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی (جو خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی) اپنے اجرت پر کام والے کارکنوں کو قلیل مقررہ الاؤنس دیتی رہی اور جب وہ باری باری سے جیل جاتے تھے تو ان کے خاندان کی خبر گیری کیا جاتی تھی۔ یہ بجٹ کی سب سے بڑی مد تھی۔ اس کے بعد اشتہاروں وغیرہ کی چھپائی کا نمبر تھا۔ یہ بھی خاصی رقم ہو جاتی تھی۔ ایک اور بڑی مد سفر خرچ کی تھی اور اس کے علاوہ جن اضلاع کی کمیٹیوں کی مالی حالت اچھی نہ تھی انھیں کچھ امداد دی جاتی تھی۔ ان سب مصارف کے باوجود صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی نے بیس مہینے میں جنوری ۳۲ء سے آخر گست ۳۳ء تک جب وہ ایک طاقتور حکومت کے ساتھ زبردست لڑائی لڑ رہی تھی کل تریسٹھ ہزار روپیہ یعنی تقریباً تین ہزار ایک سو چالیس روپیہ ماہوار خرچ کیا۔ (اس رقم میں الہ آباد، آگرہ، کانپور لکھنو وغیرہ کی خوش حال ضلع کمیٹیوں کے علیحدہ مصارف شامل نہیں ہیں) صوبہ متحدہ ۳۲ء اور ۳۳ء میں سارے وقت تحریک میں پیش پیش رہا اور میرے خیال میں جتنا کام اس نے کیا اس کے مقابلہ میں یہ خرچ بہت ہی کم ہے۔ اس چھوٹی سی رقم کا بھلا ان خاص اخراجات سے کیا مقابلہ ہے جو صوبہ کی حکومت نے سول نافرمانی کو دبانے کے کئے برداشت کئے۔ میرا قیاس ہے (اگرچہ مجھے ٹھیک معلوم نہیں) کہ کانگریس کے بعض اور بڑے بڑے صوبوں نے اس سے بہت زیادہ خرچ کیا بہار کانگریس کے نقطہ نظر سے اپنے ہمسائے صوبہ متحدہ سے بھی غریب ہے پھر بھی اس کا کام اس تحریک میں نہایت شاندار تھا۔

غرض سول نافرمانی رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی گئی مگر پھر بھی وہ کسی نہ کسی حد تک جاری رہی۔ البتہ اس میں عام تحریک کا رنگ کم ہوتا گیا۔ حکومت کی سختیوں سے قطع نظر

کر کے اسے پہلا سخت دھچکا ستمبر ۱۹۳۲ء میں پہنچا جب کہ گاندھی جی نے ہریجنوں کے معاملے کی وجہ سے پہلی بار برت رکھا۔ اس برت عام لوگوں میں جوش اور بیداری پیدا ہوئی مگر اس نے دوسرا رخ اختیار کرلیا۔ مئی ۱۹۳۳ء میں سول نافرمانی کے التوا کا اعلان کر دیا گیا اور وہ عملی طور پر ختم ہوگئی۔ اس کے بعد بھی وہ اصولی طور پر باقی تھی مگر اس پر عمل بہت کم ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر التوا نہ کیا جاتا تب بھی وہ رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑ جاتی۔ حکومت کے جبر و تشدد نے سارے ہندوستان کو سن کر دیا تھا۔ مجموعی طور پر قوم کی اعصابی قوت ختم ہو چکی تھی اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اسے ابھارے۔ انفرادی طور پر بہت سے لوگ تھے جو سول نافرمانی کر سکتے تھے مگر وہ ایک مصنوعی فضا میں کام کر رہے تھے۔

جیل میں اس عظیم الشان تحریک کے رفتہ رفتہ گھٹنے کی خبر سن کر ہم کو بڑی تکلیف ہوئی حالانکہ ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے تھے جنہیں فوری کامیابی کی امید ہو ایک خفیف سا احتمال ضرور تھا کہ اگر عام لوگ پورے جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں تو شاید کوئی فوری نتیجہ ظاہر ہو سکتا ہے مگر اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے ہم لوگوں کو یہی توقع تھی کہ لڑائی بہت طول کھینچے گی۔ بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھنے پڑیں گے، صدہا مشکلات کا سامنا ہوگا تب کہیں آہستہ آہستہ عام لوگوں میں انضباط، اتحاد عمل اور اتحاد خیال پیدا ہوگا۔ ۱۹۳۲ء کے شروع میں کبھی کبھی اس خیال سے ایک خوف سا ہوتا تھا کہ کہیں ہمیں بہت جلد ظاہری کامیابی نہ حاصل ہو جائے کیونکہ اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوتا کہ کانگریس مصالحت کرتی اور اس سے گورنمنٹ کے آدمیوں اور مطلب پرستوں کی بن آتی۔ ۱۹۳۱ء کے تجربے نے ہماری آنکھیں کھول دی تھیں۔ کامیابی اسی حالت میں مفید ہو سکتی ہے۔ جب عام لوگوں میں اتنی قوت اور ان کے خیالات میں اتنی وضاحت ہو کہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ورنہ یہی ہوگا کہ عام لوگ تو لڑیں گے اور قربانیاں کریں گے اور عین وقت پر دوسرے لوگ آ کر

مزے میں مال غنیمت پر قبضہ کرلیں گے۔ اس کا بہت سخت اندیشہ تھا اس لئے کہ خود کانگریس کے اندر لوگوں کے خیالات بہت الجھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے کوئی واضح تصور نہ تھا کہ وہ کس قسم کی حکومت یا سماج چاہتے ہیں۔ بعض کانگریسی تو اس خیال کے تھے کہ موجودہ نظام حکومت میں کچھ زیادہ تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس برطانوی حکام کو ہٹا کر ان کی جگہ سودیشی چھاپ کے لوگوں کو مقرر کر دینا کافی ہے۔

خالص قسم کے حکومت پرستوں سے کچھ زیادہ اندیشہ نہیں تھا کیونکہ ان کا ایمان تو یہ ہے کہ جو حکومت بھی ہو اس کی اطاعت کی جاوے۔ ان کے علاوہ لبرل پارٹی اور تعاون پارٹی بھی تقریباً پورے طور پر برطانوی حکومت کی ہم خیال تھی' اور ان کی طرف سے جو نکتہ چینی ہوتی رہتی تھی اس کا نہ کوئی اثر تھا نہ کوئی قدر و قیمت۔ سب جانتے تھے کہ یہ لوگ تو ہر حال میں قانون کے بندے ہیں اور اس لئے ان سے یہ توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ سول نافرمانی کو پسند کریں گے مگر انھوں نے صرف ناپسندیدگی کے اظہار پر اکتفا نہیں کی بلکہ کم و پیش حکومت کے دست و بازو بن گئے۔ ہر قسم کی قانونی آزادی چھینی جا رہی تھی اور وہ سہمے ہوئے چپ چاپ تماشا دیکھ رہے تھے۔ حکومت صرف سول نافرمانی کو توڑنا اور دبانا نہیں چاہتی تھی بلکہ ہر قسم کی سیاسی زندگی اور پبلک جدوجہد کو روکنا چاہتی تھی مگر اسکی مخالفت میں ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ جو لوگ قانونی آزادی کی حمایت کیا کرتے تھے وہ سب لڑائی میں شریک تھے اور حکومت کے جبر و تشدد کے آگے سر نہ جھکانے کی سزا بھگت رہے تھے۔ دوسرے لوگوں نے ڈر کے مارے ذلت سے سر تسلیم خم کر دیا اور نکتہ چینی کی جرات نہیں کی۔ اگر کبھی کچھ ہلکی سی نکتہ چینی ہوتی بھی تھی تو بہت نیازمندانہ لہجے میں اور اس کے ساتھ کانگریس کو اور تحریک میں شریک ہونے والوں کو دل کھول کر برا بھلا بھی کہا جاتا تھا۔

مغربی ملکوں میں رائے عامہ پوری قوت سے قانونی آزادی کی حمایت کرتی

ہے اور اگر اس میں مداخلت کی جائے تو بیزاری اور مخالفت کا طوفان برپا ہو جاتا ہے (شاید اب یہ بات ایک قصہ پارینہ ہوگئی ہے) بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ خود عملی جدوجہد میں شریک ہونا نہیں چاہتے مگر وہ تقریر کی آزادی جلسوں اور انجمنوں کی آزادی، اشخاص اور اخبارات کی آزادی کی اتنی قدر کرتے ہیں کہ ہمیشہ اس کے لئے احتجاج کرتے رہتے ہیں اور حکومت کے استبداد کو روکنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہندوستان کی لبرل جماعت کا یہ دعوی ہے کہ وہ کسی حد تک انگلستان کی لبرل پارٹی کے روایات کی حامل ہے (حالانکہ اصل میں ان دونوں میں نام کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں) اور اس سے یہ توقع ہوسکتی تھی کہ وہ قانونی آزادی کی مانالی کی کم سے کم اصولی مخالفت کرے گی کیونکہ خود اسے بھی اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ مگر اس نے نہیں کیا۔ اس کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ والٹیر میں کی ہم زبان ہو کر کہتی۔ ''تم جو کچھ کہتے ہو اس کا میں قطعاً مخالف ہوں مگر میں مرتے دم تک تمہارے اس حق کی حمائت کروں گا کہ جو کہنا چاہتے ہو وہ کہہ سکو۔''

شاید انھیں الزام دینا بے انصافی ہے، کیونکہ انھوں نے کبھی آزادی اور جمہوریت کا حامی ہونے کا دعوی نہیں کیا اور موقع ایسا تھا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ان کی زبان سے نکل جاتی تو، بیچارے مصیبت میں پڑ جاتے۔ البتہ یہ دیکھنا چاہئے کہ آزادی کے قدیم علمبردار برطانوی لبرل، اور لیبر پارٹی کے نئے اشتراکی ہندوستان میں حکومت کے جبر و تشدد سے کس حد تک متاثر ہوئے۔ وہ اس دردناک منظر کو خاصے اطمینان اور سکون سے دیکھتے رہے اور کبھی کبھی اس پالیسی کے متعلق جسے مانچسٹر گارجین کیا نامہ نگار ''جبر و تشدد کا سائنٹفک'' استعمال کہتا ہے، پسندیدگی کا اظہار بھی کرتے رہے۔ حال میں انگلستان کی نیشنل گورنمنٹ نے'' قانون بغاوت'' کا مسودہ پاس کرانے کی کوشش کی تھی اور اس پر لبرل پارٹی اور لیبر پارٹی کی طرف سے بڑی لے دے ہوئی تھی، اس پر منجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ

بھی تھا کہ یہ تقریر کی آزادی میں مداخلت کرتا ہے اور مجسٹریٹوں کو تلاشی کا وارنٹ جاری کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ میں جب ان اعتراضات کو پڑھتا تھا تو دل سے ان کی تائید کرتا تھا اور اس کے ساتھ میری آنکھوں میں ہندوستان کی تصویر پھرنے لگتی تھی جہاں برطانیہ کے مجوزہ قانون بغاوت سے ہزار درجہ بدتر قانون نافذ ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ اہل برطانیہ انگلستان ہیں اور ان کی تیوری پر بل تک نہیں آتا۔ میں تو ان کے اس کمال کا قائل ہوں کہ وہ اپنے اخلاقی اصول کو اپنے مادی اغراض کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور ہر چیز جو ان کے سیاسی منصوبوں میں مدد دے دے۔ انھیں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ سچے دل سے اخلاقی جوش کے ساتھ ہٹلر اور مسولینی کو برا کہتے ہیں کہ وہ آزادی اور جمہوریت کے دشمن ہیں اور اسی سچے دل سے ہندوستان میں آزادی اور جمہوریت کی پامالی کی حمایت کرتے ہیں اور اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے اخلاقی دلائل سے وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا یہ فعل خالص بے غرضی پر مبنی ہے۔

ادھر ہندوستان میں آگ لگی ہوئی تھی اور ہمارے مرد اور عورتوں کی جان پر بیت رہی تھی اور ادھر لندن میں خاصان حکومت ہندوستان کے لئے دستور اساسی بنا رہے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں تیسری گول میز کانفرنس۔ اور اس کی نہ جانے کتنی کمیٹیاں ہو رہی تھیں اور اسمبلی کے ممبران کی کوشش کر رہے تھے تاکہ قوم کی خدمت بھی کریں اور سیر و سفر کا لطف بھی اٹھائیں۔ اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں پارلیمنٹ کی جوائنٹ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا اور اس میں ہندستانی اسیر بلائے گئے۔ پھر ہماری فیاض حکومت کی طرف سے ان لوگوں کو جو شہادت دینے جا رہے تھے جہاز کے ٹکٹ مفت دئے گئے۔ بہت سے لوگ دوبارہ ہندوستان کی خدمت کے جوش میں پبلک کے خرچ پر سمندر پار گئے اور سنا ہے بعض نے رو کرائے کی رقم پر حجت بھی کی۔

کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ ارباب غرض کے یہ نمائندے ہندوستان کی عام

تحریک سے خوف زدہ ہوکر برطانوی شہنشاہی کے زیر سایہ لندن میں جمع ہوئے مگر ہمارے جزبہ قومیت کو یہ دیکھ کر صدمہ پہنچا کہ ہمارے ہندوستانی بھائیوں نے یہ حرکت عین اس وقت کی جب مادر وطن موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار تھی۔ مگر ہم میں سے بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہوا کیونکہ ہمارا یہ خیال تھا۔ (جو آگے چل کر غلط ثابت ہوا) کہ اس سے صاف صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان میں کون لوگ رجعت پسند ہیں اور کون ترقی پسند۔ اس تفریق سے عام لوگوں کی سیاسی تربیت میں مدد ملے گی اور سب پر ظاہر ہو جائے گا کہ بغیر کامل آزادی کے ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے اور عام لوگوں کی مصیبت دور نہیں ہو سکتی۔

یہ حضرات نہ صرف روزمرہ کی زندگی کے لحاظ سے بلکہ اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے بھی عام ہندوستانیوں سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ ان کے اور عام ہندوستان کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ انھیں مطلق احساس نہیں کہ عام لوگوں کے کیا خیالات ہیں اور وہ کون سا جذبہ ہے جو انھیں قربانیاں کرنے اور تکلیفیں سہنے پر ابھار رہا ہے۔ ان نامور مدبروں کو صرف ایک ہی حقیقت نظر آتی ہے یعنی برطانوی شہنشاہی۔ ان کے نزدیک اس کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے اس لئے چاروناچار اس کی اطاعت کرنی چاہئے۔ وہ اتنا بھی نہ سمجھے کہ عام لوگوں کی مرضی کے بغیر ہندوستان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور کوئی حقیقی اور عملی دستور نہیں بنایا جا سکتا۔ مسٹر۔ ج اسپنڈر نے اپنی نئی کتاب ''ہمارے زمانہ کی مختصر تاریخ'' میں آئرلینڈ کی مشترکہ کانفرنس کی ناکامیابی کا ذکر کیا ہے جو ۱۹۱۰ء میں دستور بنانے کی فکر میں ہے ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مکان کا بمیہ اس وقت کرے جب اس میں آگ لگی ہو۔ آئرلینڈ میں ۱۹۱۰ء میں جو آگ لگی تھی اس سے بہت بڑی آگ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ اس کے بجھ گئے ہیں مگر اس کے انگارے جن

میں ہندوستان کے جوش ازادی کی حرارت ہے۔مدت تک دہکتے رہیں گے۔

ہندوستان کے سرکاری حلقوں میں تشدد کا جذبہ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ یہ روایات پہلے سے چلی آتی تھیں اور برطانوی حکومت ابتدا سے ہندوستان میں زیادہ تر پولیس کا کام کرتی تھی۔ملکی حکام کے طرز خیال پر بھی فوجی رنگ غالب تھا۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دشمنوں کی فوج مفتوحہ علاقے میں پڑ وڈالے پڑی ہے۔جب موجودہ نظام کی مخالفت شروع ہوئی تو یہ رنگ اور بھی گہرا ہوگیا۔ان لغو حرکتوں نے یعنی جو بنگال وغیرہ میں کبھی کبھی ہوتی تھیں حکومت کے تشدد کو اور اوسے سختی کرنے لئے ایک عذر بھی مل گیا۔حکومت کی پالیسی اور اس کے تعزیری ضابطوں کی وجہ سے عاملہ اور پولیس کو اتنے وسیع اختیارات حاصل ہوگئے کہ گویا ہندوستان میں پولیس کا راج قائم ہوگیا اور کوئی اس کی روک ٹوک کرنے والا نہ رہا۔

اس جبر وتشدد کی زد میں کم وبیش ہندوستان کے سب ہی صوبے آئے مگر صوبہ سرحد اور بنگال کو سب سے زیادہ مصیبت اٹھانی پڑی صوبہ سرحد ہمیشہ سے بڑی حد تک ایک فوجی علاقہ تھا اور اس میں نیم فوجی انتظام رائج تھا۔اس کا محل وقوع جنگی نقطہ نظر سے بہت اہم تھا اور وہاں سرخ پوشوں کی تحریک پھیلنے سے حکومت بالکل بد حواس ہوگئی تھی۔سارے صوبے میں ہر طرف فوجی دستے نظر آتے تھے جو ''امن قائم کرنے میں'' اور ''سرکش دیہات'' کو قابو میں لانے میں مصروف تھے۔سارے ہندوستان میں پورے پورے گاؤں پر اور کبھی کبھی (خصوصاً بنگال میں) شہروں پر بھاری جرمانے کئے جاتے تھے۔اکثر تعزیری پولیس بھی تعینات کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب پولیس کو اتنے اختیارات دے دیئے گئے تھے اور کسی قسم کی روک ٹوک نہیں تھی تو اس کا زیادتی کرنا ایک لازمی امر تھا۔قانون انصاف کی بدنظمی اور بے انصافی کی عجیب عجیب مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

بنگال کے بعض حصوں میں بہت افسوس ناک منظر آتا تھا۔حکومت وہاں کی

ساری آبادی کو (یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ساری ہندو آبادی کو) دشمن سمجھتی تھی اور بارہ اور پچیس سال کے درمیان عمر رکھنے والے ہر مرد، عورت، لڑکے، لڑکی کو ایک کاغذ رکھنا پڑتا تھا جس میں اس کا نام ونشان درج ہوتا تھا۔ جتھے جتھے بند کر دئے جاتے تھے یا انھیں کسی علاقے میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی جاتی تھی۔ لباس پر بندشیں عائد کی گئی تھیں۔ مدرسوں کی نگرانی ہوتی تھی یا وہ بند کر دئے جاتے تھے۔ لوگوں کو بائیسکل کی اجازت نہیں تھی انھیں اپنی نقل وحرکت کی اطلاع پولیس کو دینی پڑتی تھی۔ غروب آفتاب کے بعد گھر سے نکلنے کی ممانعت، فوجوں کا گشت، تعزیری پولیس، مجموعی جرمانے، غرض دنیا بھر کے قاعدوں اور ضابطوں کی زنجیروں نے لوگوں کو جکڑ رکھا تھا۔ علاقے کے علاقے فوجی محاصرے کی حالت میں تھے اور ان کے سارے باشندوں کی حیثیت ان قیدیوں کی سی تھی جو عارضی طور پر رہا کئے جاتے ہیں اور ہر وقت پولیس کی شدید نگرانی میں رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ برطانوی حکومت کے نقطۂ نظر سے یہ عجیب وغریب قاعدے یا ضابطے ضروری تھے یا نہیں تھے۔ اگر ان کی ضرورت نہیں تھی تو حکومت پر بہت سخت الزام آتا ہے کہ اس نے پورے پورے علاقوں کے باشندوں کو خواہ مخواہ ستایا، ذلیل کیا اور شدید نقصان پہنچایا۔ اور اگر ان کی ضرورت تھی تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

اس جبر وتشدد نے جیل میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا، قیدیوں کی تقسیم مختلف درجوں میں کرنا ایک لغو فعل تھا اور اس سے اکثر ان لوگوں کو جو اونچے درجے میں رکھے جاتے تھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ بہت کم لوگوں کو اونچے درجے ملتے تھے اور بہت سے زورحس مردوں اور عورتوں کو ایسی شرائط کی پابندی کرنی پڑتی تھی جو ان کے لئے سوہان روح تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ حکومت جان بوجھ کر ایسی پالیسی اختیار کرتی ہے جس سے سیاسی قیدیوں کی حالت عام قیدیوں سے بدتر ہو جائے۔ جیل

کے ایک انسپکٹر جنرل نے تو یہاں تک کیا کہ تمام جیل خانوں میں ایک خفیہ گشتی چھٹی (۱) بھیج دی۔ جس میں یہ ہدایت کی کہ سول نافرمانی کے قیدیوں کے ساتھ ''انتہائی سختی کا برتاؤ کرنا چاہئے'' کوڑے لگانے کی سزا جیل میں عام ہوگی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۳۳ء کو نائب وزیر ہند نے دارالعوم میں بیان کیا' سر سیموئل ہور کو اطلاع ملی ہے کہ ۱۹۳۲ء میں ہندوستان میں پانچ سو قیدیوں کو سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں کوڑے لگائے گئے' معلوم نہیں اس تعداد میں وہ لوگ بھی شامل ہیں یا نہیں جنھیں جیل کے قوانین کی خلاف ورزی کی سزا میں کوڑے لگائے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں جب ہمیں جیل میں یہ خبریں پہنچیں کی بہت سے لوگوں کو کوڑے کی سزائیں دی گئی ہیں تو مجھے یاد آیا کہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں ہم نے اس قسم کے دو ایک واقعات کے خلاف احتجاج کیا تھا اور تین روز کا فاقہ کیا تھا۔ اس وقت مجھے اس وحشیانہ سزا سے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اب بھی مجھے صدمہ ہوتا تھا اور دل دکھتا تھا مگر اس کا کبھی خیال بھی نہ آیا کہ مجھے پھر احتجاج اور فاقہ کرنا چاہئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب میں بالکل بے بس ہوں۔ انسان کا احساس وحشت اور بہیمیت کا منظر دیکھتے دیکھتے کند ہو جاتا ہے۔ کتنی ہی بری چیز کیوں نہ ہو ایک مدت کے بعد دنیا کو اس کی عادت ہو جاتی ہے۔

ہمارے آدمیوں سے جیل میں سخت ترین مشقت کے کم لئے جاتے تھے مثلاً چکی پیسنا' کولھو چلانا وغیرہ اور انھیں ہر قسم کی تکلیفیں دی جاتی تھیں تا کہ وہ عاجز آ کر معفی مانگ لیں اور اقرار نامے پر دستخط کر کے رہا ہو جائیں یہ جیل کے افسروں کی بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔

جیل کی اکثر سزائیں لڑکوں اور نوجوانوں کے حصہ میں آتی تھیں اس لئے کہ وہ بے جا سختیوں پر بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ یہ بڑے اچھے بہادر لڑکے تھے جن میں خودداری' تیزی طراری' من چلاپن کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اگر یہ انگلستان کے پبلک اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں ہوتے تو ان کی بڑی قدر اور ہمت افزائی کی جاتی۔

مگر ہندوستان میں ان کی نوجوانانہ تصفر پرست اوور خودداری کا صلہ یہ ملتا تھا کہ ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈالی جاتی تھیں، کال کوٹھری میں بند کئے جاتے تھے' اور کوڑوں پٹتے تھے۔

ہماری عورتوں کی حالت جیل میں اور بھی زیادہ افسوس ناک تھی۔ یہ عموماً اوسط طبقے کی عورتیں تھیں جو گھروں کی چار دیواری میں زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں' اور اس سماج نے جس میں مردوں کی خودغرضانہ حکومت ہے انھیں طرح طرح کی بندشوں اور رسموں میں جکڑ رکھا تھا۔ آزادی کی تحریک ان کے لئے دہری اہمیت رکھتی تھی۔ جس جوش وخروش سے یہ اس تحریک میں شریک ہوئیں اس کی تہ میں یقیناً یہ خواہش تھی کہ انھیں گھر کی غلامی سے بھی نجات مل جائے۔ یہ خواہش مبہم اور غیر محسوس سہی مگر شدت سے ان کے دلوں میں موجود تھی۔ جیل میں معدودے چند کے سوا ان خواتین کے ساتھ معمولی قیدیوں کا سا برتاؤ ہوتا تھا۔ وہ بدترین قسم کی عورتوں کے ساتھ رکھی جاتی تھیں اور اکثر انھیں سخت تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ ایک بار میں اس بارک میں رکھا گیا جو عورتوں کے احاطہ سے متصل تھی۔ صرف ایک دیوار بیچ میں تھی اس احاطے میں اور عورتوں کے ساتھ چند سیاسی قیدی عورتیں بھی تھیں جن میں سے ایک خاتون کے گھر میں ایک زمانہ میں مہمان رہ چکا تھا ایک اونچی دیوار کے حائل ہونے کے باوجود نگران قیدی عورتوں کی ڈانٹ ڈپٹ کی آواز صاف دیتی تھی اور مجھے سخت صدمہ ہوتا تھا کہ میری دوستوں کو ایسی بیہودا اور نامعقول باتیں سننی پڑتی ہیں۔

یہ بات صریحی طور پر نظر آتی تھی کہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں دو برس پہلے یعنی ۱۹۳۰ء کے مقابلے میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ اور بھی برا برتاؤ ہوتا تھا یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ چند افسر اپنی مرضی سے ایسا کرتے ہوں سوا اس کے اور کوئی وجہ عقل میں نہیں آسکتی تھی کہ حکومت نے قصداً یہ پالیسی مقرر کی ہے۔ کچھ سیاسی قیدیوں پر

موقوف نہیں بلکہ یوں بھی صوبہ متحدہ کا جیل کا محکمہ اس زمانہ میں اس کے لیے بدنام تھا کہ وہ ہر قسم کی ہمدردی اور انسانیت سے محروم ہے۔ ہمیں نہایت معتبر ذریعے سے اس کی ایک دلچسپ مثال معلوم ہوئی۔ ایک بار جیل کے ایک معزز وزیر، جو ہماری طرح باغی یا مفسد نہیں، بلکہ حکومت کے مقربین میں سے تھے اور سر کا خطاب رکھتے تھے، ہم سے ملنے کے لیے آئے۔ انھوں نے بیان کیا کہ چند مہینے پہلے وہ ایک اور جیل کے معائنہ کے لیے گئے تھے اور انھوں نے اس رپورٹ میں جیلر کے متعلق یہ الفاظ لکھے تھے کہ وہ ''ہمدردی کے ساتھ ضابطے کی پابندی کراتے ہیں''۔ جیلر نے ان سے درخواست کی کہ آپ میری ہمدردی کا ذکر نہ کیجئے اس لیے کہ سرکاری حلقوں میں یہ کوئی اچھی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ مگر وزیر صاحب نہیں مانے اور انھیں یقین نہ آیا کہ اس رپورٹ سے جیلر کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دن کے بعد جیلر کو وہاں سے دور کسی اور مقام پر بدل دیا گیا جو اس کے لیے ایک قسم کی سزا تھی۔

بعض جیلروں کو جو خاص طور پر سخت اور بے باک سمجھے جاتے تھے۔ ترقیاں ملیں اور خطاب دیئے گئے۔ رشوت کی جیل میں اس قدر گرم بازاری ہے کہ شاید ہی کوئی شخص اس سے بچتا ہو۔ مگر میرا اور میرے بہت سے دوستوں کا یہ تجربہ ہے کہ جیل کے افسروں میں وہی لوگ سب سے زیادہ رشوت لیتے ہیں جو بڑے سخت گیر بنتے ہیں۔

خوش قسمتی سے میرے ساتھ جیل میں اور جیل کے باہر بھی لوگوں کا برتاؤ بہت اچھا رہا اور وہ شخص جس سے مجھے سابقہ پڑا میرے ساتھ اخلاق اور مہربانی سے پیش آیا۔ ان موقعوں پر بھی جب میں اس سلوک کا مستحق نہیں تھا البتہ جیل میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے مجھے اور میرے عزیزوں کو بڑا دکھ پہنچا۔ ایک بار میری والدہ، کملا اور میری بیٹی اندرا الہ آباد کے ڈسٹرکٹ جیل میں میرے بہنوئی رنجیت پنڈت سے ملنے کے لیے گئیں۔ جیلر نے انھوں بے قصور برا بھلا کہا اور باہر نکال دیا۔ مجھے اس

سے بہت رنج ہوا۔ اور صوبے کی حکومت نے اس معاملے میں جو طریقہ اختیار کیا اس سے بھی اور زیادہ صدمہ پہنچا۔ اس خیال سے کہیں پھر جیل کے ملازموں کے ہاتھ سے میری والدہ کی توہین نہ ہو میں نے سب سے ملاقات کرنا ترک کر دیا۔ دہرہ دون کے جیل میں سات مہینے تک ایک شخص سے بھی ملاقات نہیں کی۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ایک قیدی کی نفسی کیفیتیں

میں اور گووند پنتھ بریلی ڈسٹرکٹ جیل سے دہرہ دون جیل منتقل کر دیئے گئے۔ اس خیال سے کہ کوئی مظاہرہ نہ ہونے پائے ہمیں بریلی اسٹیشن سے ریل پر سوار نہیں کیا بلکہ وہاں سے پچاس میل آگے جا کر ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی پر بٹھا دیا اور وہ بھی خفیہ طور پر رات کے وقت۔ مہینوں تنہائی میں بند رہنے کے بعد رات کی خنکی میں موٹر کار کا یہ سفر بڑا خوش گوار معلوم ہوا۔

بریلی جیل سے روانگی سے پہلے ایک بات ایسی ہوئی جس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا اور جس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ بریلی کا انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی وہاں موجود تھا جب میں موٹر میں بیٹھنے لگا تو اس نے کچھ شرماتے ہوئے ایک بنڈل میری طرف بڑھایا اور کہا کہ اس میں جرمنی کے چند پرانے باتصویر رسالے ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ آپ نے جرمن زبان سیکھنا شروع کی ہے اس لیے میں یہ رسالے آپ کے لیے لیتا آیا۔ میں نہ ان صاحب سے پہلے کبھی ملا تھا اور نہ اس کے بعد ملنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے ان کا نام تک معلوم نہیں، ان کے اس بے ساختہ اخلاق۔ اور اس جذبہ ہمدردی نے جو اس کا محرک ہوا۔ مجھے بہت متاثر کیا اور میں ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔

آدھی رات کے سناٹے میں موٹر کے اس طویل سفر میں، میں انگریزوں اور ہندوستانیوں حاکموں اور محکموں، سرکاری عہدے داروں اور غیر سرکاری لوگوں کے تعلقات پر غور کرتا رہا۔ ان دونوں کے درمیان کتنی بڑی زبردست خلیج حائل ہے۔ اور یہ ایک دوسرے سے کس قدر بددل اور بدظن ہیں۔ لیکن اس بددلی اور بدگمانی کے علاوہ اجنبیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ہیں اس لیے ہر فریق دوسرے سے کھٹکتا ہے اور کھچا کھچا رہتا ہے ایک دوسرے کو ترش رو اور روکھا نظر آتا ہے اور دونوں میں سے کسی یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس پردے کے پیچھے

شرافت اور انسانیت بھی ہے، انگریز ملک کے حکام ہیں اور جاہ و منصب عطا کرنا ان کے اختیار میں ہے اس لیے بہت سے خوشامدی ابن الوقت اور عہدوں کے خواہاں انہیں گھیرے رہتے ہیں اور انہی ناپاک نمونوں سے انہوں نے ہندوستانیوں کی سیرت کا اندازہ لگایا ہے۔ دوسری طرف ہندوستانیوں نے انگریزوں کو صرف افسروں کی حیثیت سے دیکھا، جو انسانیت سے خالی، مشینوں کی طرح کام کرتے ہیں اور ہر وقت اپنے مستقل حقوق کو محفوظ رکھنے کی دھن میں رہتے ہیں۔ کسی شخص کے انفرادی رویہ میں جب وہ اپنے انسانی جذبات کے ماتحت کام کرتا ہے اور اس کے منصبی طرز عمل میں جب وہ ایک فوج کا سپاہی ہوتا ہے، زمین آسمان کا فرق ہے۔ سپاہی جب ڈیوٹی پر ہوتا ہے تو اس کی انسانیت رخصت ہو جاتی ہے وہ ایک کل کے پتلے کی طرح حرکت کرتا ہے اور ان بے ضرر انسانوں پر گولی چلاتا ہے جنہوں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ یہی حال اس پولیس کے افسر کا ہے جسے آج کسی شخص سے ذرا سی بدسلوکی کرنا بھی گوارا نہیں تو کل بے گناہوں پر بے تکلف لاٹھی چارج کرتا ہے۔ اس وقت نہ وہ اپنے آپ کو انسان سمجھتا ہے نہ مجمع کے ان افراد کو جن پر وہ لاٹھیاں اور گولیاں برساتا ہے۔

جب کوئی شخص دوسرے فریق کو جماعت یا مجمع کی حیثیت سے دیکھتا ہے تو انسانی رشتہ غائب ہو جاتا ہے اور وہ یہ بھول جاتا ہے کہ جماعت بھی افراد سے مردوں، عورتوں اور بچوں سے بنتی ہے جن کے سینے میں دل ہے اور اس میں محبت نفرت اور تکلیف کا احساس موجود ہے۔ انگریز اگر صاف گوئی سے کام لیں تو یہ کہیں گے کہ ہندوستانیوں میں بعض معقول آدمی بھی دیکھے ہیں مگر وہ استثنا کا حکم رکھتے ہیں۔ ورنہ عموماً ہندوستانی سخت قابل نفرت ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی بھی یہی کہیں گے کہ وہ چند ایسے انگریزوں کو جانتے ہیں جو قابل تعریف ہیں لیکن انہیں چھوڑ کر باقی سب کے سب مغرور، ظالم اور بد ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہر شخص دوسری قوم کا

اندازہ ان افراد سے نہیں لگاتا جن سے اسے انسان کی حیثیت سے سابقہ پڑا ہے بلکہ دوسرے لوگوں سے جن سے وہ بالکل ناواقف ہوتا ہے یا بہت کم واقفیت رکھتا ہے۔

میں ذاتی طور پر اس معاملے میں بڑا خوش نصیب ہوں کیونکہ میرے ہم وطن اور انگریز دونوں بلا استثنا ہمیشہ مجھ سے بڑے اخلاق سے پیش آئے یہاں تک کہ وہ پولیس والے جنہوں نے مجھے گرفتار کیا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئے اور جیلر وغیرہ بھی مجھ سے بڑی مہربانی سے پیش آتے رہے اور ان کی اس انسانیت کی وجہ سے لڑائی کی تلخیوں اور جیل زندگی کی سختیوں میں بہت کچھ کمی ہوگئی۔ میرے ہم وطنوں کا مجھ سے اچھا سلوک کرنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ ان میں تو مجھے کچھ نہ کچھ شہرت اور مقبولیت حاصل تھی لیکن انگریز بھی مجھے محض ایک جماعت کے رکن نہیں بلکہ ایک فرد کی حیثیت دیتے رہے۔ میں نے انگلستان میں تعلیم پائی ہے اور وہاں سے ایک پبلک اسکول میں رہا ہوں۔ شاید اس وجہ سے وہ مجھے اپنے سے قریب تر سمجھتے ہیں اور چاہے میری قومی سرگرمیاں انہیں کتنی ہی نامعقول معلوم ہوتی ہوں لیکن وہ اپنے معیار کے مطابق مجھے کم و بیش مہذب ضرور مانتے ہیں۔ میرے ساتھ جو خاص مراعات کی جاتی تھیں جب میں اس کا مقابلہ اپنے ساتھیوں کی حالت سے کرتا تھا تو اکثر مجھے تکلیف ہوتی تھی اور شرم آتی تھی۔

لیکن ان تمام رعایتوں کے باوجود جیل پھر جیل ہے اور وہاں تکلیف دہ ماحول کبھی کبھی ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔ وہاں کی ساری فضا تشدد، کمینے پن اور رشوت اور جھوٹ سے ناپاک تھی۔ جیل کے ملازم یا تو انتہائی خوشامد کرتے تھے یا گالی سے بات کرتے تھے۔ جو شخص حساس طبیعت رکھتا ہو وہ ہمیشہ بے چین رہتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر طبیعت جھنجھلاتی تھی۔ کسی خط یا اخبار میں کوئی بری خبر دیکھ کر کچھ دیر کے لیے پریشانی یا غصے سے دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ باہر تو کام میں لگے رہنے سے

تسکین رہتی تھی اور مختلف دلچسپیاں اور سرگرمیاں دماغ اور جسم کا توازن قائم رکھتی تھیں لیکن جیل میں گھٹے ہوئے جذبات کے نکاس کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا اور آدمی اندر ہی اندر کھولتا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی رائے ہر معاملے کے متعلق یک طرفہ اور غلط ہوتی تھی۔ اور بیماری تو جیل میں بڑی مصیبت تھی۔

پھر بھی میں نے جیل کے معمولات کا اپنے آپ کو عادی بنالیا اور کافی جسمانی ورزش اور دماغی محنت کے ذریعے سے اپنی صحت کو قائم رکھا۔ ورزش اور محنت کی باہر کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو لیکن جیل میں یہ نہایت ضروری چیز ہے، کیونکہ اس کے بغیر صحت بالکل برباد ہو جاتی ہے۔ میں اوقات کی نہایت سختی سے پابندی کرتا تھا اور جہاں تک ممکن تھا اپنے پرانے معمولات کو قائم رکھتا تھا تاکہ طبیعت سست نہ ہونے پائے۔ میں پابندی سے داڑھی مونڈتا تھا۔ (جیل میں مجھے سیفٹی ریزر رکھنے کی اجازت تھی) میں نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر اس لیے کر دیا ہے کہ لوگ عموماً ان کی پرواہ نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اور کاموں میں بھی سست پڑ جاتے ہیں۔ دن بھر سخت محنت کرنے کے بعد شام کی تکان بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اور رات کو بڑے مزے کی نیند آتی تھی۔

اس طرح دن، ہفتے اور مہینے گزرتے گئے لیکن کبھی کبھی کوئی مہینہ ایسا بھاری ہو جاتا تھا کہ کاٹے نہ کٹتا تھا اور بعض اوقات میں دنیا کی ہر چیز اور ہر شخص سے بیزار ہو جاتا تھا۔ اپنے جیل کے ساتھیوں سے جیل کے عملہ سے، باہر والوں سے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا یا ایسا کیوں نہ کیا سلطنت برطانیہ سے (مگر اس سے تو میں ہمیشہ بیزار تھا) اور سب سے زیادہ اپنے آپ سے۔ میں سخت اعصابی بے چینی میں مبتلا رہتا تھا اور نفسی کیفیتیں جو ایک قیدی پر گزرتی ہیں، مجھ پر بڑی شدت سے طاری ہوتی تھیں۔ لیکن خوش قسمتی سے مجھے اس قسم کے دردوں سے بہت جلد افاقہ ہو جاتا تھا۔

جیل میں ملاقات کا دن ہمارے لیے عید کا دن ہوتا تھا ہر شخص اس کے انتظار

میں دن گنا کرتا تھا۔لیکن ملاقات کا جوش ختم ہونے کے بعد فطرتاً اس کا ردعمل شروع ہوتا تھا۔یعنی ہمیں بڑی تنہائی اور اداسی محسوس ہوتی تھی۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ملاقاتیں خوش گوار ثابت نہیں ہوتی تھیں یعنی کوئی پریشان کن خبر سننے میں آتی تھی یا کوئی اور بات ایسی ہوتی تھی جس کی وجہ سے میں رنجیدہ ہو جاتا تھا۔ملاقات کے موقعوں پر جیل کے افسر تو موجود رہتے ہی تھے لیکن بریلی میں دو تین مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ خفیہ پولیس والے بھی کاغذ پنسل لیے بیٹھے تھے اور جو لفظ ہماری زبان سے نکلتا تھا اسے بڑے شوق سے لکھتے جاتے تھے۔مجھے اس پر بڑا غصہ آتا تھا اور ان ملاقاتوں کا سارا لطف جاتا رہتا تھا۔

اس کے بعد جب الہٰ آباد جیل میں ایک ملاقات کے موقع پر میری ماں اور بیوی کے ساتھ بہت برا برتاؤ کیا گیا اور حکومت نے بھی اس کا کوئی تدارک نہیں کیا تو میں نے احتجاج کے طور پر ان ملاقاتوں کو جو میرے لیے اس قدر قیمتی تھیں ترک کر دیا۔قریب قریب سات مہینے تک میں کسی شخص سے نہیں ملا۔میرے لیے یہ بڑے سخت دن تھے۔اس کے جب میں دوبارہ ملاقات کا سلسلہ شروع کیا اور میرے عزیز پہلے پہل مجھ سے ملنے آئے تو کچھ نہ پوچھئے کہ کس قدر خوشی ہوئی۔میری بہن کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔ان میں سے ایک ننھا سا بچہ حسب عادت میرے کاندھے پر چڑھ گیا تو مجھے اپنے جذبات کا ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔اتنے دن تک انسانوں کی صحبت کے لیے ترسنے کے بعد گھر کی زندگی کے لطف نے مجھے بے چین کر دیا۔

جس زمانے میں ملاقات کا سلسلہ بند تھا مجھے گھر کے یا دوسرے جیلوں کے خطوں کا (کیونکہ میری دونوں بہنیں جیل میں تھی) اور زیادہ بے چینی سے انتظار رہنے لگا۔اور یہ چیز میرے لیے اور بھی قیمتی ہو گئی۔اگر مقررہ وقت پر خط نہ پہنچتا تو مجھے سخت پریشانی ہوتی لیکن جب آ جاتا تو مجھے اس کے کھولنے میں ایک قسم کی

ہچکچاہٹ سی ہوتی میں اس سے اس طرح کھیلتا رہتا جیسے کوئی اپنی محبوب چیز سے کھیلتا ہے جو اپنے قابو میں ہو اور میرے دل کی تہہ میں یہ خیال بھی کھٹکتا رہتا کہ کہیں اس میں کوئی ایسی خبر یا بات نہ ہو جس سے مجھے تکلیف پہنچے۔ خط بھیجنے اور خط پانے دونوں سے پرسکون زندگی میں بڑا خلل واقع ہوتا ہے۔ ان سے جذبات میں ایک ہیجان تکلیف ہوتی ہے ایک دو روز خیالات پریشان رہتے ہیں اور روزمرہ کے کام پر پوری توجہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

نینی اور بریلی کے جیلوں میں سے ہمارے ساتھ بہت سے لوگ تھے لیکن دہرہ دون میں شروع شروع میں صرف ہم تین آدمی تھے یعنی گووند بلبھ پنتھ۔ کاشی پور کے کنور آنند سنگھ اور میں۔ دو ایک مہینے بعد پنتھ جی اپنے چھ مہینے کی میعاد کاٹ کر چلے گئے لیکن دو صاحب اور تشریف لے آئے۔ جنوری ۱۹۳۳ء تک سب ساتھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ آخر اگست میں مجھے رہائی ملی۔ اس عرصے میں یعنی پورے آٹھ مہینے دہرہ دون جیل میں، میں نے بالکل تنہائی کی زندگی گزاری یہاں تک کہ کوئی بات کرنے کو بھی نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی جیل کا کوئی اہلکار چند منٹ کے لیے آنکلتا تھا۔ اگرچہ اصطلاحی طور پر مجھے قید تنہائی کی سزا نہیں دی گئی تھی لیکن یہ صورت صورت قریب قریب وہی تھی۔ میرے لیے یہ بڑا صبر آزما زمانہ تھا۔ اچھا ہوا کہ میں نے ملاقات کا سلسلہ پھر شروع کر دیا تھا کیونکہ اس سے مجھے کچھ نہ کچھ سکون حاصل ہو جاتا تھا۔ میرے ساتھ ایک خاص رعایت یہ تھی کہ مجھے باہر سے تازہ پھول منگوانے اور چند فوٹو رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ ان سے میرا جی بہت کچھ بہل جاتا تھا۔ عموماً جیل میں پھولوں اور تصویروں کے رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اکثر لوگوں نے میرے لیے پھول بھیجے۔ لیکن مجھے ان کے لینے کی اجازت نہیں ملی۔ بات یہ ہے کہ جیل کی کوٹھڑی میں خوشنمائی پیدا کرنا پسند نہیں کیا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ جیل کے سپرٹینڈنٹ نے میرے ایک ساتھی کو جو میرے برابر کی کوٹھڑی میں

رہتے تھے، اس بات پر تنبیہ کی انہوں نے اپنے منہ ہاتھ دھونے کا سامان سلیقے سے سجا کر رکھا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ ''اپنی کوٹھڑی کو اس طرح مت سجاؤ کہ اس سے آرائش اور عیش پسندی ظاہر ہو'' اب ذرا اس سامان عیش کی فہرست بھی ملاحظہ کیجئے۔ ایک دانت صاف کرنے کا برش، منجن کی شیشی، فاؤنٹین پن کی روشنائی، سر میں ڈالنے کی تیل کی ایک بوتل، ایک برش، ایک کنگھا اور شاید دو ایک اور چھوٹی چھوٹی چیزیں۔

جیل میں انسان کو روزمرہ کی معمولی معمولی چیزوں کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ وہاں اپنا ذاتی سامان بہت کم ہوتا ہے۔ اس میں آسانی سے اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی چیز کھو جائے تو دوبارہ منگوانا بہت مشکل ہے۔ اس لیے ہر شخص انہیں بہت عزیز رکھتا ہے وہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں جمع کرتا تھا جو باہر عموماً ردی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی ہیں۔ ملکیت کا جذبہ وہاں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جہاں کوئی چیز رکھنے کے قابل ہو میسر نہیں آتی۔

کبھی کبھی زندگی کی خوش گوار چیزوں کے لیے دل تڑپتا ہے مثلاً جسمانی آرام و آسائش، خوش گوار ماحول، دوستوں کی صحبت، دلچسپ گفتگو، بچوں کے ساتھ کھیلنا ..... کبھی اخبار میں کوئی تصویر یا فوٹو دیکھ کر پرانے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جوانی کی بے فکریوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھچ جاتا ہے گھر کی یاد کانٹے کی طرح کھٹکنے لگتی ہے اور سارا دن بے چینی میں کٹتا ہے۔

میں روز تھوڑی دیر چرخہ کاتتا تھا کیونکہ ذہنی کام کرنے کے بعد جسمانی محنت سے سکون حاصل ہوتا تھا۔ لیکن میرا خاص شغل کھنا پڑھنا تھا۔ جو کتابیں میں چاہتا تھا وہ سب مجھے نہیں مل سکتی تھیں کیونکہ اس معاملے میں بڑی پابندیاں تھیں اور سختی سے احتساب ہوتا تھا۔ احتساب کرنے والے بعض اوقات نا اہل لوگ ہوتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ اسپنگلر کی کتاب ''زوال مغرب'' اس لیے روک دی گئی کہ کتاب کا نام

خطرناک اور باغیانہ معلوم ہوتا ہے۔لیکن مجھے شکایت کا موقع نہیں ہے۔اس لیے کہ پھر بھی مجھے بہت سی مختلف قسم کی کتابیں پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔اس معاملے میں بھی میرے ساتھ خاص رعایت تھی کیونکہ میرے بہت سے ساتھیوں کو (جو درجہ اول کے قیدی تھے) مسائل حاضرہ کے متعلق کتابیں ملنے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔مجھے معلوم ہوا کہ بنارس جیل میں وائٹ پیپر تک (جس میں حکومت برطانیہ کی دستوری تجاویز درج تھیں) منگانے کی اجازت نہیں دی گئی کیونکہ اس میں سیاسی معاملات کی بحث تھی۔برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابوں کے پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں مذہبی کتابیں اور ناول۔یہ عجیب بات ہے کہ حکومت برطانیہ مذہب کی بڑی قدردان ہے اور بڑی بے تعصبی سے ہر قسم کے مذہب کی ہمت افزائی کرتی ہے۔

جب ہندوستان میں معمولی سے معمولی مدنی حقوق بھی حاصل نہیں ہیں تو قیدیوں کے حقوق کا تذکرہ کرنا فضول ہے۔پھر بھی یہ مسئلہ قابل غور ہے۔اگر ایک عدالت کسی شخص کو قید کی سزا دیتی ہے تو اس کا یہ منشا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ جسم کے ساتھ دماغ کو بھی سزا دی جائے۔قیدی کا جسم پابند سہی لیکن دماغ کیوں نہ آزاد ہو؟ ہندوستان کے جیلوں کے ارباب حل وعقد یقیناً اس سوال پر برافروختہ ہوں گے۔ کیونکہ ان میں جدید خیالات کو سمجھنے کی صلاحیت اور غور وفکر کی عادت عموماً بہت کم ہوتی ہے۔احتساب یوں بھی بے انصافی اور حماقت کا فعل ہے۔ہندوستان میں ہم اس کی بدولت بہت سی جدید مطبوعات اور ترقی پذیر رسائل اور اخبارات سے محروم رہتے ہیں۔ممنوعہ کتابوں کی فہرست کافی طویل ہے اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔اس پر طرہ یہ ہے کہ قیدیوں کو وہ کتابیں نہیں ملتیں جن کی جیل کے باہر خریدنے اور پڑھنے کی قانوناً اجازت ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں یہ سوال اٹھا تھا۔وہاں نیو یارک کے مشہور ومعروف سنگ سنگ جیل میں چند اشتمالی رسائل کی ممانعت تھی۔

امریکہ کے حکمران طبقہ کو اشتمالیوں سے خاص قد ہے۔لیکن اس کے باوجود جیل کے حکام نے یہ تسلیم کیا کہ قیدیوں کو ہر طرح کی مطبوعات حتی کہ اشتمالی رسائل و اخبارات بھی منگانے کا حق ہے۔جیل کے وارڈن نے اس میں صرف ایک استثنا کیا تھا یعنی ان کارٹونوں کی اجازت نہیں دی تھی جنہیں وہ اشتعال انگیز سمجھتا تھا۔

ہندوستان کی جیلوں کے متعلق ذہنی آزادی کے مسئلہ پر بحث کرنا بالکل فضول ہے کیونکہ یہاں تو عام قیدیوں کو نہ کوئی اخبار ملتا ہے اور نہ لکھنے کا سامان۔احتساب کا کیا ذکر ہے۔یہاں تو ان سب چیزوں کی ایک سرے سے ممانعت ہے صرف درجہ اول کے قیدیوں کو لکھنے کا سامان ملتا ہے لیکن روزانہ اخبار ان میں سے بھی سب کو نہیں دیئے جاتے اور جنہیں ملتے بھی ہیں تو وہی اخبار جنہیں حکومت پسند کرتی ہے۔رہے دوسرے اور تیسرے درجے کے سیاسی اور غیر سیاسی قیدی ان کے لیے اصولاً لکھنے کا سامان ممنوع قرار دیا گیا ہے۔بعض سیاسی قیدیوں کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ انہیں لکھنے کا سامان دے دیا جاتا ہے لیکن اکثر یہ رعایت منسوخ ہوتی رہتی ہے۔درجہ اول کے قیدی ہزار میں سے ایک سے زیادہ نہ ہوتے ہوں گے اس لیے ہندوستانی قیدیوں کی عام حالت پر غور کرتے وقت ہم انہیں نظر انداز کر سکتے ہیں۔مگر یاد رہے جہاں تک کتابوں اور اخباروں کا تعلق ہے، درجہ اول کے ان خوش نصیب، قیدیوں کو بھی وہ مراعات حاصل نہیں ہیں جو اکثر مہذب ممالک کے عام قیدیوں کو حاصل ہیں۔

بقیہ قیدیوں یعنی ہزار میں نوسو ننانوے کو ایک وقت میں دو تین کتابیں منگانے کی اجازت ہے لیکن پابندیاں اتنی سخت ہیں کہ عام طور پر وہ اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔لکھنا یا کتابوں کے نوٹ لینا بہت خطرناک سمجھا جاتا ہے اور اس کی سخت ممانعت ہے۔ذہنی تربیت کو جان بوجھ کر اس طرح روکنا بہت عجیب اور معنی خیز ہے۔قیدیوں کی اصلاح کے نقطہ نظر سے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان کے دماغ کی

تربیت کی جائے اور اس کا رخ بدلا جائے۔ انہیں لکھنا پڑھنا سکھانے کی کوشش شروع ہوئی ہے لیکن وہ بالکل ناکافی ہے اور جن لوگوں کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے وہ قطعاً نااہل ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قیدی پڑھنے لکھنے کو پسند نہیں کرتے لیکن میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرے پاس بہت سے قیدی اسی غرض سے آتے تھے اور میں نے دیکھا کہ انہیں لکھنے پڑھنے کا دل سے شوق تھا۔ جن قیدیوں سے ملنے کا ہمیں موقع ملا تھا ہم انہیں پڑھاتے تھے اور وہ بڑی محنت سے کام کرتے تھے۔ اکثر جب آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ دو ایک قیدی بارک کے اندر دھندلی سی لالٹین کے پاس بیٹھے اپنا سبق یاد کر رہے تھے۔

غرض میں کتب بینی میں مصروف رہتا تھا۔ میں اپنے مطالعے کے موضوع بدلتا رہتا تھا مگر عموماً ٹھوس کتابیں پڑھتا تھا۔ ناولوں سے ذہن سست ہو جاتا ہے اس لیے میں نے زیادہ ناولیں نہیں پڑھیں۔ جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو لکھنے لگتا تھا۔ تاریخ عالم کے موضوع پر میں نے اپنی لڑکی کے نام خطوں کا جو سلسلہ لکھا ہے اس میں میں اپنی سزا کے پورے دو سال مصروف رہا اور اس سے میرے ذہن کی چستی اور مستعدی قائم رہی۔ ایک حد تک مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں اسی دور ماضی میں رہتا ہوں جس کی تاریخ میں لکھ رہا ہوں اس لیے میں اپنے جیل کے ماحول کو قریب قریب بھول گیا تھا۔

سفرنامے پڑھنے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ مثلاً ہیوں سانگ، مارکوپولو، ابن بطوطہ وغیرہ پرانے سیاحوں کے تذکرے اور زمانہ حال کے لوگوں مثلاً ہیڈن (جس نے وسطی ایشیا کے ریگستانوں میں سفر کیا ہے) اور روچ (جس نے تبت کے بڑے دلچسپ واقعات لکھے ہیں) وغیرہ کی کتابیں، تصویروں کی کتابیں خصوصاً پہاڑوں پر برف کے تودوں، اور ریگستانوں کی تصویریں دیکھنے میں بڑا لطف آتا تھا کیونکہ جیل

میں ہر شخص وسیع فضاؤں، سمندروں اور پہاڑوں کے لیے ترستا ہے۔میرے پاس موں بلاں، کوہ آلپس، اور ہمالیہ کی تصویروں کی چند خوبصورت کتابیں تھیں میں اکثر انہیں دیکھا کرتا تھا اور جب میری کوٹھڑی یا بارک کا درجہ حرارت ۱۱۵ ڈگری یا اس سے بھی زیادہ ہوتا تھا تو میں برف کے ان تودوں کو حسرت سے تکا کرتا تھا۔اٹلس کو دیکھ کر طبیعت میں بڑا ہیجان پیدا ہوتا تھا۔اس سے ان جگہوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی جنہیں ہم دیکھ چکے تھے اور ان مقامات کا تصور بندھ جاتا تھا جنہیں دیکھنے کا ارمان تھا۔بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ان پرانے منظروں کا لطف اٹھائیں۔ان لفظوں اور نشانوں کی سیر کریں جو بڑے بڑے شہروں کو ظاہر کرتے ہیں، ان موٹی گہری لکیروں پر سے گذریں جو پہاڑوں کی علامت ہیں اور ان نیلے دھبوں کو عبور کریں جو سمندر کی نشانی ہیں۔غرض دنیا کے تمام دلکش مناظر دیکھیں اور بدلتی ہوئی انسانی زندگی کی کش مکش کا مطالعہ کریں۔یہ آرزوئیں ہمیں بے چین کر دیتی تھیں اور جلدی سے ہم حسرت وافسوس کے ساتھ اٹلس کو اٹھا کر رکھ دیتے تھے اور پھر اسی چار دیواری میں لوٹ آتے تھے جو ہمیں گھیرے ہوئے تھی اور انہی بے کیف معمولات میں مصروف ہو جاتے تھے جو ہماری قسمت میں لکھے تھے۔

قید خانے کے جانور

ایک سال اور ڈھائی مہینے میں نے دہرہ دون جیل میں اپنی چھوٹی سی کوٹھڑی یا کمرے میں گزارے اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ گویا میں اس کا ایک جزو بن گیا ہوں۔ میں اس کے ہر حصہ سے آشنا تھا۔ سفیدی سے پتی ہوئی دیواروں، ناہموار فرش اور کرم خوردہ چھت کی کڑیوں کے ایک ایک نشان اور ایک ایک داغ سے واقف تھا۔ باہر مختصر سے صحن میں گھاس کے چھوٹے چھوٹے گچھے میرے پرانے دوست بن گئے تھے۔ میں اپنی کوٹھڑی میں تنہا نہیں تھا اس لیے کہ یہاں ہر قسم کے زہریلے کیڑے مکوڑوں اور بھڑوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ کڑیوں کے پیچھے چھپکلیوں کا ڈیرہ تھا جو ہر شام کو اپنے شکار کی تلاش میں باہر نکل آتی تھیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ انسان کے خیالات و جذبات کا کوئی نقش اس کے گرد و پیش میں باقی رہ جاتا ہے تو یقین ہے کہ اس کوٹھڑی کی تنگ فضا بھی طرح طرح کے خیالات سے معمور ہوگی اور وہ ہر چیز میں بسے ہوئے ہوں گے۔

دوسرے قید خانوں میں، میں اچھی اچھی کوٹھڑیوں میں رہا ہوں لیکن دہرہ دون جیل میں مجھے ایک ایسی رعایت حاصل تھی جس کی میں دل سے قدر کرتا تھا۔ یہاں کا اصل جیل خانہ نہایت مختصر ہے اور ہم جیل کے احاطہ ہی میں مگر اس کی دیواروں سے باہر ایک پرانی حوالات میں رہتے تھے۔ یہ جگہ بہت چھوٹی تھی اس قدر چھوٹی کہ اس میں ٹہلنے کی مطلق گنجائش نہ تھی لہذا ہمیں اجازت تھی کہ اپنی کوٹھڑی سے باہر جیل کے پھاٹک کے سامنے جو تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا صبح و شام ٹہل سکیں۔ گویا احاطہ جیل میں رہنے کے باوجود ہم اس کی دیواروں سے باہر نکل کر پہاڑ اور کھیتوں کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ پاس ہی آمد و رفت کے لیے ایک سڑک تھی لیکن اس رعایت سے جس کا میں نے ذکر کیا ہے صرف میں ہی بلکہ درجہ الف اور ب کے تمام قیدی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جیل کی دیواروں سے باہر مگر اس کے احاطہ کے اندر

ہی ایک اور چھوٹی سی حوالات بھی تھی جو یورپین حوالات کہلاتی تھی۔اس کے اردگرد کوئی دیوار نہ تھی لہذا اس میں بیٹھے ہی بیٹھے کوہستان کے دلفریب منظر اور بیرونی زندگی کا نظارہ ممکن تھا۔یورپین مجرم اور دوسرے قیدی جو یہاں رکھے گئے تھے انہیں بھی صبح و شام جیل خانے کے پھاٹک کے سامنے چہل قدمی کرنے کی اجازت حاصل تھی۔

صرف وہی قیدی جو ایک مدت تک جیل کی اونچی اونچی دیواروں کے اندر بند ہیں اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کی حدود سے باہر ٹہل لینا یا بیرونی دنیا کے وسیع اور کشادہ منظر سے لطف اندوز ہونا نفسیاتی اعتبار سے کیسی عجیب وغریب نعمت ہے۔ مجھے جیل سے باہر نکلنے کا اس قدر شوق تھا کہ برسات کے موسم میں بھی جب موسلا دھار بارش کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہتا اور مجھے ٹخنوں ٹخنوں پانی میں چلنا پڑتا میں نے نکل کر ٹہلنا ترک نہیں کیا۔اس قسم کی چہل قدمی یوں تو ہر جگہ اچھی معلوم ہوتی مگر قریب ہی سر بفلک ہمالیہ کا منظر میرے لیے مزید خوشی کا باعث ہوتا تھا جس سے دم بھر کے لیے قید خانہ کی پریشانی اور کلفت بڑی حد تک رفع ہو جاتی۔یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس طویل عرصہ میں جب ملاقاتوں کا سلسلہ بالکل مسدود ہو جاتا اور مجھے کئی مہینے لگاتار تنہا رہنا پڑتا یہ محبوب پہاڑ میری آنکھوں کے سامنے تھے۔کوٹھڑی کے اندر سے اگرچہ میرے لیے ان کا لطف اٹھانا ناممکن تھا مگر ان کا تصور میرے دل میں اس طرح سما گیا تھا کہ مجھے ان کے قرب کا ہر وقت احساس رہتا۔معلوم ہوتا تھا میرے اور ان کے درمیان ایک پراسرار ربط قائم ہو گیا۔

> پرندوں کے جھنڈ اڑتے اڑتے نظر سے غائب ہو گئے اور وہ بادل کا اکیلا ٹکڑا بھی تیرتا ہوا دور چلا گیا۔میں تنہا بیٹھا ہوں اور میرے آگے بہت دور چنگ ٹنگ کی بلند چوٹی کھڑی ہے۔ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں اکتاتے۔پہاڑ اور میں

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ شاعر لی ٹے پو کی طرح مجھے پہاڑوں سے کبھی وحشت نہیں ہوئی لیکن یہ بہت کم ہوتا تھا۔ عموماً مجھے ان کے قرب سے ایک طرح کی تسکین محسوس ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پہاڑوں کا وقار اور اثبات، لاکھوں کروڑوں برس کی حکمت و دانائی سے مالا مال مجھے چشم نمائی کرتا ہے، میرے تلون پر ہنستا ہے اور میرے بے چین دل کو سکون اور تقویت بخشتا ہے۔

ہندوستان کے نشیبی میدانوں کی نسبت دہرہ دون میں بہار کا موسم طویل بھی ہوتا ہے اور خوش گوار بھی، جاڑے میں درختوں کے پتے گر گئے تھے اور وہ ننگے ہو کر رہ گئے تھے۔ تعجب تو یہ ہے کہ پیپل کے وہ چار بڑے بڑے درخت جو پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے پتوں سے قریب قریب خالی ہو گئے تھے اور ان پر ایک افسردگی سی چھا گئی تھی۔ مگر پہاڑ کی ہواؤں نے انہیں پھر گرما دیا اور ان کے رگ و ریشہ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ دفعتاً ان پیپل کے پیڑوں اور تمام درختوں میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور ایک طلسمات کا عالم نظر آنے لگا، جیسے پردے کے پیچھے پراسرار قوتیں کام کر رہی ہوں۔ میں ان کی شاخوں میں ہری ہری کونپلیں پھوٹتے دیکھ کو چونک پڑتا تھا۔ یہ منظر نہایت ہی خوشگوار اور مسرت خیز تھا، دفعتاً لاکھوں کروڑوں پتے بڑی سرعت کے ساتھ شاخوں پر نمودار ہو کر آفتاب کی روشنی میں چمک اٹھے اور پھر ہوا کی تال پر رقص کرنے لگے۔ کونپلوں کا دیکھتے ہی دیکھتے پتے بن جانا کس قدر عجیب و غریب منظر ہے۔

اس سے پہلے میں یہ کبھی نہیں دیکھا تھا کہ آم کے نئے پتوں کا رنگ سرخی مائل بھورا ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے موسم خزاں میں کشمیر کے پہاڑوں پر ہلکا گلابی رنگ چھا جاتا ہے۔ لیکن یہ آم کے پتے بہت جلد اپنا رنگ بدل کر پھر سبز ہو جاتے ہیں۔

برسات کی بارشیں ہمیشہ خوش گوار ہوتی ہیں اس لیے کہ وہ گرمی کی تپش بجھا دیتی

ہیں مگر کبھی نعمت کی فراوانی زحمت بھی بن جاتی ہے اور دہرہ دون تو بارش کے دیوتا کا استھان ہے۔ برسات کی ابتدا میں شروع ہی کے پانچ چھ ہفتوں میں یہاں تقریباً پچاس ساٹھ انچ بارش ہو جاتی ہے۔ اس وقت جیل کے ایک تنگ گوشے میں دبک کر بیٹھ جانا اور یہ کوشش کرنا کہ آدمی ٹپکتی ہوئی چھت کے پانی یا کھڑکیوں میں سے آنے والی بوچھاڑ سے بچا رہے کچھ اچھا نہیں لگتا۔

برسات کے بعد خزاں کا موسم نہایت خوش گوار ہوتا تھا اور جاڑا بھی بشرطیکہ بارش نہ ہو۔ پانی کی بوچھاڑ، بجلی کی کڑک، تیز و تند ہواؤں کے چلنے سے دم الجھتا تھا اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ایک اچھا مکان، کسی قدر آسائش اور گرمی میسر ہو۔ بعض اوقات اولے گرتے تھے اور ایک ایک اولا کھیلے کی گولی سے بڑا ہوتا تھا۔ جب یہ اولے نالی دار آہنی چھت پر گرتے تو ان سے کچھ اس قسم کا زبردست شور پیدا ہوتا تھا جیسے توپیں چل رہی ہوں۔

ایک دن مجھے خاص طور سے یاد ہے۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کی چوبیسویں تاریخ تھی۔ دن بھر رعد و باراں کا زور رہا۔ سردی نہایت سخت تھی۔ جسمانی تکلیف کے لحاظ سے یہ سب سے بڑا دن تھا جو میں نے جیل میں گزارا۔ لیکن شام کو دفعتاً مطلع صاف ہو گیا۔ اردگرد کے تمام پہاڑ اور پہاڑیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں یہ دیکھ کر میری تمام افسردگی اور کلفت دور ہو گئی۔ اگلے روز بڑا دن تھا، صاف اور خوش گوار، اور برف آلود پہاڑوں کا منظر نہایت دلفریب معلوم ہوتا تھا۔

روزمرہ کے مشاغل سے محروم ہونے کی وجہ سے ہمیں فطرت کے مشاہدے کا شوق ہو گیا۔ مختلف قسم کے جانوروں اور کیڑوں کو جو وہاں موجود تھے ہم بہت غور سے دیکھنے لگے۔ جب میری مشاہدے کی قوت بڑھ گئی تو میں نے دیکھا کہ میری کوٹھڑی اور باہر صحن میں ہر قسم کے کیڑے مکوڑے موجود ہیں۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں تنہائی کی شکایت کرتا تھا اور یہ خبر نہ تھی کہ وہ احاطہ جو بظاہر خالی اور

ویران معلوم ہوتا تھا زندگی سے معمور ہے۔ ان رینگنے اور اڑنے والے کیڑوں نے مجھے کبھی نہیں ستایا اس لیے میں نے بھی انہیں نہیں چھیڑا البتہ کھٹملوں اور مچھروں اور ایک حد تک مکھیوں سے میری لڑائی مسلسل جاری رہی۔ بھڑوں اور زہریلے کیڑوں سے جو سینکڑوں کی تعداد میں میری کوٹھڑی میں موجود تھے میں نے کبھی تعرض نہیں کیا۔ مجھ میں اور ان میں صرف ایک دفعہ ذرا سا جھگڑا ہوا تھا۔ شاید ایک بھڑ نے نادانستہ طور پر مجھے کاٹا اور مجھے اس قدر طیش آیا کہ میں نے ان کو نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن انہوں نے اپنے چھتوں کو کو بچانے کے لیے جن میں غالباً ان کے انڈے تھے بڑی بہادری سے میرا مقابلہ کیا۔ مجبوراً مجھے اپنا ہاتھ روکنا پڑا اور میں یہ فیصلہ کیا کہ اگر آئندہ انہوں نے مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں دی تو میں بھی ان کو اپنے حال پر چھوڑ دوں گا۔ اس واقعہ کے بعد میں ایک سال سے کچھ اوپر ہی اس کوٹھڑی میں رہا ہوں لیکن ان بھڑوں یا زہریلے کیڑوں نے کبھی مجھے تنگ نہیں کیا اور ہم ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے۔

چمگادڑوں سے مجھے نفرت تھی لیکن مجبوراً انہیں بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ شام کے دھندلے میں وہ نہایت خاموشی سے پرواز کرتے اور ایک لحظہ کے لیے آسمان کی تاریک فضا کے مقابل نظر آ جاتے۔ ان بھیانک جانوروں سے مجھے ڈر لگتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میرے چہرے کے برابر سے گزر جاتے ہیں اور یہ خوف تھا کہ کہیں ہم ایک دوسرے سے ٹکرا نہ جائیں۔ بڑے بڑے چمگادڑ فضا میں بہت اوپر پرواز کرتے تھے۔

میں گھنٹوں، چیونٹی، دیمک اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کا مشاہدہ کیا کرتا تھا اور چھپکلیوں کا جب وہ شام کو رینگتی ہوئی، چپکے چپکے اپنے شکار کو تاکتی رہتیں یا کبھی نہایت مضحک انداز سے دم ہلا ہلا کر ایک دوسرے کا پیچھا کرتیں۔ عام طور پر یہ بھڑوں کی طرف سے بچتی تھیں۔ لیکن دو مرتبہ میں نے دیکھا کہ انہوں نے نہایت

احتیاط سے بھڑوں کا پیچھا کیا اور پھر دفعتاً سر سے انہیں دبوچ لیا۔ میں نہیں جانتا کہ انہوں نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو ڈنک سے بچایا یہ محض اتفاقی بات تھی۔

ان کے علاوہ گلہریاں قریب کے درختوں پر بے شمار تھیں۔ کبھی کبھی انہیں یہاں تک جرأت ہوتی کہ ہمارے پاس چلی آتی۔ لکھنؤ جیل میں کئی کئی گھنٹے قریب قریب بے حس و حرکت بیٹھا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس اثنا میں اکثر ایسا ہوتا کہ ایک گلہری میری ٹانگ سے ہوتی ہوئی گھٹنے پر آ بیٹھی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ دفعتاً میری آنکھیں اس سے چار ہوتیں اور وہ محسوس کرتی کہ میں کوئی درخت وغیرہ نہیں ہوں جو اس نے سمجھ رکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ خوف سے ٹھٹکتی اور پھر نہایت تیزی کے ساتھ بھاگ جاتی۔ بعض اوقات گلہریوں کے چھوٹے چھوٹے بچے درختوں سے گر پڑتے۔ ان کی ماں گلہری بھی ان کے پیچھے ہی آ جاتی اور ایک چھوٹی سی گیند کی طرح ان کا گچھا سا بنا کر انہیں کسی محفوظ گوشہ میں لے جاتی۔ کبھی یہ بچے گم بھی ہو جاتے تھے۔ ایک بار ایک رفیق کو اسی قسم کی تین گلہریاں مل گئیں جن کی ہم بہت دیر تک دیکھ بھال کرتے رہے۔ یہ گلہریاں اس قدر چھوٹی تھیں کہ ان کو کھلانا پلانا ناممکن سا معلوم ہوتا تھا۔ آخر یہ مسئلہ ایک نئی ترکیب سے حل کیا گیا یعنی میں نے فونٹین پین میں روشنائی ڈالنے کی نلکی کی نوک پر ذرا سی روئی لگا دی اور اس سے دودھ پلانے کی بوتل کا کام لیا۔

کبوتروں سے میں نے کوئی جیل خالی نہیں پایا۔ سوائے الموڑہ کے کوہستانی قید خانہ کے۔ دہرہ دون جیل میں سینکڑوں ہزاروں کبوتر تھے۔ شام کو ان کے جھنڈ کے جھنڈ سطح آسمان پر چھا جاتے بعض اوقات جیل کے عہدہ داران کا شکار کرتے اور کھا جاتے۔ یہاں مینائیں بھی تھیں جو ہر جگہ ہوتی ہیں ان کے ایک جوڑے نے میری کوٹھڑی کے دروازہ کے بالکل اوپر گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اور ان کی خوراک کا انتظام میرے ذمہ تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئیں کہ اگر صبح یا شام ان کے

کھانے میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو وہ میرے پاس چلی آتیں اور شور مچا مچا کر اپنی غذا طلب کرتیں ان کی حرکات وسکنات کو دیکھ دیکھ کر اور بے صبری کی چیخوں کو سن کر مجھے بے حد لطف آتا تھا۔

نینی میں بہت سے طوطوں نے میری بارک کی دیواروں میں درزوں کے اندر اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ان کا ایک دوسرے سے اختلاط اور اظہار محبت کرنا نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دو نر طوطوں میں کسی مادہ کی بدولت جنگ بھی ہو جاتی تھی۔ ان موقعوں پر مادہ نہایت اطمینان سے بیٹھی تماشا دیکھتی رہتی اور جس کی فتح ہوتی اسے اپنا مورد عنایت بناتی۔

دہرہ دون میں طرح طرح کے پرند موجود تھے۔ ان کے چہچہوں سے ایک شور برپا ہو جاتا تھا مگر کوئل کی دردناک کوک ان سب پر غالب آجاتی تھی۔ برسات اور برسات سے کچھ پہلے ''دماغی بخار'' کا پرند آجاتا اور مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس کا یہ نام کیوں رکھا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ دن ہو یا رات، دھوپ ہو یا بارش یہ پرند لگاتار ایک ہی نغمہ الاپتا رہتا ہے۔ ہمیں اکثر پرندے نظر نہیں آتے تھے ہم صرف ان کی آواز سنتے تھے۔ ہمارے مختصر سے صحن میں کوئی درخت نہیں تھا البتہ میں عقابوں اور چیلوں کو دیکھا کرتا تھا جو بہت اوپر ہوا میں نہایت خوصورتی سے منڈلایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ تیر کی طرح نیچے گرتیں اور پھر ہوا کے جھونکے میں اوپر اٹھ جاتیں۔ مرغابیوں کا جھنڈ البتہ ہمارے سروں پر سے گزر جاتا تھا۔

بریلی جیل میں بندروں نے ایک بہت بڑی نوآبادی قائم کر رکھی تھی۔ ان کی حرکتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ایک بندر کا بچہ کسی طرح ہماری بارک کے احاطہ میں آگیا اور باوجود کوشش کے دیوار کو نہیں پھاند سکا۔ یہ دیکھ کر جیل کے محافظوں، قیدیوں اور قیدی نگرانوں نے پکڑ کر اس کی گردن میں رسی ڈال دی۔ اس کے ماں باپ ایک اونچی سی دیوار پر بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ

رہے تھے اور ان کا غصہ لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ دفعتاً ان میں سے ایک جغاوری بندر نیچے کود پڑا اور اس ہجوم پر جس نے بند کے بچہ کو گھیر رکھا تھا حملہ کر دیا۔ یہ فعل غیر معمولی جرأت اور دلیری کا کام تھا اس لیے کہ محافظ اور قیدی نگران ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ڈنڈے لیے اس کو دھمکا رہے تھے اور ان کی تعداد بھی بڑی تھی آخر بے دریغ جرأت کو فتح ہوئی اور انسانوں کا ہجوم لاٹھیاں اور ڈنڈے سب کچھ چھوڑ کر ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ یوں بندروں نے اپنے بچہ کو انسانوں کے ہاتھ سے بچالیا۔

بعض اوقات جیل میں ایسے جانور بھی چلے آتے تھے جن کا آنا کچھ بہت زیادہ خوش گوار نہ تھا۔ بچھوؤں کو میں اکثر اپنی کوٹھڑی میں دیکھتا تھا۔ خصوصاً رعد و باراں کے طوفان کے بعد۔ عجیب بات یہ ہے کہ مجھے کبھی کسی بچھو نے نہیں کاٹا حالانکہ مجھے ان سے ایسی ایسی جگہوں پر سابقہ پڑا جہاں ان کی موجودگی کا وہم بھی نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً بستر پر۔ اکثر ایسا بھی ہو کہ میں نے کوئی کتاب پڑھنے کے لیے اٹھائی اور اس میں بچھو موجود تھا۔ میں نے ایک نہایت سیاہ بچھو کر جو شکل سے بہت زیادہ زہریلا معلوم ہوتا تھا بوتل میں بند کر رکھا تھا اور اسے مکھیاں وغیرہ کھلایا کرتا۔ ایک دن میں نے اس کو ڈوری میں باندھ کر دیوار پر چھوڑا تو وہ میرے ہاتھ سے بھاگ نکلا۔ اس کی آزادی کو میں خطرناک سمجھتا تھا اس لیے میں اپنی کوٹھڑی کا کونا کونا چھان مارا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

جیل میں میری کوٹھڑی میں یا اس کے قریب ہی تین چار سانپ بھی پائے گئے۔ ان میں سے ایک کی خبر کسی نہ کسی طرح باہر جا پہنچی اور اخباروں نے اسے موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ سچ پوچھئے تو مجھے اس سے تکلیف نہیں ہوئی بلکہ لطف آیا۔ قید خانہ کی زندگی بڑی بے کیف ہوتی ہے اور اس کی یکسانی کو جو چیز بھی توڑ دے وہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے سانپ اچھے معلوم ہوتے ہیں مگر مجھے ان سے وحشت نہیں ہوتی جتنی بعض اور لوگوں کو۔ ان کے ڈسنے سے

بے شک ڈر معلوم ہوتا ہے اور جب کبھی اس کا سامنا ہو جائے یقیناً اس سے اپنی حفاظت کی فکر کرتا ہوں میرے دل میں کراہیت یا غیر معمولی خوف کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ البتہ کنکھجوروں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ بلکہ ڈر سے زیادہ گھن آتی ہے۔ ایک مرتبہ علی پور جیل کلکتہ میں آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی چیز میرے پاؤں پر رینگ رہی ہے۔ میں نے چور مشعل کو جلایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کنکھجورا بستر پر موجود ہے۔ میں گھبرا کر بستر سے کودا اور کوٹھڑی کی دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا یہ موقعہ تھا جب میں نے صحیح طور پر محسوس کیا کہ پاولاف کی اضطراری حرکات کیا ہوں گی۔

دہرہ دون میں میں ایک نیا جانور دیکھا یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ جانور میرے لیے نیا تھا۔ میں جیل کے پھاٹک میں کھڑا جیلر سے باتیں کر رہا تھا کہ ہمیں ایک شخص نظر آیا جو ایک عجیب و غریب جانور کو اٹھائے لیے جا رہا تھا۔ جیلر نے اسے بلوا بھیجا تو نے دیکھا کہ یہ جانور چھپکلی اور مگر مچھ کے بین بین ہے۔ یہ تقریباً دو فٹ لانبا تھا اس کے پنجے اور کھال سفنہ دار تھی۔ اس بے ہنگم جانور کو جو ابھی زندہ تھا ایک عجیب و غریب طریق سے مروڑ کر جیسے گرہ لگائی جاتی ہے شکاری اسے بانس میں لٹکائے خوش خوش گھر لیے جا رہا تھا۔ ہم نے دریافت کیا تو اس نے بتلایا کہ اس جانور کو بو کہتے ہیں۔ جیلر کے اس سوال سے کہ وہ اسے کیا کرے گا اس شخص کی باچھیں کھل گئیں اور وہ کہنے لگا کہ میں اس کی بھجیا بناؤں گا۔ یہ شخص جنگل کا رہنے والا تھا۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد جھ میں ایف، ڈبلیو، چمپین کی کتا ''جنگل اندھیرے اور روشنی میں'' کا مطالعہ کر رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس جانور کو پنگولین کہتے ہیں۔

قیدیوں اور بالخصوص ان مجرموں کے لیے جن کی سزا بہت طویل ہو سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ ان کے جذبات افسردہ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ جانوروں کو پال کر اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ عام قیدیوں کو اس کی اجازت نہیں

ہوتی مگر قیدی نگراں جن کو تھوڑی بہت آزادی حاصل ہوتی ہے ایسا کریں تو حکام جیل کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ عام طور پر گلہریاں اور عجیب بات یہ ہے کہ نیولے پالے جاتے ہیں۔ کتوں کو تو جیل میں آنے کی اجازت ہی نہیں ہوتی البتہ بلیوں پر کوئی قید نہیں۔ ایک دفعہ بلی کا ایک چھوٹا سا بچہ مجھ سے مانوس ہو گیا جس کو دراصل جیل کے افسر نے پالا تھا۔ جب اس کی تبدیلی ہو گئی تو مجھے اس بچہ کی جدائی کا واقعی افسوس ہوا۔ کتے اگرچہ جیل میں نہیں آسکتے لیکن دہرہ دون میں بالکل اتفاقی طور پر ان سے سابقہ پڑ دیا۔ ہمارے جیل کے افسروں میں سے ایک صاحب اپنے ساتھ ایک کتیا لے آئے لیکن جن ان کی تبدیلی ہو گئی تو انہوں نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ اس پر یہ کتیا ادھر اُدھر ماری ماری پھرنے لگی۔ کبھی موریوں میں پڑی رہتی اور کبھی محافظین جیل کے یہاں سے اسے چند ٹکڑے مل جاتے۔ لیکن زیادہ تر اسے بھوکا ہی رہنا پڑتا۔ چونکہ میں قید خانے کے باہر حوالات میں رہتا تھا اس لیے کبھی کبھی خوراک کی تلاش میں یہ کتیا میرے پاس بھی آنکلتی تو میں نے اسے باقاعدہ کھانا پلانا شروع کیا۔ کچھ دن گزر گئے تو اس نے ایک نالی میں بہت سے بچے دیئے جن میں اکثر لوگ اٹھا لے گئے مگر تین بچ گئے۔ ان کی خوراک کا اہتمام میرے ذمہ تھا۔ مگر ایک مرتبہ جب ان میں ایک پلا بہت زیادہ بیمار ہو گیا تو مجھے اس کی وجہ سے بے حد تکلیف اٹھانا پڑی۔

بعض اوقات مجھے رات کو بار بار اٹھنا پڑتا تا کہ اس کی نگہداشت کر سکوں جب یہ پلا بچ گیا تو میں بہت خوش ہوا کہ میری تیمارداری رائیگاں نہیں گئی۔

جیل سے باہر مجھے کبھی جانوروں سے اتنا سابقہ نہیں پڑا جتنا جیل کے اندر، یہ صحیح ہے کہ کتوں کا مجھے ہمیشہ شوق رہا ہے۔ اور میں نے کئی بار ان کو پالا بھی لیکن اپنے دوسرے مشاغل کی وجہ سے کبھی پوری طرح ان کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ قید خانہ میں، میں کتوں کی رفاقت سے خوش تھا۔ عام طور سے ہم ہندوستانی جانوروں سے

پیار نہیں پالتے اور عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اہنسا کے عام فلسفہ کے ان سے اکثر لاپروائی بلکہ سختی کا سلوک کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر گائے ہی کو لے لیجئے۔ ہندوؤں کا یہ جانور کس قدر محبوب ہے وہ اس کی دیکھ کیا پرستش کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اس کے لیے بلوے بھی ہو جاتے ہیں۔ بایں ہمہ گائے سے کچھ بہت اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے عبادت کے ساتھ شفقت کا ہونا ضروری نہیں۔

مختلف ممالک نے مختلف قسم کے جانوروں کو اپنے مقاصد یا سیرت کے اظہار کے لیے علامت کے طور پر اختیار کر رکھا ہے۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ اور جرمنی نے عقاب، انگلستان نے شیر اور بل ڈاگ اور فرانس نے لڑتا ہوا مرغ قدیم، روس کا نشان ریچھ تھا۔ کیا جانوروں کو قومی نشان بنانے سے قوموں کی سیرت پر کچھ اثر پڑتا ہے؟ ان میں سے اکثر ..... لڑنے والے جانور بلکہ درندے ہیں۔ لہذا یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ جن قوموں نے اس قسم کی مثالوں کو سامنے رکھ کر نشوونما پائی ہے انہوں نے خود بھی قصداً اس قسم کے عادات و خصائل اختیار کر لیے ہیں۔ وہ دوسروں پر جھپٹتے ہیں غراتے ہیں اور موقع پا کر دبوچ لیتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہندوؤں کے دل میں حلم اور عدم تشدد کا غلبہ ہے تو اس پر بھی کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ان کا قومی نشان گائے ہے۔

جدوجہد

جیل سے باہر جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور ہمارے بہادر مرد اور عورتیں پر امن طریقہ سے ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کا مقابلہ کر رہی تھیں گو انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اس وقت یا مستقبل قریب میں ان کی کامیابی ناممکن ہے۔ دوسری جانب حکومت کے مسلسل اور ہر لحظہ بڑھتے ہوئے تشدد سے یہ حقیقت آشکارا ہو رہی تھی کہ ہندوستان میں اس کی بنا کس چیز پر قائم ہے۔ ہمیں کم سے کم اس خیال سے تسکین ہوتی تھی کہ اس کا پردہ چاک ہو گیا۔ بالآخر سنگینوں کو فتح ہوئی لیکن ایک بہت بڑے جنگجو کا قول ہے کہ "سنگینوں سے اور کام لے سکتے ہیں مگر ان پر بیٹھ نہیں سکتے" ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا اس طرح محکوم رہنا اچھا ہے بجائے اس کے ہم اپنے ضمیر بیچ ڈالیں اور روحانی اعتبار سے فنا ہو جائیں۔ قید خانوں میں اگر چہ ہمارے جسم بالکل بالکل بے بس تھے مرگ ہم محسوس کرتے تھے کہ ہم یہاں بھی اپنا کام کر رہے ہیں بلکہ شاید ان لوگوں سے بہتر کر رہے ہیں جو جیل سے باہر ہیں۔ مانا کہ ہم کمزور ہیں لیکن یہ بات کہاں ٹھیک ہے کہ ہم اپنے آپ کو بچانے کے ہندوستان کا مستقبل قربان کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی قوتیں اور اس کی طاقت محدود ہے اور ہمارے بہت سے ساتھی معذور ہو گئے یا مر گئے، بعض نے علیحدگی اختیار کر لی اور بعض نے ہمارے ساتھ غداری کی۔ پھر بھی ہماری جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان اپنے مقصد کو فراموش نہ کرے اور اپنی ہمت کو مضبوطی کے ساتھ قائم رکھے تو اس کی ناکامی کا کوئی امکان نہیں۔ حقیقی ناکامی یہ ہے کہ ہم اپنے اصولوں کو ترک کر دیں۔ یعنی اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائیں اور ظلم کے آگے ذلت سے سر جھکا دیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اپنوں کے لگائے ہوئے زخم دشمن کے لگائے ہوئے زخموں سے دیر میں بھرتے ہیں۔

اسی کمزوری اور حالات کی نامساعدت کو دیکھ کر اکثر طبیعت افسردہ ہو جاتی تھی

مگر اس کے باوجود ہمیں اپنی کامیابیوں پر فخر تھا کیونکہ ہماری قوم نے واقعی بڑی بہادری سے کام لیا تھا اور ہمیں یہ محسوس کر کے خوشی ہوتی تھی کہ ہم ایک شجاع اور باہمت جماعت کے فرد ہیں۔ سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں دو مرتبہ یہ کوشش کی گئی کہ کانگریس کا عام اجلاس منعقد کیا جائے، ایک مرتبہ دہلی میں اور دوسری مرتبہ کلکتہ میں۔ ظاہر تھا کہ ایک خلاف قانون جماعت امن و امان سے اپنا اجلاس کس طرح منعقد کر سکتی ہے۔ جب کبھی ایسا ہوتا پولیس سے اس کا تصادم ضروری تھا، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ان جلسوں کو پولیس ہمیشہ لاٹھی کے زور سے منتشر کرتی رہی۔ اس نے بہت سے لوگوں کو گرفتار بھی کیا لیکن یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان غیر قانونی اجتماعات میں سینکڑوں نمائندے ہندوستان کے ہر حصہ سے آئے اور مجھے یہ سن کر حیرت ہوتی تھی کہ صوبجات متحدہ کا حصہ ان میں بہت نمایاں تھا۔ مارچ ۱۹۳۳ء کے آخر میں جب اجلاس کلکتہ کی نوبت آئی ہے تو میری ماتا جی نے بھی اس میں شرکت پر اصرار کیا، لیکن پنڈت مالویہ اور ان کے رفقاء کی طرح وہ بھی گرفتار ہو گئیں اور انھیں کلکتہ جاتے ہوئے چند دن اسنسول کی جیل میں گزارنا پڑے۔ اس موقع پر انہوں نے جس ہمت اور قوت کا اظہار کیا اس سے مجھے بے حد تعجب ہوا۔ وہ کمزور تھیں اور بیمار بھی لیکن وہ قید خانے سے نہیں ڈرتی تھیں اس لیے کہ وہ اس سے زیادہ سخت مصیبتیں برداشت کر چکی تھیں۔ جس ماں کا بیٹا، دونوں بیٹیاں اور بہت سے عزیز جن کو وہ دل سے چاہتی تھیں، زیادہ تر جیل میں رہتے اسے خالی گھر سے وحشت نہ ہوتی اور کیا ہوتا۔

جب ہماری جدوجہد دھیمی پڑ گئی اور اس نے ایک خاص رفتار اختیار کر لی تو اس میں وہ جوش و خروش بھی نہیں رہا، البتہ بیچ میں کبھی کبھی لوگ بھڑک اٹھتے تھے۔ اس زمانہ میں میرے خیالات زیادہ تر دوسرے ملکوں کی سیر کیا کرتے تھے جہاں تک ممکن تھا میں نے جیل کے اندر اپنا وقت کساد بازاری کے مطالعہ میں گزارا جو دنیا پر چھائی

ہوئی تھی۔اس مبحث کے متعلق مجھے کوکتاب بھی ملی میں نے اسے پڑھ ڈالا۔اور جوں جوں مجھے زیادہ کتابیں دستیاب ہوتی گئیں میری دلچسپی بڑھتی گئی۔معلوم ہوتا تھا ہندوستان اوراس کے تمام مسائل اور جدوجہد اس زبردست ناٹک کا ایک سین ہے جوسیاسی اورمعاشی قوتوں کی کشمکش کی شکل میں دنیا بھر میں قومی اور بین الاقوامی اسٹیج پرکھیلا جارہا ہے۔اس جدوجہد میں میری ہمدردی کا رخ روز بروز اشتمالیت کی طرف ہوتا گیا۔

اشتراکیت اوراشتمالیت بہت دنوں سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں اورروس کا میرے دل پر خاص اثر تھا۔یہ صحیح ہے کہ میں اس ملک کی اکثر باتوں کو ناپسند کرتا تھا۔مثلاً مخالف رائے کا بے رحمی سے دبا دینا،مزدوروں کی جبری تنظیم اورمختلف کار روائیوں میں تشدد سے کام لینا جومیرے نزدیک غیرضروری تھا۔لیکن سرمایہ داروں کی دنیا میں بھی تو جبروتشدد کی کمی نہیں غرض مجھے روز بروز یقین ہوتا گیا کہ ہماری حریص سماج اور ہماری ملکیت کی بنیاد ہی تشدد پر قائم ہے اوربغیر تشدد کے اس کا زیادہ دن چلنا محال ہے۔اگر عام لوگوں کی یہی حالت رہی کہ بھوک اور فاقے کا ڈرانہیں چند آدمیوں کا حکم ماننے پر مجبور کرے اوران کی فلاح وعظمت کا باعث ہوتو تھوڑی سی سیاسی آزادی لے کر کیا کرنا ہے۔

تشدد سے دراصل کوئی بھی خالی نہیں،لیکن سرمایہ داری نظام کا تو خمیر ہی تشدد سے بنا ہے۔بہ خلاف اس کے روس کا تشدد اگرچہ بجائے خود کچھ بہت اچھی چیز نہیں پھر بھی اس کا مقصد ایک جدید نظام قائم کرنا ہے جوصلح واشتراک اور جمہور کی حقیقی آزادی پر مبنی ہے۔باوجود اپنی غلطیوں کے سوویت روس نے غیرمعمولی مشکلات پر غلبہ حاصل کیا ہے اورہمیں تسلیم کرنا پڑتے گا کہ اس جدید نظام کی تاسیس میں اس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔جب تمام عالم میں کسادی بازاری کا زور تھا اورکسی نہ کسی طرح ہر شخص کا قدم پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا،سوویٹ روس میں ہمارے دیکھتے ہی

دیکھتے ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی تھی۔ اس کی نظر لینن اعظم! جیسے بلند انسان کی قیادت میں مستقبل پر تھی اور صرف یہی دیکھتا تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ برعکس اس کے دوسرے ممالک ماضی کے از کار رفتہ ہاتھوں میں دب کر اپنی قوتیں زائل کر چکے تھے اور ان کی ساری کوشش یہ تھی، کہ گزرے ہوئے عہد کے نکمے آثار کو محفوظ رکھیں۔ وسط ایشیاء کے پس ماندہ ممالک نے سوویٹ حکومت کے ماتحت جو زبردست ترقی کی ہے۔ اس کی روداد نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ لہذا ان دونوں مظاہر کا مقابلہ کرتے ہوئے بالآخر مجھے روس کے ساتھ اتفاق کرنا پڑا اس تاریک اور سنسان عالم میں میرے سامنے ایک روشن اور حوصلہ افزا نمونہ پیش کر رہا تھا۔

لیکن اگرچہ سوویٹ روس کی کامیابی یا ناکامی ایک اشتمالی ریاست قائم کرنے کے عملی تجربے کی حیثیت سے بے حد اہم ہے، مگر نظریہ اشتمالیت کی صحت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ممکن ہے بالشویک اپنی غلطیوں یا بعض قومی یا بین الاقوامی وجوہ کی بنا پر ناکام رہیں اور پھر بھی اشتمالیت کا نظریہ بالکل صحیح ہو۔ خود اس نظریہ کی رو سے دوسروں کے لیے ہر بات میں اندھا دھند روس کی تقلید کرنا حماقت ہے اس لیے کہ روس نے اشتمالیت کو جس طریق پر استعمال کیا ہے اس کا انحصار اس ملک کے مخصوص حالات اور تاریخی نشو و نما پر ہے اور پھر ہندوستان اور دوسرے ممالک کو یہ موقع حاصل ہے کہ بالشویک روس کی غلطیوں سے بھی اتنا ہی فائدہ اٹھائیں جتنا اس کی کامیابیوں سے۔ غالباً بالشویکوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ اپنا قدم نہایت تیزی کے ساتھ آگے بڑھائیں۔ ان کے اردگرد دشمنوں کا نرغہ تھا اور وہ بیرونی حملہ آوروں سے ڈرتے تھے۔ اگر ان کی رفتار اس قدر تیز نہ ہوتی تو شاید وہ اس مصیبت سے جو دیہاتی علاقوں کو اٹھانی پڑی بچ سکتے تھے۔ لیکن اب سوال یہ ہے تبدیلی کی رفتار کم رکھنے سے انقلاب ممکن بھی تھا یا نہیں۔ ایسی نازک صورت حال میں جب ایک نظام میں بنیادی تبدیلی کرنی تھی جزوی اصلاحات سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ چاہے آگے

چل کر ترقی کی رفتار کتنی ہی سست کیوں نہ ہو پہلا قدم یہی ہونا چاہیے تھا کہ موجودہ نظام کا خاتمہ کر دیا جائے جو اپنا کام پورا کر چکا تھا اور آئندہ ترقی کی راہ میں حائل تھا۔

ہندوستان میں زمین اور صنعت کے مسائل ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، بلکہ تمام کا حل صرف اسی ممکن ہے کہ ایک انقلابی لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ مسٹر لائیڈ جارج اپنی تصنیف ''جنگ کی یادداشت'' میں لکھتے ہیں ''اس سے بڑی غلطی اور کیا ہوگی کہ ہم ایک کھائی کو دو جستوں میں عبور کرنے کی کوشش کریں۔''

مجھے روس سے بحث نہیں مگر مارکسیت کے نظریئے اور اس کے فلسفے نے میرے ذہن کے بہت سے تاریک گوشوں کو منور کر دیا۔ اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکسی تغیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ ایک ڈرامہ ہے جو گویا بتدریج کھیلا جا رہا ہے اور اس کی تہہ میں ایک مقصد اور نظام موجود ہے، خواہ وہ غیر شعوری کیوں نہ ہو۔ ماضی اور حال کی دل ہلا دینے والی تباہی اور بربادی کے باوجود مستقبل میں ہزارہا خطروں کے ساتھ امید کی روشنی جلوہ گر ہے۔ مارکسیت کا جو پہلو مجھے خاص طور پر پسند آیا وہ اس کا علمی طرز خیال اور اذعانی عقیدے سے قطعاً آزاد ہونا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ روس اور بعض دوسرے مقامات میں سرکاری اشتمالیت میں اذعانیت کا زور ہے اور جو لوگ اشتمالیت کے منکر ہیں ان پر تشدد کیا جاتا ہے۔ یہ امر بلاشبہ افسوس ناک ہے مگر سوویٹ ممالک میں جہاں زبردست تغیرات نہایت تیزی کے ساتھ رونما ہو رہے تھے اور اندرونی مخالفت کے قوی ہو جانے سے ہولناک ناکامی کا اندیشہ تھا، اس تشدد کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی عظیم الشان کساد بازاری اور نازک حالات سے اس نظریئے کی تائید ہوتی ہے جو مارکسیت نے تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے پیش کیا

ہے۔ جب اور تمام نظام اور نظریئے اندھیرے میں بھٹک رہے تھے یہی ایک اصول تھا جس نے کم وبیش صحت کے ساتھ ان مشکلات کی توضیح کی اور ان کا حقیقی حل پیش کیا۔

جوں جوں مجھے اس بات کا یقین ہوتا گیا میں نے اپنے دل میں ایک نیا جوش محسوس کرنا شروع کیا۔ قانون شکنی کی تحریک کے ناکام رہنے سے جو افسردگی پیدا ہو رہی تھی لحظہ بہ لحظہ کم ہوتی گئی۔ مجھے یہ نظر آنے لگا کہ دنیا نہایت تیزی کے ساتھ منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا راستہ جنگ کے زبردست خطرات اور مصائب و آفات سے پر ہے لیکن بہر حال ہم اس راستے کو طے کر رہے ہیں ہم میں جمود ہرگز نہیں ہے۔ قومی تحریک نے میری نظر میں اس دور دراز سفر کے ایک مرحلے کی صورت اختیار کر لی۔ میں نے اسے بہت غنیمت سمجھا کہ جبر و تشدد نے ہماری قوم کو آنے والی کشاکش کے لیے تیار کر دیا اور اس پر مجبور کر دیا کہ جو نئے خیالات اس وقت دنیا کو ہلا رہے ہیں ان پر غور کرے۔ جوں جوں ہمارے کمزور عناصر ہم سے دور ہوں گے ہم زیادہ مضبوط، زیادہ منضبط اور زیادہ پختہ ہوتے جائیں گے۔ وقت ہماری مدد کر رہا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے روس، جرمنی، انگلستان، جاپان، امریکہ، فرانس، چین، اسپین، اٹلی اور روس یورپ کے واقعات کا زیادہ احتیاط سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا اور کوشش کرتا رہا کہ موجودہ حالات کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا سکوں۔ مجھے ان کوششوں سے بے حد دلچسپی تھی جو آنے والے طوفان کو روکنے کے لیے ملک فرداً فرداً یا دوسروں کے ساتھ مل کر رہا تھا۔ بین الاقوامی کانفرنسوں کی ان مسلسل ناکامیوں سے جو سیاسی اور معاشی خرابیوں کی اصلاح کے لیے اور مختلف اسلحہ جات کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے منعقد کی جا رہی تھیں، مجھے وہ تکلیف دہ مسئلہ یاد آ جاتا تھا جو ہمیں اپنے ملک میں درپیش ہے یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ۔ باوجود انتہائی خلوص اور نیک نیتی

کے ہم اس مسئلہ کو ابھی تک حل نہیں کر سکے اسی طرح جیسے عالمگیر یقین کے باوجود کہ ان کی ناکامی تمام دنیا کے لیے ایک خوفناک حادثے کا باعث ہوگی یورپ اور امریکہ کے مدبرین ایک دوسرے سے اتفاق رائے نہیں کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں جس طریقے سے معاملے کو طے کرنے کی کوشش کی جارہی ہے وہ غلط ہے اور صحیح طریقہ اختیار کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی۔

دنیا کے مصائب اور نزاعات پر اس طرح غور کرتے کرتے میں اپنی ذاتی اور قومی مصیبتوں کو بھول گیا۔ بعض اوقات مجھے بڑی مسرت ہوتی تھی کہ تاریخ عالم کے اس نہایت ہی اہم انقلابی دور کا میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ دنیا کے اس گوشے میں آنے والے زبردست تغیرات میں میرا بھی کچھ حصہ ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جنگ اور تشدد کی فضا کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ جاتا۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک اور یاس انگیز منظر یہ تھا کہ بعض اچھے خاصے ذہین اور سمجھدار آدمی محکومیت و غلامی اور پستی اخلاق کے اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ ان کے دل انسان کے افلاس، اس کا دکھ درد اور مظلومیت سے بیزار کا جذبہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس دم گھٹنے والی فضا میں ہر طرف سوقیانہ شور وغل اور منظم فریب کا زور ہے اور نیک لوگ خاموش ہیں۔ ہٹلر اور ہٹلر کے بعد ''بھورے خط'' کی کامیابیوں سے مجھے بے حد قلق ہوا لیکن اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دی کہ یہ زیادہ دیر چلنے والی چیز نہیں۔ بعض دفعہ یہ بھی احساس ہوتا تھا کہ انسان کی سعی و کوشش بالکل بے سود ہے اس لیے کہ قدرت کی مشین اندھا دھند اپنا کام کر رہی ہے اور اس میں ایک چھوٹے سے پرزے کی حقیقت ہی کیا ہے۔

بایں ہمہ زندگی اشتمالی فلسفہ میرے لیے تسکین خاطر اور اطمینان کا باعث تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ ہندوستان میں اس پر کیوں عمل کیا جائے ابھی تو ہم نے سیاسی آزادی کا مسئلہ ہی حل نہیں کیا۔ ہمارے دلوں پر قوم پرستانہ نصب العین کا تسلط

ہے۔سوال یہ ہے کہ ہم معاشی آزادی کی کوشش بھی اسی وقت شروع کریں یا سیاسی آزادی کے بعد اس کی طرف توجہ دیں۔لیکن ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جو واقعات رونما ہو رہے ہیں ان سے قدرتاً سماجی مسئلہ روز بروز ہمارے سامنے آتا گی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ ہم اپنی سیاسی آزادی کے مسئلے کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتے۔

بین الاقوامی صورت حال نے لوگوں کے ذہن کو بڑی حد تک ان نئے خیالات کی طرف متوجہ کر دیا اور دنیا کی نازک صورت حالات نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اس بحث پر غور کریں۔اس طرح تحقیق اور تنقید اور موجودہ نظام کی مخالفت کی فضا پیدا ہو گئی۔اس سے پتہ چلتا تھا کہ اب ہوا کا رخ کس طرح ہے تاہم یہ تحریک نہایت کمزور اور ڈانواں ڈول تھی۔بعض لوگ فاشسٹ خیالات کی حمایت کر رہے تھے۔ غرض اشتراکیت کا کوئی صاف اور واضح تصور لوگوں کے ذہن میں نہیں تھا اور وہ ابھی تک قومیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

میں اس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی ہمارے لیے قومیت کا تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہے گا۔اگر کانگریس اب تک ہندوستان کی سب سے زیادہ مضبوط اور ترقی پسند جماعت ہے (بعض مزدور جماعتوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے) تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔پچھلے تیرہ برس سے اس نے گاندھی جی کے زیر قیادت اسی اوسط طبقے کے شہریوں کی ذہنیت کے باوجود ایک غیر معمولی بیداری پیدا کر دی ہے جس سے انقلابی مقاصد کو بڑی مدد ملی۔اس کا وجود ابھی تک کارآمد ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قومیت کے جذبہ کی جگہ سماجی انقلاب کا جذبہ پیدا ہو جائے اس لیے ہماری آئندہ ترقی اصول اور عمل دونوں کے لحاظ سے کانگریس سے وابستہ ہے۔اگرچہ ہم دوسرے ذرائع سے بھی کام لے سکتے ہیں۔

چنانچہ میرے نزدیک کانگریس سے قطع تعلق کرنا گویا قومی زندگی کی رو سے

الگ ہونا اور اپنے سب سے قومی حربے کو کھو دینا ہے۔ غالباً اس کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ ہم اپنی قوتوں کو بے کار تجربات میں ضائع کر دیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کانگریس اپنی موجودہ شکل میں کبھی ایسا کر سکے گی کہ ہمارے سماجی نظام کو بنیادی طور پر بدل ڈالے۔ اگر اس قسم کا کوئی مسئلہ اس کے سامنے پیش کیا جاتا تو یقین ہے کہ اس کے دو یا دو سے زیادہ ٹکڑے ہو جاتے اور اگر یہ نہ ہوتا تو اس کے بہت سے اجزاء اس سے الگ ہو جاتے۔ اگر اس سے ہر جماعت کے مقاصد بالکل صاف ہو جاتے اور ایک اچھی منظم پارٹی خواہ اسے کانگریس میں اکثریت حاصل ہوتی یا اقلیت، انقلابی سماجی پروگرام کی حمایت کرتی تو یہ صورت کچھ ایسی بہری نہ تھی۔

لیکن اس وقت کانگریس اور گاندھی جی ایک چیز تھے۔ سوال یہ تھا کہ گاندھی جی کیا کریں گے۔ اصولوں ونظریات کے لحاظ سے وہ بعض اوقات اس قدر پیچھے رہ جاتے ہیں کہ انسان کو تعجب ہوتا ہے لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے وہ بحالت موجودہ ہندوستان کے سب سے بڑے انقلاب پسند ہیں۔ انہوں نے ایک عجیب وغریب شخصیت پائی ہے اس لیے انہیں عام پیمانوں سے ناپنا یا معمولی منطقی اصول سے جانچنا ناممکن ہے۔ مگر چونکہ وہ فطرتاً انقلاب پسند ہیں، اور ہندوستان کی سیاسی آزادی کے حصول کا بیڑا اٹھا چکے ہیں اس لیے جب یہ آزادی حاصل نہ ہو جائے وہ یقیناً انتہا پسندانہ طرز عمل اختیار کریں گے۔ اس دوران میں وہ عام لوگوں میں زبردست قوتوں کو بیدار کر دیں گے اور مجھے تو تھوڑی سی امید ہے کہ وہ خود بھی رفتہ رفتہ اشتراکیت کی منزل کی طرف بڑھیں گے۔

ہندوستان اور ہندوستان کے باہر اکثر اشتمالی سالہا سال سے گاندھی جی اور کانگریس پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کر رہے ہیں اور کانگریس کے لیڈروں پر بدترین الزامات لگاتے ہیں۔ نظری اعتبار سے دیکھئے تو کانگریس کی ذہنیت کے متعلق ان کی بہت سی تنقیدیں نہایت صحیح اور برمحل تھیں جن کی آئندہ واقعات نے ایک حد تک

تائید بھی کی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے عام سیاسی حالات کا تجربہ جو بعض اشتمالی اس سے پہلے کر چکے تھے غیر معمولی طور پر صحیح ثابت ہوا لیکن اصول اور کلیات کی بحث سے قطع نظر کر کے جب تفصیلات کا اور کانگریس کی سرگرمیوں کا سوال آتا ہے تو اس میں بڑا دھوکا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اشتمالیوں کی قلیل تعداد اور بے اثری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اشتمالیت کی اشاعت و تبلیغ اور لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کے بجائے ان کا مشغلہ زیادہ تر دوسروں کی مذمت کرنا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا ردعمل ان کے لیے کس قدر مضرت رساں ثابت ہو رہا ہے۔ انہوں نے زیادہ تر مزدور حلقوں کو اپنی جولانیوں کا مرکز بنا رکھا ہے۔ جہاں دو چار چلتے فقرے مزدوروں کو ان کی طرف کھینچ لاتے ہیں، لیکن پڑھے لکھے لوگوں کے لیے محض چلتے ہوئے فقرے کافی نہیں۔ اشتمالی اس بات سے بے خبر ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں اوسط طبقہ سب سے بڑی انقلابی قوت کا مالک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کڑ اشتمالیوں کے اس طرز عمل کے باوجود بہت سے تعلیم یافتہ لوگ اشتمالیت کی طرف کھینچ آئے ہیں مگر ان دونوں کے درمیان ابھی تک ایک خلیج حائل ہے۔

اشتمالیوں کی رائے میں کانگریس کے لیڈروں کا مقصد یہ رہا ہے کہ حکومت پر عام لوگوں کا دباؤ ڈال کر ہندوستانی سرمایہ داروں اور زمینداروں کے لیے صنعتی اور تجارتی فوائد حاصل کریں۔ کانگریس کا کام یہ ہے کہ ''کسانوں'' نیچے اوسط طبقے کے لوگوں اور صنعتی مزدوروں کی سیاسی اور معاشی بے چینی کی قوت سے بمبئی، احمد آباد اور کلکتہ کے مالکان کارخانہ اور ساہوکاروں کی گاڑی چلائے، گویا ہندوستانی سرمایہ دار پس پردہ بیٹھے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے نام حکم جاری کر دیتے ہیں کہ اول جمہور میں ایک تحریک اٹھائے اور جب وہ بہت بڑھ جائے یا بہت خطرناک ہو جائے تو اسے دفعتاً ملتوی کر دیا جائے یا اصل راستے سے ہٹا کر کسی اور طرف موڑ دے۔ کانگریسی رہنما یہ نہیں چاہتے کہ انگریز سچ مچ ہندوستان سے چلے جائیں کیونکہ انہی

کی مدد سے یہاں کی فاقہ مست آبادی قابو میں رکھی جا سکتی ہے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور ہندوستان کا اوسط طبقہ اسے اپنے بس کی بات نہیں سمجھتا۔

یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ کانگریس کی سرگرمیوں کا جو عجیب وغریب تجزیہ ہم نے اوپر پیش کیا ہے اس کا بعض سمجھدار اشتمالیوں کو دل سے یقین ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ان کے خیالات اس قسم کے ہوں تو انہیں ہندوستان میں کیوں کر کامیابی ہو سکتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی قومی تحریک کا اندازہ یورپ کی لیبر تحریک کے معیار سے کرتے ہیں۔ چونکہ مغرب میں مزدوروں کے لیڈر اکثر ان سے غداری کرتے ہیں لہذا ان کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں بھی یہی حال ہوگا۔ انہوں نے اس بات کو فراموش کر رکھا ہے کہ ہندوستان کی قومی تحریک غریبوں یا مزدوروں کی تحریک نہیں یہ اوسط طبقے یعنی بورژوا کی تحریک ہے جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے اور اس کا مقصد محض سیاسی آزادی ہے نہ کہ سماجی نظام کی تبدیلی۔ یہ اعتراض کی جا سکتا ہے کہ یہ مقصد بہت محدود ہے اور قومی تحریک ایک فرسودہ چیز ہے۔ اس تحریک کی بنیاد سمجھ لینے کے بعد یہ کہنا بالکل مہمل ہے کہ اس کے رہنما عوام سے غداری کرتے ہیں کیونکہ وہ طریق زمینداری یا نظام سرمایہ داری کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ انہوں نے تو کبھی یہ دعویٰ ہی نہیں کیا البتہ کانگریس میں بعض لوگ اس قسم کے ضرور موجود ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ بھی ہو رہا ہے جو سرمائے اور زمین کے موجودہ نظام کو بالکل بدل دینا چاہتے ہیں مگر وہ ابھی تک اپنے آپ کو کانگریس کا ترجمان نہیں کہہ سکتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی سرمایہ دار جماعتوں کو (جن میں زمیندار اور تعلقہ دار شامل نہیں ہیں) برطانوی اور بدیسی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی کی ترویج سے بہت بڑا فائدہ پہنچا ہے اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا کہ ہر قومی تحریک ملکی صنعتوں کی حمایت اور بدیسی چیزوں کے بائیکاٹ کا سبق دیتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ

سول نافرمانی اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کے دوران میں بمبئی کے مالکان کارخانہ نے بطور ایک جماعت کے یہ جسارت کی یہ لنکا شائر کے ساتھ ایک معاہدہ کرلیا۔ کانگریس کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ہمارے قومی مقاصد کے ساتھ بہت بڑی غداری تھی اور اسے بجا طور پر غداری ہی سے تعبیر کیا گیا۔ بمبئی کے مالکانہ کارخانہ کے نمائندوں نے بھی جب ہم میں سے اکثر جیل میں تھے اسمبلی میں ہمیشہ کانگریسیوں اور ''انتہاپسندوں'' کا مضحکہ اڑایا۔

پچھلے سال سے سرمایہ دار طبقوں نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ کانگریس اور قومیت کے نقطہ نظر سے بھی شرمناک ہے۔ اٹاوا کے معاہدے سے ممکن ہے کسی چھوٹی سی جماعت کو عارضی فائدہ پہنچا ہو۔ مگر بحیثیت مجموعی اس نے ہندوستان کی صنعت کو نقصان پہنچایا اور اسے برطانوی سرمائے اور صنعت کا اور بھی محتاج کر دیا۔ یہ معاہدہ جو عام لوگوں کے لیے بے حد مضر تھا اس وقت کیا گیا، جب ہماری جدوجہد جاری تھی اور ہزارہا ہندوستانی جیل خانوں میں بند تھے۔ نوآبادیوں نے جہاں تک ہو سکا۔ انگلستان سے بہتر سے بہتر شرائط حاصل کیں لیکن ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے سب کچھ انگلستان کو بخش دیا۔ بعض من چلے ساہوکاروں نے بھی چاندی سونے کے کاروبار میں ہندوستان کے مفاد کو قربان کر کے خوب نفع کمایا۔

گول میز کانفرنس میں بڑے بڑے زمیندار اور تعلقہ دار آپس میں مل کر کانگریس کی مخالفت کرتے تھے۔ سول نافرمانی کے زمانے میں انہوں نے کھلم کھلا جارحانہ حیثیت سے حکومت کا ساتھ دیا۔ انہی کی امداد سے حکومت نے تعزیری ضابطوں کی شکل میں جابرانہ قوانین منظور کیے اور یوپی کونسل کے زمیندار اراکین کی بہت بڑی اکثریت نے ان لوگوں کی رہائی کی مخالفت کی جو سول نافرمانی کی تحریک میں قید ہوئے تھے۔

یہ خیال کہ گاندھی جی نے ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۰ء میں محض جمہور کے دباؤ سے وہ

تحریکیں جو بظاہر جارحانہ معلوم ہوتی تھیں شروع کیں سراسر غلط ہے۔ یہ سچ ہے کہ جمہور میں اکثر حرکت پیدا ہوتی رہی لیکن موقعوں پر خود گاندھی جی نے اسے ایک بڑی تحریک کی شکل دی۔ ۱۹۲۱ء میں تو انہوں نے تن تنہا کانگریس میں ترک موالات کی تحریک منظور کرائی اور ۱۹۳۰ء میں اگر وہ ذرا سی بھی مخالفت کرتے تو ہم ہرگز حکومت کے خلاف کوئی موثر اور جارحانہ طرز عمل اختیار نہ کر سکتے۔

یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ بعض اوقات محض حماقت یا ناواقفیت کی وجہ سے ذاتیات پر حملہ کیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے ہوتا کہ اصل مسئلے کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ گاندھی جی کے خلوص نیت پر حملہ کرنا خود اپنی ذات اور اپنے مقصد کو نقصان پہنچانا ہے۔ ہندوستان کے کروڑہا باشندوں کے نزدیک وہ حق وصداقت کا مجسمہ ہیں اور جو شخص ان سے ذرا بھی واقف ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کس جوش اور خلوص سے ہر موقع پر صحیح طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اشتمالیوں نے اپنے آپ کو بڑے بڑے شہروں کے مزدوروں سے وابستہ کر رکھا ہے۔ دیہاتی علاقوں سے نہ انہیں واقفیت ہے اور نہ ان سے کوئی تعلق ہے مگر ہندوستان کا مسئلہ اس وقت کسانوں کا مسئلہ ہے۔ اس لیے صنعتی مزدوروں کو اگرچہ وہ بجائے خود بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور مستقبل میں ان کی اہمیت برابر بڑھتی جائے گی وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا جو کسانوں کو حاصل ہے۔ کانگریسی کارکن اس وقت ہر جگہ دیہات میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ کانگریس کسانوں ہی کی ایک جماعت بن جائے گی لیکن کسان جب اپنا فوری مقصد حاصل کر لیتا ہے تو بہت کم انقلاب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لہذا ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی کچھ دنوں کے بعد شہر اور دیہات اور مزدور اور کسان کے مقابلہ کا مسئلہ چھڑ جائے۔

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ کانگریس کے لیڈروں اور کارکنوں کی ایک

بہت بڑی تعداد سے میرے تعلقات بہت گہرے رہے ہیں اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے ان سے بہتر انسان نہیں مل سکتے۔ پھر بھی میں نے ہر اہم معاملہ میں ان سے اختلاف کیا ہے اور بعض دفعہ مجھے اس بات پر کوفت بھی ہوئی ہے کہ بعض ایسی باتیں جو میری نظر میں بالکل عیاں اور واضح ہیں ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اتنی عقل نہیں رکھتے بلکہ یہ ہے کہ ہم نے فکر و نظر کی دنیا میں الگ الگ راہیں اختیار کر لی ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان سے نکلنا کس قدر مشکل اور دیر طلب ہے۔ یہ مختلف فلسفہ زندگی کے دائرے ہیں جن میں انسان بتدریج غیر شعوری طور پر نشو و نما پاتا ہے۔ اس لیے ان لوگوں کو جو ہم سے اختلاف خیال رکھتے ہیں۔ الزام دینا بیکار ہے۔ اشتراکیت نام ہے زندگی اور اس کے مسائل کے ایک خاص نفسیاتی نظریئے کا جس کا انحصار محض منطق پر نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے نظریئے بھی وارثت، تربیت، ماضی کی روایات اور موجودہ ماحول کے اثرات پر مبنی ہیں۔ یہ قوت صرف زندگی اور اس کے تلخ تجربات میں ہی ہے کہ وہ ہمیں نئی راہوں پر چلائیں اور رفتہ رفتہ ہمارے خیالات کو بدل دیں، جو اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ شاید ''انسان جو راہیں اپنے مقدر سے بچنے کے لیے اختیار کرے وہی اسے مقدر کی منزل پر پہنچا دیں۔''

مذہب کیا ہے؟

ستمبر ۱۹۳۲ء کے وسط میں ہمارا جیل کا پرسکون اور یکساں روزمرہ معمول یکا یک درہم برہم ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی گولا آ کر پھٹا ہو۔ خبر آئی، کہ گاندھی جی نے، ان جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب پر اظہار ناپسندیدگی کرنے کے لیے جو مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے اپنے فرقہ وارانہ فیصلہ میں نیچ ذاتوں کے لیے تجویز کئے تھے، اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ روزہ رکھ کر جان دے دیں گے۔ اس شخص میں بھی لوگوں کو جھنجھوڑنے کی کیسی کچھ صلاحیت ہے؟ میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ ہر قسم کے اتفاقات و احتمالات سامنے آئے، اور میرا ذہنی توازن بالکل بگڑ گیا۔ دو دن تک بالکل تاریکی میں رہا، کوئی روشنی نہ تھی جو راہ دکھاتی۔ گاندھی جی کے فعل کے بعض نتائج کا خیال آتا تو دل بیٹھا جاتا تھا۔ معاملہ کا ذاتی پہلو بھی خاصا قوی تھا اور دل میں کس کس دکھ کے ساتھ یہ خیال آتا تھا کہ شاید اب انہیں نہ دیکھ سکوں گا۔ کوئی سال بھر ہوا تھا کہ انگلستان جاتے وقت انہیں جہاز پر دیکھا تھا کیا یہی آخری دیدار ثابت ہونے کو تھا؟

پھر سخت الجھن ہوتی تھی کہ انہوں نے اپنی آخری قربانی کے لیے ایک ضمنی مسئلہ کو کیوں چنا؟ محض حلقہ ہائے انتخاب کے معاملہ کو! اس کا اثر ہماری تحریک آزادی پر کیا ہوگا؟

کیا یہ نہ ہوگا کہ کم سے کم تھوڑے دن کے لیے اہم تر مسائل پس پشت جا پڑیں گے اور اگر ان کا یہ مقصد حاصل ہو بھی گیا اور نیچ ذاتوں کے حلقہ ہائے انتخاب اور ہندوؤں کے ساتھ مخلوط ہو بھی گئے تو کیا اس کا ردعمل یہ نہ ہوگا کہ لوگ سمجھنے لگیں گے کہ اچھا کچھ تو مل ہی گیا اور اب تھوڑے دنوں کچھ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا ان کا یہ فعل فرقہ وارانہ فیصلہ کو اور اس کل تجویز کو جسے حکومت نے آگے بڑھایا ہے ماننے اور جزوی طور پر قبول کرنے کے مترادف نہیں؟

اور کیا یہ بات ترک موالات اور سول نافرمانی کے اصولوں کے مطابق ہے؟ اتنی قربانی، اتنی شجاعانہ سعی کے بعد ہماری تحریک ایک حقیر سی چیز ہو کر رہ جانے والی ہے؟

مجھے ان پر غصہ بھی آتا تھا کہ ایک سیاسی مسئلہ کو یوں مذہبی اور جذباتی طریق پر حل کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں بار بار خدا کا ذکر کرتے ہیں۔ معلوم تو ایسا ہوتا تھا کہ ان کے خیال میں خدا جانے روزہ کی تاریخ تک ان کے لیے مقرر کی ہے۔ لوگوں کے لیے یہ کیسی بری مثال قائم کرنا ہے؟

اور اگر باپو کہیں مر گئے؟ پھر ہندوستان کا کیا حال ہوگا؟ اس کی سیاست کس راہ پر چلے گی؟ سامنے تیرہ و تار مستقبل دکھائی دیتا تھا، اور جب اس کا خیال آتا تو دل پر یاس و حرماں کا تسلط ہو جاتا۔

غرض یونہی سوچتا تھا اور سوچے جاتا تھا۔ دماغ میں انتشار تھا اور غصہ و یاس اور اس شخص کے لیے محبت جو اس ساری پریشانی کا باعث تھا۔ سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کروں، طبیعت چڑ چڑی ہو گئی تھی ہر ایک سے جھگڑتا تھا اور سب سے زیادہ خود اپنے سے۔

پھر ایک عجیب کیفیت گزری۔ یوں سمجھئے کہ ایک جذباتی بحران سا ہوا اور جب وہ ختم ہوا تو طبیعت میں کچھ سکون محسوس ہوا اور مستقبل پھر اتنا تاریک نہ رہا، باپو میں ہمیشہ سے ایک عجیب صفت ہے کہ ٹھیک نفسیاتی موقع پر صحیح بات کر گزرتے ہیں، اس لیے خیال ہوا کہ شاید ان کا یہ فعل بھی، جسے بہت سے اعتبارات سے حق بجانب ثابت کرنا ممکن نہ تھا، بڑے نتائج کا باعث بن جائے اور صرف اس تنگ میدان ہی میں نہیں جس سے اس کو واسطہ ہے بلکہ قومی جدوجہد کے وسیع تر میدان میں بھی۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ اگر باپو مر گئے تو ہماری آزادی کی سعی تو بہر حال جاری رہے گی۔ اس لیے ہر چہ بادا باد ہمیں تیار رہنا چاہیے اور اپنے کو اس کام کا اہل بنانا چاہیے۔ اپنے ذہن کو یوں بے جھجک گاندھی جی کی موت تک کے مقابلہ کے لیے تیار

کرلیا تب کہیں سکون اور جمعیت خاطر نصیب ہوئی اور میں پھر دنیا اور اس کے ممکنات سے نبٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اس کے بعد اس حیرت خیز بیداری کی خبریں آئیں جو سارے ملک میں پیدا ہوئی، اس جادو اثر جوش کی لہر جو ساری ہندو سماج میں دوڑ گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ چھوت چھات بس اب ختم ہوئی۔ دل نے کہا کیسا کیسا جادوگر ہے۔ یہ چھوٹا سا آدمی جو یرودا کے قید خانہ میں بیٹھا ہے۔ یہ ان تاروں کو کتنی اچھی طرح پہچانتا ہے جن سے دلوں کو جنبش دی جاتی ہے۔

ان کا ایک تار مجھے ملا۔ سزایابی کے بعد ان کا پہلا پیام تھا۔ اتنے عرصہ کے بعد پیام پانے پر دل بہت خوش ہوا۔ اس تار میں انہوں نے لکھا تھا "کرب کے ان تمام دنوں میں تم میرے ذہن کی آنکھ کے سامنے رہے ہو۔ تمہاری رائے جاننے کا بڑا فکر ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری کی کتنی قدر کرتا ہوں۔ اندو سے اور سرپ کے بچوں سے ملا تھا۔ اندو خوش و خرم تھی، ذرا گوشت بھی آ گیا ہے۔ میری حالت بہت اچھی ہے۔ تار سے جواب دو۔ پیار"۔

بڑی نرالی بات تھی پر ٹھیٹھ گاندھی جی کی سی بات تھی کہ برت کی کلفت میں اور اپنی بے مشغولیتوں میں بھی انہیں اس کا خیال رہا کہ میری بچی اور میری بہن کے بچوں کے آنے کا ذکر کر دیا، اور اندرا کے موٹے ہو جانے تک کا! (میری بہن بھی اس زمانہ میں قید میں تھیں اور یہ سب بچے پونا کے ایک مدرسہ میں پڑھتے تھے) زندگی میں جو چیزیں یوں ذرا سی معلوم ہوتی ہیں، پر دراصل بہت کچھ ہوتی ہیں، یہ انہیں کبھی نہیں بھولتے۔

اسی زمانہ میں خبر ملی کہ حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق کچھ تصفیہ ہو گیا۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے مہربانی سے مجھے گاندھی جی کے تار کا جواب دینے کی اجازت دے دی اور میں نے یہ تار بھیجا۔ "آپ کے تار اور اس مختصر سی اطلاع نے کہ تصفیہ ہو گیا

دل کو خوشی اور اطمینان سے بھر دیا۔ برت کی خبر سے پہلے تو سخت ذہنی کوفت اور انتشار پیدا ہوا، لیکن آخر میں آس مشربی نے فتح پائی اور مجھے اپنا گم شدہ اطمینان قلب پھر مل گیا۔ دبے ہوئے مظلوم طبقوں کی خاطر جو قربانی بھی کی جائے کم ہے۔ آزادی کا معیار سب سے ادنی گروہ کی مذہبی نقطہ نظر سے تو کوئی حکم میں لگا نہیں سکتا۔ ڈر ہے کہ آپ کے طریقوں کو دوسرے بے جا طور پر استعمال نہ کریں۔ لیکن آپ جیسے جادوگر کو میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ پریم''۔

پونا میں جو ہر قسم کے لوگ جمع ہو گئے تھے انہوں نے ایک معاہدہ پر دستخط کئے اور برطانوی وزیر اعظم نے غیر معمولی عجلت کے ساتھ اسے قبول کر لیا۔ اور اپنے سابقہ فیصلہ میں اس کے مطابق تبدیلی کر دی، اور برت ٹوٹ گیا۔ مجھے ایسے میثاق اور معاہدے بہت ناپسند ہیں، مگر پونا کے معاہدے کا اس کے مفاد سے قطع نظر، میں نے دل سے خیر مقدم کیا۔

آخر یہ ہماہمی ختم ہوئی اور پھر وہی جیل کا روزمرہ معمول شروع ہوا۔ ہریجن کی تحریک اور گاندھی جی جیل خانے جو کام کر رہے تھے، اس کی اطلاعیں پہنچتی تھیں اور میرا دل ان سے کچھ بہت خوش نہ ہوتا تھا۔ اس میں تو شک نہیں کہ چھوت چھات کو ختم کرنے اور نیچ ذاتوں کو ابھارنے کی تحریک کو بڑی مدد پہنچی، لیکن اس عہدنامہ سے اس قدر نہیں جتنی کہ اس مجاہدانہ جوش سے جو تمام ملک کے اندر پیدا ہو گیا۔ اور یہ ایسی چیز تھی جس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

مگر اس میں شک نہیں کہ سول نافرمانی کو نقصان پہنچا۔ ملک کا دھیان دوسرے معاملوں کی طرف مڑ گیا اور کانگریس کے بہت سے کام کرنے والے ہریجن تحریک کی طرف چلے گئے۔ غالباً ان میں سے بہتیرے اس بات کا بہانہ ہی ڈھونڈ رہے تھے کہ کوئی ذرا زیادہ محفوظ کام مل جائے جس میں جیل جانے کا ڈر نہ ہو اور اس سے زیادہ لاٹھی کی مار اور املاک کی ضبطی کا خطرہ نہ ہو۔ یہ بات ہے بھی فطری اور اپنے

ہزار کارکنوں سے یہ توقع رکھنا بھی بے جا ہے کہ وہ ہر وقت انتہائی تکلیف اٹھانے اور اپنے گھر بار کو تباہ و برباد کر دینے کے لیے آمادہ رہیں گے۔ پھر بھی اس عظیم الشان تحریک کے اس تدریجی انحطاط کو دیکھ دیکھ کر جی بہت کڑھتا تھا، مگر باوجود اس کے سول نافرمانی ابھی جاری تھی اور کبھی کبھی تو بڑے پیمانہ پر مظاہرے بھی ہوتے رہتے تھے جیسے مارچ اپریل ۱۹۳۳ء میں کلکتہ کانگریس کا مظاہرہ۔ گاندھی جی بروادا جیل میں تھے مگر ان کے ساتھ خاص رعایت یہ کر دی گئی تھی کہ یہ لوگوں سے مل جل سکتے تھے اور ہریجن تحریک کے لیے ہدایات دے سکتے تھے۔ کچھ ہوا اس سے ناگواری میں کمی ہوگئی جو ان کے قید میں ہونے کی وجہ سے قوم میں تھی اس لیے ان سب باتوں سے طبیعت پست ہوتی تھی۔

کئی مہینہ بعد مئی ۳۳ء کے شروع میں گاندھی نے اپنا ۲۱ دن والا برت شروع کیا۔ اس کی اطلاع آئی تو بھی پہلے پہلے تو صدمہ سا ہوا۔ مگر میں نے اسے ایک ناگریز حادثہ جان کر قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ اپنے کو اس کا عادی بنا لیا۔ بلکہ مجھے اس سے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ جب وہ برت رکھنا ہی طے کر چکے اور اس اعلان بھی کر چکے تو لوگ کیوں خواہ مخواہ اس کے ترک کرانے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ برت میری سمجھ میں تو آتا نہ تھا، اور اگر فیصلہ سے پہلے مجھ سے رائے لی جاتی تو میں سختی سے اس کی مخالفت کرتا مگر میں گاندھی جی کے قول کی بڑی قدر کرتا ہوں اور مجھے یہ بات غلط معلوم ہوتی تھی کہ ایک خالص شخصی معاملہ میں جو ان کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا تھا کوئی بھی ان سے اس قول کے تڑوانے کی کوشش کرے۔ اس لیے اس برت پر ہر چند کہ بہت ناشاد تھا مگر راضی تھا۔

برت شروع کرنے سے پہلے انہوں نے مجھے اپنے مخصوص انداز میں ایک خط لکھا جس سے مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ انہوں نے جواب چاہا تھا اس لیے میں یہ تار بھیجا! ''آپ کا خط ملا جن باتوں کو میں سمجھتا ہی نہیں ان کی بابت کہہ کیا سکتا ہوں۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ پردیس میں بھٹک گیا ہوں! نشان راہ اگر کوئی ہے تو بس ایک آپ کی ذات۔ اندھیرے میں راہ ٹٹولتا ہوں اور ٹھوکریں کھاتا ہوں۔ جو بھی ہو، میرا دھیان اور میری محبت آپ کے ساتھ ہے۔''

ایک طرف میں ان کے فعل کو ناپسند کرتا تھا، دوسری طرف یہ فکر تھا کہ انہیں دکھ نہ دوں، اور ان دونوں میں کشمکش تھی۔ میں نے سوچا کہ میں نے انہیں دل دہی کا کوئی پیام نہیں بھیجا اور اب کے وہ اس تکلیف کی آزمائش میں اپنے کو ڈالنے پر تلے ہی ہوئے ہیں، جس میں ممکن ہے کہ زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں، میرا فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان کا دل بڑھاؤں۔ ذہن کی زندگی میں ذرا ذرا سی باتوں میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ اور اس مصیبت سے جانبر ہونے کے لیے انہیں اپنی اعصابی قوت کا شمہ شمہ درکار ہوگا۔ یہ بھی مجھے محسوس ہوا کہ اب جو کچھ بھی ہو، چاہے بدقسمتی سے ان کی موت ہی کیوں نہ واقع ہو، سب کو مضبوطی سے جھیلنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے انہیں یہ تار بھیجا: ''اب کے آپ نے اپنی عظیم الشان مہم شروع ہی فرما دی ہے میں اپنی محبت اور تبریک کا ہدیہ پھر پیش کرتا ہوں، اور یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اب بہت صاف محسوس ہو رہا ہے کہ جو کچھ ہوگا وہ اچھا ہوگا اور جو بھی ہو جیت آپ کی ہے''۔

وہ اس برت سے جانبر ہو گئے۔ برت کے پہلے ہی دن انہیں جیل سے چھوڑ دیا گیا اور ان کے مشورہ سے چھ ہفتے کے لیے سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی۔

اس برت کے زمانہ میں پھر میں نے اس جذباتی جوش کا نظارہ کیا اور بار بار سوچا کہ کیا آیا سیاست میں یہ بھی کوئی صحیح طریقہ ہے۔ یہ تو مری ہوئی چیزوں کو زندہ کرنا ہے اور اس کے مقابلہ میں وضاحت سے سوچنے سمجھنے کے لیے ذرا بھی تو موقع نہیں۔ سارا ہندوستان، یا اس کا بہت بڑا حصہ، ادب اور احترام سے مہاتما کا منہ تکتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ وہ معجزہ کے بعد معجزہ دکھائیں، چھوت چھات کو ختم کرا دیں، سوراج حاصل کرا دیں وغیرہ وغیرہ اور خود کوئی کچھ نہیں کرتا اور گاندھی جی ہیں

کہ دوسروں کو سوچنے سمجھنے کی ہمت نہیں دلاتے، ان کا اصرار ہے بس خلوص اور قربانی پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جذباتی وابستگی کے باوجود میں برابر ذہنی طور پر ان سے دور ہوتا جاتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر سیاسی کاموں میں ان کی جبلت سلیم ان کی صحیح رہنمائی کرتی ہے، عمل کا ولولہ بھی ہے، لیکن کیا عقیدت مندی کا راستہ ایک قوم کو تربیت دینے کا صحیح راستہ ہے؟ ممکن ہے کہ کچھ دن تو اس سے کام چلے، مگر پھر آگے؟

پھر ایک بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ موجودہ نظام معاشرت کو کہ تشدد اور کشاکش پر مبنی ہے کس طرح قبول کرتے ہیں اور معلوم یہی ہوتا تھا کہ قبول کرتے ہیں۔ میرے سینہ میں بھی کشاکش تھی، اور میری وفاداریاں مجھے مختلف سمتوں میں کھینچتی تھیں۔ جانتا تھا کہ قیدی کی غیر اختیاری آڑھٹی اور بہت سی دقتوں کا سامنا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بالکل یکہ و تنہا ہوں اور یکسر غریب الوطن، ہندوستان جسے اپنا دل دیا اور جس کے لیے جان لڑائی، ایک عجیب سا وحشت کدہ معلوم ہوتا تھا۔ سوچتا تھا کہ کہیں مرا ہی قصور تو نہیں کہ میں اپنے ہم وطنوں کی ذہنیت اور طریق کار کو نہیں اپنا سکتا؟ نہایت قریب کے ساتھیوں کے متعلق بھی معلوم ہوتا تھا کہ ان کے میرے درمیان ایک غیر مرئی روک ہے، جب اسے دور کرنے میں ناکام رہتا تو ناشاد ہوتا اور پھر اپنے ہی خول میں سمٹ رہتا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ انہیں چاروں طرف سے پرانی دنیا گھیرے ہوئے ہے، یعنی ماضی کے افکار، اور امیدوں اور آرزوؤں کی دنیا اور نئی دنیا ابھی بہت دور ہے۔ بقول شاعر ''دو دنیاؤں کے درمیان سرگرداں، ایک مردہ، دوسری میں پیدا ہونے کی ہنوز قدرت نہیں، غرض کہیں بھی سر دھرنے کا ٹھکانہ نہ تھا۔''

کہتے ہیں کہ اور سب باتوں سے زیادہ ہندوستان ایک مذہبی ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ سب اپنے اپنے مذاہب کر فخر کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا سر پھوڑ کر اس فخر کا ثبوت دیتے ہیں۔ جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے

ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے، میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک ظاہر کی ہے۔ تقریباً ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بجا فائدہ اٹھانے کا قدیم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے بقا کا حمایتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے میں جانتا ہوں کہ اس میں اور کچھ بھی ہے۔ کوئی ایسی بات، جس سے انسانوں کی ایک گہری احتیاج پوری ہوتی ہے ورنہ یہ ایک ایسی زبردست قوت کیسے ہوتا جیسی کہ رہ چکا ہے اور بے شمار، بے تاب روحوں کی تسکین و راحت کا سامان کیسے کرتا؟ اس کا بخشا ہوا امن کیا محض اندھے یقین اور بے سوالی کی پناہ ہے؟ وہ سکون ہے جو چین سے بندرگاہ میں پہنچ جانے اور کھلے سمندر کے طوفان سے بچ جانے پر حاصل ہوتا ہے؟ یا اس سے زیادہ کچھ اور؟ بعض صورتوں میں تو یقیناً یہ کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

لیکن منظم مذہب کا ماضی کچھ بھی رہا ہو آج تو وہ زیادہ تر ایک خالی شکل ہے جس میں حقیقت نام کو نہیں۔ مسٹر جی کے چسٹرٹن نے اس کی مثال (اپنے خاص مذہب کی نہیں، بلکہ اوروں کے مذہب کی!) ایک متجر جسم سے دی ہے جس کی شکل تو کسی جانور یا دوسری زندہ چیز کی ہے، جس کا نامی مغز سب غائب ہو گیا ہے بس خول اس لیے باقی ہے کہ اس میں کوئی بالکل ہی دوسری بھر گئی ہے۔ اگر مذہب میں کوئی قابل قدر چیز باقی بھی ہے تو وہ بہت کچھ دوسری چیزوں میں لپٹی ہوئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ حال مغربی مذہبوں کی طرح ہمارے مشرقی مذاہب پر بھی گزرا ہے۔ انگریزی کلیسا شاید اس مذہب کی سب سے واضح مثال ہے جو کسی حقیقی معنی میں مذہب نہیں۔ ایک حد تک تو یہ حال تمام منظم پروٹسٹنٹ مذاہب کا ہے، لیکن کلیسا انگلستان اس میں بہت آگے اس لیے نکل گیا ہے کہ یہ مدت سے ریاست کا ایک سیاسی شعبہ ہے (۱)۔

اس میں شک نہیں کہ اس کے معتقدوں میں بہت سے لوگ نہایت اعلیٰ سیرت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کلیسا نے کس کس طرح برطانوی سامراج کی خدمات انجام دی ہیں۔ اور سرمایہ داری اور سامراج دونوں کو ایک اخلاقی اور مسیحی لباس پہنایا ہے۔ اس نے اعلیٰ ترین اخلاقی معیاروں سے ایشیاء اور افریقہ میں برطانیہ کی غاصبانہ سیاست کو حق بجانب ثابت کیا ہے اور انگریزوں کے اندر اس غیر معمولی اور قابل رشک احساس کے پیدا ہونے کا سامان کیا ہے کہ وہ ہمیشہ حق بجانب ہی ہوتے ہیں۔ میں ٹھیک نہیں جانتا کہ برابر حق بجانب ہونے کا یہ آرام دہ خیال کلیسا نے پیدا کرایا ہے۔ خود کلیسا اس کی پیداوار ہے۔ براعظم یورپ اور امریکہ کی دوسری قومیں جو ذرا کم خوش حال ہیں، انگریز ان پر ریاکاری کا الزام لگاتے ہیں اور ''البیون (انگریز) کی دغابازی'' کا طعن بہت پرانا ہے۔ مگر یہ الزام غالباً برطانوی کامیابی پر حسد کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لیے کہ بھلا کوئی اور سامراجی طاقت پر برطانیہ کیا پتھر پھینکے گی، خود اس کا اپنا نامہ اعمال بھی تو اتنا ہی سیاہ ہوگا۔ جو قوم جان بوجھ کر ریاکاری کر رہی ہو وہ قوت کے ایسے محفوظ ذخیرے بروے کار نہیں لاسکتی جیسے کہ انگریز بارہا لائے ہیں اور معلوم یہی ہوتا ہے کہ مذہب کا جو خاکہ انہوں نے اختیار کی ہے اس نے ان کی بڑی مدد کی ہے یوں کہ جہاں خود ان کی اغراض کا معاملہ ہے وہاں اس نے ان کے اخلاقی حسن کو کند کر دیا ہے۔ لیکن اس میں انہیں کبھی اس قدر کامیابی نہیں ہوئی کہ اپنے فائدہ کی بات تو خیر اور نیکی بھی مان لیں۔ یوں ہم سب کو اس میں بڑی آسانی ہے کہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا دیکھیں اور اپنی آنکھ کا شہتیر نظر انداز کر دیں۔ لیکن شاید انگریز اور سب سے بازی لے گیا ہے۔

(۲)

پروٹسٹنٹ مذہب نے نئے حالات سے مطابقت کی کوشش کی اور اس کی تدبیر کی کہ دونوں دنیاؤں سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے

اسے بڑی کامیابی ہوئی لیکن دینی نقطہ نظر سے بہ حیثیت ایک منظم مذہب کے وہ نہ ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ مذہب کی جگہ محض جذبات اور کاروبار نے لے لی۔ کلیسا روما کے مذہب کا یہ حشر نہیں ہوا اس لیے کہ وہ یکسوئی سے اپنی پرانی جگہ پر جما رہا اور جب تک وہ جگہ مستحکم ہے یہ بھی پھلتا پھولتا رہے گا۔ اگر لفظ مذہب کے محدود معنی لیے جائیں تو آج مغربی دنیا میں کلیسا روما کا مذہب ہی ایک زندہ مذہب ہے۔ قید خانہ میں رومن کیتھولک دوست نے مجھے اپنے مذہب کی بہت سی کتابیں اور پاپائے روم کے گشتی اعلانات بھیج دیئے تھے اور میں نے انہیں بڑے شوق سے پڑھا۔ اور ان کے مطالعے سے مجھے معلوم ہوا کہ انسانوں کی اتنی کثیر تعداد پر اس مذہب کا کتنا تسلط ہے۔ اسلام اور عام ہندومت کی طرح یہ بھی شک و شبہ اور ذہنی انتشار کے طوفانی سمندر میں ایک محفوظ لنگر کا کام دیتا ہے۔ اور آنے والی زندگی کا یقین دلاتا ہے جس میں اس زندگی کی خامیوں کی تلافی ہو جائے گی۔

مگر کیا کروں میرے لیے اس طرح پناہ ڈھونڈنا ناممکن ہے۔ میں کھلے سمندر کو ترجیح دیتا ہوں اور اس کے طوفان و طغیانی کو۔ نہ مجھے بعد والی زندگی میں، اور موت کے بعد جو ہوگا اس میں کچھ بہت دلچسپی ہے۔ میرے ذہن کو مشغول رکھنے کے لیے تو اسی زندگی کے مسائل کافی ہیں۔ چینیوں کا روائتی نقطہ نظر جو اصولاً اخلاقی ہے مگر غیر مذہبی یا یوں کہیے کہ مذہبی تشکیک سے متاثر۔ وہ مجھے بہت بھاتا ہے، اگرچہ چینیوں نے جس اسے زندگی پر نافذ کیا ہے اس سے میں متفق نہیں۔ مجھے دلچسپی ہے ان کے "تاؤ سے" ان کے طریق حیات سے، اس راستہ سے جس پر کہ ان کے نزدیک چلنا چاہیے زندگی کو سمجھنا چاہیے اسے رد نہ کرنا چاہیے بلکہ قبول، اس سے مطابقت پیدا کرنا چاہیے اور اس کو بہتر بنانا چاہیے۔ لیکن معمولاً مذہبی رجحانکو اس دنیا سے کچھ سروکار ہی نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک یہ وضاحت فکر کا دشمن ہوتا ہے۔ اس لیے ہی نہیں کہ بعض مقررہ اور ناقابل تعزیز نظریوں اور عقیدوں کے بے چون و چرا تسلیم

کرنے پر اس کی بنیاد ہوتی ہے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ یہ جذبات جلی وخفی پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ اس چیز سے بہت دور ہوتا ہے جسے میں روحانیت اور روح کی باتیں جانتا ہوں اور یہ یا تو جان بوجھ کر یا نادانستہ حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اس لیے کہ کہیں حقیقت اس کے تعصّبات سے مطابقت کرنے سے معذور نہ ہو۔ یہ تنگ نظر ہوتا ہے اور دوسرے خیالات اور آراء کے سات رواداری نہیں برتتا۔ یہ خود غرض اور برخود غلط ہوتا ہے اور اکثر مطلبی لوگوں، موقع شناسوں کو اپنے سے بے جا فائدہ اٹھانے دیتا ہے۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اہل دین کبھی بھی اعلی ترین اخلاقی اور روحانی زندگی کا نمونہ نہ تھے یا اب بھی نہیں ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ ضرور ہیں کہ مذہبی نقطہ نظر کسی قوم کی اخلاقی اور روحانی ترقی میں مدد نہیں دیتا بلکہ اس میں حائل ہی ہوتا ہے، اگر اخلاق اور روحانیت کو اس دنیا کے معیاروں سے جانچا جائے نہ کہ آخرت سے۔ عموماً تو مذہب خدا یا ذات مطلق کی غیر معاشرتی جستجو بن کر رہ جاتا ہے اور مذہبی آدمی کو سماج کی بھلائی سے کہیں زیادہ اپنی شخصی نجات کی فکر رہتی ہے۔ صوفی اپنے کو نفس سے رہا کرنا چاہتا ہے اور اس کوشش میں اکثر نفس اس پر چھا جاتا ہے۔ اخلاقی معیاروں کو جماعتی ضروریات سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا، بلکہ ان کی بنیاد معصیت کے مافوق الطبیعت مسلک پر ہوتی ہے اور منظم مذہب تو بلا استثناء مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بن کر تبدیلی اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔

یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ مسیحی کلیسا نے شروع میں غلاموں کو اپنی معاشرتی حالت بہتر کرنے میں مدد نہیں دی۔ غلام لوگوں کو جو قرون وسطی کے منصب داری نظام میں زرعی چاکر کی حیثیت ملی تو وہ معاشرتی اسباب سے۔ کلیسا کا نقطہ نظر تو ابھی دو سو سال پہلے تک (۱۷۲۷ء تک) جو تھا اس کا پتہ ایک خط سے چلتا ہے جو لندن

کے بڑے پادری نے امریکہ کی جنوبی نوآبادیوں کے غلاموں کے مالکوں کو لکھا تھا۔

پادری صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ "مسیحیت سے کتاب مقدس کے قبول کرنے سے شہری حقوق ملکیت میں یا شہری تعلقات سے متعلق جو فرائض ہیں ان میں مطلق کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان سب حیثیتوں سے تو آدمی اسی حال میں رہتے ہیں جس میں وہ پہلے تھے۔ مسیحیت جو آزادی بخشتی ہے وہ تو گناہ سے، شیطان سے، اور انسان کے شہوات وجذبات اور بے جا خواہشات سے آزادی ہے۔ لیکن جہاں تک ان کی خارجی حالت کا تعلق ہے، وہ پہلے جو کچھ تھے، چاہے وہ آزاد تھے یا غلام، تو اس میں عیسائی ہو جانے یا بپتسمہ لینے سے یعنی کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔"

آج تو کوئی منظم مذہب اس صفائی سے اپنا یہ خیال ظاہر نہ کرے گا، لیکن سچ پوچھئے تو تہہ میں حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اس کا رویہ یہی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ الفاظ بجائے خود خیالات کے منتقل کرنے کا بہت باقص ذریعہ ہیں اور مختلف لوگ ان کے مختلف معنی سمجھ سکتے ہیں۔ اور شاید کسی زبان کے کسی اور لفظ کی مختلف لوگ اتنی مختلف تعبیریں نہ کرتے ہوں جتنی کہ لفظ مذہب، (یا دوسری زبانوں میں اس کے مرادف لفظ) کی۔ اس لفظ کو پڑھ کر یا سن کر شاید دو آدمیوں کے ذہن میں بھی خیالات وتصورات کا ایک سا مجموعہ سامنے نہ آتا ہوگا۔ جو خیالات و تصورات اس لفظ سے ابھرتے ہیں وہ کہیں رسم ورواج کے ہیں، کہیں مقدس کتابوں کے، کہیں آدمیوں کی جمعیت کے، تو کہیں چند قطعی عقائد کے، کہیں اخلاق، احترام، محبت کے، کہیں خوف ونفرت کے، خیرات، قربانی، رہبانیت کے، روزہ رکھنے کے اور خوب کھانے پینے کے، جشنوں کے، دعا وعبادت کے، قدیم تاریخ کے، شادی کے، موت کے، آنے والی دنیا کی، بلوؤں کے، سر پھوٹنے کے، غرض طرح طرح کے۔ تعبیروں اور تصوروں کی اس بے حساب رنگارنگی سے جو سخت انتشار پیدا

ہوتا ہے اس کے علاوہ اس کے ساتھ ساتھ تقریباً ہمیشہ ایک تیز جذباتی تحریک بھی شامل ہوتی ہے جس میں ٹھنڈے دل سے سوچنے سمجھنے کا امکان نہیں رہتا۔ لفظ مذہب کے کوئی واضح معنی اب باقی نہیں رہے ہیں (اگر کبھی تھے) چنانچہ اس سے سخت انتشار پیدا ہوتا ہے اور دلیل و بحث کا ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو کہیں ختم ہونے پر نہیں آتا۔ اس لیے کہ مختلف لوگ اس کے بالکل ہی جدا جدا معنی لیتے ہیں۔ بہت بہتر ہوتا اگر اس لفظ کا استعمال ہی ترک کر دیا جاتا اور اس کی جگہ دوسرے لفظ استعمال کئے جاتے جن کے معنی زیادہ محدود و معین ہوتے مثلاً دینیات، فلسفہ اخلاق، اخلاقیات، روحانیت، مابعد الطبیعات، فرض، رسم وغیرہ۔ خود یہ الفاظ بھی خاصے مبہم ہیں لیکن ان کا مفہوم مذہب، سے کہیں محدود ہے اور ایک بڑا فائدہ یوں ہوگا کہ ان لفظوں کے ساتھ وہ جذبات اس طرح وابستہ نہیں ہیں جن میں کہ لفظ مذہب چاروں طرف سے لپٹا ہوا ہے۔

پھر آخر مذہب ہے کیا؟ (اگر باوجود اس کے عیوب کے اسی لفظ کو استعمال کیا ہی جائے) غالباً اس سے مراد فرد کی اندرونی نشوونما ہے، یعنی اس کے شعور کا ارتقا کسی ایسی سمت میں جسے اچھا سمجھا جاتا ہے۔ پھر خود یہ بات موضوع بحث بن جاتی ہے کہ وہ سمت کیا ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں مذہب اس اندرونی تبدیلی پر زور دیتا ہے۔ اور خارجی تبدیلی کو اس داخلی نشوونما کا پرتو جانتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اندرونی تبدیلی خارجی ماحول پر زبردست اثر ڈالتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی اتنی ہی صاف ہے کہ خارجی ماحول بھی اس اندرونی تبدیلی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے پر اثر ڈالتی ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ مغرب کی جدید تہذیب میں خارجی ترقی اندرونی نشوونما کی نسبت بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا جیسا کہ مشرق کے بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ چونکہ ہم صنعت میں پیچھے اور ہماری

ترقی سست ہے اس لیے ہمارا اندرونی ارتقاء کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ بھی ان دھوکوں میں سے ایک دھوکہ ہے جن سے ہم اپنے کو تسلی دے لیا کرتے ہیں اور اپنے ہیٹے پن کے احساس پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ افراد حالات اور ماحول سے بالاتر ہو کر اندرونی بلندیاں حاصل کر لیں۔ لیکن انسان کے بڑے گروہوں اور قوموں کے لیے تو اندرونی ارتقاء شروع ہونے سے پہلے لازم ہے کہ خارجی نشوونما ایک خاص درجہ تک پہنچ چکا ہو۔ جو شخص معاشی حالات کا شکار ہو اور زندہ رہنے کی کشاکش اسے ہر طرف گھیرے ہوئے ہو وہ مشکل ہی سے شعور داخلی کے کسی بلند مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے۔ جو طبقہ دوسروں کے قدموں تلے پس رہا ہو اور دوسرے جس سے بے جا فائدے اٹھا رہے ہوں وہ کبھی اندرونی ترقی نہیں کر سکتا۔ جو قوم سیاسی اور معاشی اعتبار سے کسی دوسری قوم کی محکوم ہو اور ہر طرف سے گھری ہو، جس پر طرح طرح کی حد بندیاں ہوں، جس سے دوسرے فائدہ اٹھا رہے ہوں، اسے کبھی اندرونی ترقی نصیب نہیں ہو سکتی۔ غرض خود اندرونی نشوونما کے لیے باہر کی آزادی اور مناسب ماحول لازم ہو جاتا ہے۔ اس میں جو رکاوٹیں ہیں وہ ہٹ جائیں، پسندیدہ بات یہ ہے کہ جو وسائل اختیار کئے جائیں وہ ایسے ہوں کہ یہ مقصد فوت نہ ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب گاندھی جی فرماتے ہیں کہ وسائل مقصد سے زیادہ اہم ہیں تو ان کے خیال میں اسی قسم کی کوئی بات ہوتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ وسائل ایسے ہوں جو اس مقصد تک لے جا سکیں، ورنہ ساری کوشش ضائع ہو گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اندرونی اور بیرونی دونوں اعتبار سے حالت پہلے سے پست تر ہو جائے۔

گاندھی جی نے کسی جگہ لکھا ہے ''کوئی آدمی مذہب کے بغیر نہیں رہ سکتا بعض لوگ جو اپنی عقل کے غرور میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ انہیں مذہب سے سروکار نہیں، مگر اس کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو کہے کہ میں سانس لیتا ہوں مگر میرے ناک

نہیں'' پھر کہیں کہتے ہیں ''حق و صداقت کے ساتھ میری شیفتگی مجھے سیاست میں گھسیٹ لائی ہے اور میں ذرا سے تامل کے بغیر اگر چہ بڑے عجز کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے کچھ واسطہ نہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ مذہب ہے کیا'' زیادہ صحیح ہوتا اگر وہ یہ فرماتے کہ جو لوگ زندگی اور سیاست سے مذہب کو خارج کرنا چاہتے ہیں وہ لفظ مذہب کے معنی اس سے بالکل مختلف سمجھتے ہیں جو میں سمجھتا ہوں۔ یہ بات تو صاف ہے کہ گاندھی جی اس لفظ کو ایسے معنی میں استعمال کرتے ہیں (غالباً اور کسی معنی سے زیادہ اخلاقی معنی ہیں) جو مذہب کے نکتہ چینوں کے معنی سے مختلف ہے، ایک لفظ کو یوں مختلف معنوں میں استعمال کرنے سے ایک دوسرے کا مطلب سمجھنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

مذہب کی ایک بالکل نئی تعریف، جس سے اہل مذہب اتفاق نہ کریں گے۔ پروفیسر جان، دیوی کی تعریف ہے۔ ان کے خیال میں ''مذہب سب کچھ ہے جس سے وجود کے منفرد اور متغیر حوادث و واقعات میں حقیقی توحید منظر پیدا ہو۔'' یا پھر ایک جگہ کہتے ہیں کہ ''ہر وہ عمل جو کسی غیبی مقصد کے لیے موانع کے مقابلے میں اور شخصی نقصان کے ڈر کے باوجود کیا جائے اس لیے کہ اس کی عام اور مستقل قدر کا یقین ہے اپنی کیفیت میں مذہبی ہوتا ہے'' اگر مذہب یہ ہے تو پھر یقیناً کسی کو اس پر ذرا سا بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

رومین رولان نے بھی مذہب کے تصور کو پھیلا کر اسے وہ معنی دیئے ہیں جس سے شاید منظم مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگ کانوں پر ہاتھ دھریں۔ سوانح رام کرشن میں کہتے ہیں، ''بہت سی روحیں ہیں جو مذہبی عقیدہ سے آزاد ہیں یا سمجھتی ہیں کہ آزاد ہیں لیکن جو درحقیقت ہر لمحہ ایک فوق العقل شعور میں ڈوبی رہتی ہیں جس کا نام اشتراکیت رکھ لیتی ہیں یا اشتمالیت، انسان دوستی یا قوم پرستی یا عقلیت تک۔ خیال کی کیفیت سے اس کا منبع معین ہوتا ہے نہ کہ اس کے موضوع سے اور ایسی کیفیت کی

بنا پر ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب سے نکلا ہے یا نہیں۔ اگر وہ تلاش حق کی طرف بے خوف وخطر بڑھتا ہے، پھر چاہے جو بھی ہو اور یکسوئی اور خلوص کے ساتھ ہر قربانی کے لیے تیار ہے تو میں اسے ضرور مذہبی کہوں گا، اس لیے کہ وہ ضرور انسانی سعی کے لیے ایک ایسے مقصد پر یقین رکھتا ہے جو موجودہ معاشرہ کی زندگی سے بالا ہے بلکہ کل انسانیت کی زندگی سے بھی ارفع۔ خود تشکیک تک روح مذہبی کے لشکر بزرگ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے بشرطیکہ یہ تشکیک قومی اور کھری فطرتوں سے پیدا ہو اور کمزوری کا مظہر نہ ہو بلکہ قوت کا''۔

نہ جانے میں ان شرائط کو پورا بھی کرتا ہوں یا نہیں جو رومان رولان نے لگائی ہیں مگر ان حالات میں تو میں اس لشکر بزرگ کا ایک ناچیز پیادہ پیرو بننے کے لیے ضرور تیار رہوں۔

---

(۱) ہندوستان میں تو انگریزی کلیسا اور انگریزی حکومت میں تمیز کرنا بھی دشوار ہے، ہندوستان کی سرکاری آمدنی سے باضابطہ تنخواہ پانے والے پجاری اور پادری اسی طرح سامراجی قوت کے علمبردار ہیں جیسے کہ دوسری اعلیٰ خدمات والے۔ ہندوستانی ریاست میں بہ حیثیت مجموعی یہی کلیسا جمود اور ترقی دشمنی کی ایک قوت رہا ہے اور عام طور سے اس نے ہر ترقی اور اصلاح کی مخالفت کی ہے۔ مشن کے معمولی کام کرنے والے عام طور پر ہندوستان کے ماضی اور اس کے تمدن سے یکسر ناواقف ہوتے ہیں اور اس بات کے معلوم کرنے کی ذرا زحمت گوارا نہیں کرتے کہ یہ تمدن کیا تھا اور کیا ہے۔ اسے تو فکر بس زیادہ اس کا ہوتا ہے کہ کفارہ کے عیبوں اور گناہوں کو ظاہر کرے اس کلیہ کے بہت سے مستثنیات بھی ضرور ہیں مثلاً چارلی انڈریوز سے زیادہ سچا دوست ہندوستان کا اور کون ہے۔ ان کی ہمہ گیر محبت، ان کا جذبہ خدمت، ان کی بے حساب دوست داری، سے جی خوش ہو جاتا ہے۔ پونا کے کرسٹا سیوا نگ میں بھی چند اچھے انگریز ہیں جن کے مذہب نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ دوسروں کو سمجھیں اور ان کی سیوا نہ کریں نہ کہ خواہ مخواہ مشیخت جتائیں اور جنہوں نے اپنی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو ہندوستان کی بے غرض خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے اور بھی بہت سے انگریز اہل کلیسا ہیں جن کی یاد ہندوستان میں زندہ رہے گی۔

کنٹربری کے لاٹ پادری نے ۱۲ دسمبر ۳۳ء کو دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے ۱۲ء کے مانٹیگو جمسفورڈ والی اصلاحات کے تمہیدی کلمات کا ذکر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ یہ بڑا اعلان ذرا عجلت میں کر دیا گیا ہو اور گمان ہوتا ہے کہ یہ بھی منجملہ ان دریا دلی کی عاجلانہ حرکتوں سے ہے جو جنگ کے بعد کی گئیں۔ لیکن اب جو منزل مقرر ہو گئی اسے واپس لینا تو ممکن نہیں'' دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انگریزی کلیسا کا سردار ہندوستانی سیاست کے متعلق ایسا انتہائی قدامت پسندوں والا رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ قدم جسے ہندوستانی رائے عامہ نے بالکل ناکافی جانا تھا اور جس نے اسی وجہ سے عدم تعاون اور اس کے جملہ عواقب کے لیے راہ کھولی تھی۔ اسے یہ لاٹ پادری صاحب عجاب اور دریا دلی پر مبنی خیال فرماتے ہیں۔ انگریز حکمراں طبقہ کے نقطہ نظر سے بیشک یہ تسکین دہ خیال ہے اور اپنی ایسی دریا دلی کے یقین سے جو عاجلانہ بے احتیاطی کی حد تک پہنچتی ہو ضرور ان لوگوں میں اطمینان قلب کی ایک روحانی رو دوڑ جاتی ہوگی!

(۲) ہندوستانی سیاست پر کلیسا، انگلستان کے بالواسطہ اثر کی ایک مثال حال میں میرے علم میں آئی۔ صوبہ متحدہ کے عیسائیوں کی ایک کانفرنس، نومبر ۱۹۳۴ء کو کانپور میں ہوئی تھی۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر مسٹر ای وی ڈیوڈ نے فرمایا ''عیسائی ہونے کی حیثیت سے ہم مذہبًا ملک معظم کی وفاداری پر مامور ہیں کہ وہ ہمارے دین کے محافظ ہیں'' اس کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کو مدد دی جائے۔ آگے چل کر مسٹر ای وی ڈیوڈ نے سول سروس، پولیس اور کل مجوزہ دستور سیاسی کے متعلق انگلستان کے شدید قدامت پسند گروہ کے خیالات سے ہمدردی کا اظہار فرمایا کہ ان لوگوں کے نزدیک بھی اس جدید دستور سے احتمال ہے کہ ہندوستان میں مشن کا سارا کاروبار خطرہ میں پڑ جائے۔

برطانوی حکومت کی دورخی پالیسی

ہریجن تحریک جاری تھی۔ گاندھی جی پہلے یرودا جیل سے اس کی رہنمائی کرتے رہے اور اب باہر سے کر رہے تھے۔ اس بات کے لیے سخت جدوجہد ہو رہی تھی کہ مندروں کے داخلے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور کر دی جائیں اور اس کا ایک مسودہ قانون اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ اس وقت یہ حیرت انگیز منظر دیکھنے میں آیا کہ کانگریس کے ایک ممتاز لیڈر دہلی میں گھر گھر پھر رہے تھے اور اسمبلی کے ممبروں کو اس مسودہ قانون کی تائید پر راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو خود گاندھی جی نے ان کے ذریعہ سے اسمبلی کے ممبروں سے اپیل کیا تھا۔ مگر لطف یہ ہے کہ سول نافرمانی اب بھی جاری تھی اور لوگ جیل میں جا رہے تھے۔ اور کانگریس نے اسمبلی کا بائیکاٹ کیا تھا اور ہمارے سب ممبر استعفے دے کر چلے آئے تھے۔ بچے کچھے ممبروں نے اور ان لوگوں نے جو کانگریسی ممبروں کی جگہ منتخب ہوئے تھے اس نازک زمانے میں ہمیشہ کانگریس کی مخالفت اور حکومت کی موافقت کی تھی۔ ان کی اکثریت نے حکومت کو اس جابرانہ قانون کے پاس کرنے میں مدد دی تھی۔ جس کے ذریعہ سے تعزیری ضابطوں کو ایک مستقل شکل دے دی تھی۔ انہوں نے اٹاوے کے معاہدے کو چپ چاپ قبول کر لیا تھا، شملہ اور لندن میں بڑے بڑے آدمیوں کے ساتھ دوتیں اڑائیں تھیں، ہندوستان کی برطانوی حکومت کی شکرگزاری کے گیت گائے تھے اور اس کی ''دورخی پالیسی'' کی کامیابی کے لیے دست بدعا تھی۔

مجھے ان حالات میں گاندھی جی کے اپیل پر حیرت ہوئی اور اس سے بھی زیادہ اس پر کہ راج گوپال اچاریہ جو چند ہفتے پہلے کانگریس کے قائم مقام پریزیڈنٹ تھے ان حضرات کی تائید حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے سول نافرمانی کی جدوجہد کو نقصان پہنچا۔ میرے لیے اس کا اخلاقی پہلو اور زیادہ تکلیف دہ تھا۔ میرے خیال میں گاندھی جی یا کسی کانگریسی لیڈر کا یہ طرز عمل اخلاقاً

ناجائز تھا اور ایک قسم کی بدعہدی تھی ان ہزارہا آدمیوں سے جو جیل میں تھے یا اس تحریک کو چلا رہے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ گاندھی جی کا نقطہ نظر دوسرا ہے۔

حکومت نے اس وقت اور اس کے بعد داخلہ مندر کے مسودہ قانون کے متعلق جو رویہ اختیار کیا اس سے ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے اس کے حامیوں کی راہ میں ہر طرح کے روڑے اٹکائے، اس کو بار بار ملتوی کرتی رہی اور اس کے مخالفوں کو شہ دیتی رہی یہاں تک کہ آخر میں اس نے کھلم کھلا مخالفت کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ کم و بیش یہی رویہ وہ ہندوستان کی ہر سماجی اصلاح کے معاملے میں رکھتی ہے اور مذہب میں مداخلت نہ کرنے کے بہانہ سے وہ معاشرتی ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ وہ ہماری سماجی خرابیوں پر نکتہ چینی کرتی ہے اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرتی ہے۔ اتفاق سے ساردا بل جو بچپن کی شادی کو روکنے کے لیے پیش کیا گیا تھا منظور ہو گیا مگر اس بدنصیب ایکٹ کا جو حشر ہوا اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حکومت کو اس قسم کی تجویزوں پر عمل کرنا کس قدر ناگوار ہوتا ہے۔ وہی حکومت جو راتوں رات تعزیری ضابطے بنا ڈالتی ہے۔ جن میں نئے نئے جرم تراشے جاتے ہیں اور ایک شخص کے جرم کی سزا دوسروں کو دی جاتی ہے، جو بیسیوں ہزار آدمیوں کو ان ضابطوں کی خلاف ورزی کرنے پر جیل بھیج دیتی ہے وہ ساردا ایکٹ جیسے باقاعدہ قانون کو نافذ کرنے سے ڈرتی ہے۔ سب سے پہلے تو اس ایکٹ کا اثر بالکل الٹا ہوا۔ اس لیے کہ اس میں ازراہ حماقت لوگوں کو چھ مہینے کی مہلت دی گئی تھی جس سے بے شمار آدمیوں نے فائدہ اٹھایا۔ اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ ایکٹ محض ایک مذاق ہے اور اگر اس کی خلاف ورزی کی جائے تو حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوتی۔ سرکاری طور پر اس کی اشاعت کی مطلق کوشش نہیں کی گئی اور بہت سے گاؤں والوں کو آج تک معلوم نہیں ہوا کہ اس ایکٹ کا کیا منشاء ہے۔ اس کے سامنے ہندو مسلمان مذہبی واعظ اس کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے تھے جنہیں خود بھی صحیح

واقعات کا علم نہ تھا۔

ظاہر ہے کہ حکومت ہندوستان کی معاشرتی خرابیوں کے معاملے میں جو رواداری کا برتاؤ کرتی ہے اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ ان کی موید ہے۔ بلکہ اس میں شک نہیں کہ اسے ان خرابیوں کے دور کرنے کی فکر نہیں کیونکہ ان سے اس کے کام میں یعنی ہندوستان پر حکومت کرنے میں اور اس کی دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں خلل پڑتا ہے۔ پھر یہ خطرہ بھی ہے کہ سماجی اصلاح کی تجاویز سے بعض لوگ ناراض ہو جائیں گے اور چونکہ حکومت کو ملک کی سیاسی مخالفت سے نبٹنا دشوار ہے اس لیے وہ نہیں چاہتی کہ اپنے لیے اور مشکلات پیدا کر لے مگر کچھ دنوں سے سماجی مصلحوں کے کام میں اور بھی سخت دشواری پیدا ہو گئی ہے اس لیے کہ حکومت روز بروز معاشرتی خرابیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے زیادہ رجعت پسند جماعتوں میں رہتا ہے۔ جوں جوں اس کی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب قسم کے حمایتی ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور آج کل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی انتہائی فرقہ پرست، مذہبی رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی، معاشی اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں۔ ہندو مہاسبھا بھی ان سے کچھ کم نہیں مگر سناتن دھرمی رجعت پسندی میں اس سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ جو مذہب کے معاملے میں ہر قسم کی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں اور اسی کے ساتھ برطانوی حکومت کے پکے وفادار ہیں یا کم سے کم زور شور سے وفاداری کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اگر حکومت خاموش رہی اور اس نے ساردا ایکٹ کو ہر دلعزیز بنانے اور نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی تو کانگریس یا دوسری غیر سرکاری جماعتوں نے اس کے لیے پروپیگنڈہ کیوں نہیں کیا؟ یہ سوال برطانیہ کے اور دوسرے ملکوں کے نکتہ چینیوں

کی طرف سے اکثر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے وہ پچھلے پندرہ سال سے خصوصاً ۱۹۲۰ء سے برطانوی حکومت سے قومی آزادی کی شدید جنگ میں مصروف ہے جس پر اس کی موت اور زندگی کا دارومدار ہے۔ رہیں دوسری انجمنیں تو ان میں حقیقی قوت ہے اور نہ عام لوگوں سے تعلق ہے۔ وہ عورتیں اور مرد جو اعلیٰ مقاصد اور اخلاقی قوت رکھتے ہیں اور عوام میں ہر دلعزیز ہیں سب کے سب کھنچ کر کانگریس میں چلے آئے ہیں اور زیادہ تر اپنا وقت قید فرنگ میں گزارتے ہیں۔

دوسری انجمنیں اس سے آگے نہیں بڑھتیں کہ چند منتخب لوگوں کو جمع کر کے رزولیوشن پاس کر دیں۔ عام لوگوں سے تعلق پیدا کرنے کی ان میں جرأت نہیں۔ مردوں کی انجمنیں جنٹلمینوں کی طرح اور انجمن خواتین ہند لیڈیوں کی شان سے کام کرتی ہیں اور جارحانہ پروپیگنڈا کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ تعزیری ضابطوں، اور قانونوں نے جو ہر قسم کی پبلک جدوجہد کو دبانے کے لیے بنائے گئے تھے ان انجمنوں کو بھی معطل کر دیا تھا، ممکن ہے کہ مارشل لا انقلابی جدوجہد کو کچل دے مگر اسی کے ساتھ وہ تمدن اور تمدنی جدوجہد کو بھی معطل کر دیتا ہے۔

مگر کانگریس اور دوسری غیر سرکاری انجمنوں کا سماجی اصلاح میں زیادہ حصہ نہ لینے کا اصلی سبب اس سے زیادہ گہرا ہے۔ ہم لوگ قوم پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ہمارے دل و دماغ پر اسی کا خیال چھایا ہوا ہے اور اس وقت تک چھایا رہے گا جب تک ہمیں سیاسی آزادی حاصل نہ ہو جائے۔ برنارڈ شاہ کا یہ قول ہمارے حسب حال ہے ''محکوم قوم کی مثال اس شخص کی سی ہے جو سرطان کے مرض میں مبتلا ہو۔ وہ دن رات اسی کی فکر میں رہتا ہے..... سچ پوچھئے تو کسی قوم کے لیے قومی تحریک سب سے بڑی مصیبت ہے۔ یہ ایک طبعی عمل کے روک دیئے جانے کی تکلیف دہ علامت ہے۔ محکوم قومیں دنیا کی رفتار ترقی میں پیچھے رہ جاتی ہیں اس لیے کہ ان کی ساری توجہ

اس کوشش میں صرف ہوتی ہے کہ کس طرح قومی آزادی حاصل ہو اور قومی تحریک سے پیچھا چھوٹے۔''

پچھلے تجربے سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہم موجودہ حالات میں سماجی ترقی نہیں کر سکتے اگرچہ بظاہر حکومت کے بعض منتخب شدہ وزیروں کی طرف منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ حکومت کے انتہائی جمود سے ہمیشہ قدامت پسندوں کو مدد ملتی ہے اور برٹش گورنمنٹ مدتوں سے ہماری روح عمل کو کچلتی رہی ہے اور ہم پر استبدادی بالقول خود بزرگانہ حکومت کرتی رہی ہے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ غیر سرکاری لوگ کوئی غیر منظم تحریک شروع کریں اور اسے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کی نیت کچھ اور ہے۔ ہریجن تحریک اپنے چلانے والوں کی انتہائی احتیاط کے باوجود کبھی کبھی سرکاری ملازموں سے ٹکرا جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کانگریس سارے ملک میں یہ پروپیگنڈا کرے کہ صابون زیادہ مقدار میں استعمال کیا جائے تو بہت سے مقامات پر اس سے اور حکومت سے ٹکر ہو جائے گی۔

میرے خیال میں اگر ریاست سماجی اصلاح کو اپنے ہاتھ میں لے لے تو عام لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کے میں کوئی زیادہ دقت نہیں ہو گی مگر غیر ملکی حکمرانوں کی طرف سے لوگوں کو ہمیشہ شبہ رہتا ہے اور ان کو خیالات کے بدلنے میں زیادہ کامیابی نہیں ہو سکتی اگر غیر ملکی حکومت ہٹ جائے اور معاشی تبدیلیاں مقدم رکھی جائیں تو قابل اور مستعد حکام آسانی سے بڑی بڑی اصلاحیں کر سکتے ہیں۔

مگر جیل میں ہمیں سماجی اصلاح اور ساردا ایکٹ اور ہریجن تحریک کی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی بلکہ مجھے تو یہ بات ناگوار تھی کہ ہریجن تحریک نے سول نافرمانی میں رکاوٹ ڈال دی، شروع مئی ۳۳ء میں ہریجن تحریک چھ ہفتے کے لیے ملتوی کر دی گئی اور ہم کو یہ فکر تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ التوا کی وجہ سے تحریک کا رہا سہا زور ختم ہو گیا کیونکہ قومی لڑائی کوئی کھیل نہیں کہ جب چاہا شروع کر دیا اور جب چاہا بند کر

دیا۔ التوا سے پہلے بھی تحریک کیلیڈر بڑی کمزوری اور بودے پن کا ثبوت دے رہے تھے۔ جابجا چھوٹی چھوٹی کانفرنسیں ہو رہی تھیں اور طرح طرح کی افواہیں مشہور کی جاتی تھیں جن سے عملی کام میں خلل پڑتا تھا۔ کانگریس کے بعض قائم مقام پریزیڈنٹ بہت قابل قدر لوگ تھے مگر انہیں جنگ کا سپہ سالار بنانا ان پر بڑا ظلم تھا۔ وہ کچھ تھکے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس مشکل سے کسی طرح پیچھا چھڑائیں۔ بڑے لیڈروں کی اس ہچکچاہٹ اور لیت ولعل سے کچھ لوگ بیزار تھے مگر وہ اپنی بیزاری کا اظہار منظم طریقے سے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ تمام کانگریس کمیٹیاں خلاف قانون دے دی گئیں تھیں۔

اسی حالت میں گاندھی جی کا اکیس دن کا برت شروع ہوا۔ وہ جیل سے رہا کر دیئے گئے اور سول نافرمانی چھ ہفتے کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ برت ختم ہو گیا اور گاندھی جی کو رفتہ رفتہ افاقہ ہونے لگا۔ وسط جون میں سول نافرمانی کے التوا کی معیاد چھ ہفتے اور بڑھا دی گئی اس اثناء میں حکومت کے جبر و تشدد میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ جزیرہ انڈمن میں سیاسی قیدی (بنگال کے انقلابی مجرم وہاں بھیجے گئے تھے) بدسلوکی کی وجہ سے بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔ ان میں دو ایک فاقے کرتے کرتے مر گئے اور بہت سے قریب المرگ تھے۔ جن لوگوں نے ہندوستان میں انڈمن کے واقعات کے خلاف احتجاج کے جلسے کئے انہیں بھی گرفتار کر کے سزا دے دی گئی۔ حکومت کی مرضی یہ تھی کہ ہم تکلیف اٹھائیں اور اف تک نہیں کریں۔ چاہے سیاسی قیدی جن کے پاس بھوک ہڑتال کے سوا احتجاج کا کوئی ذریعہ نہ تھا ایڑیاں رگڑ کر مر جائیں۔ چند مہینے بعد ستمبر ۳۳ء میں (جب میں جیل سے رہا ہو چکا تھا) ایک اپیل شائع کیا گیا جس پر رابندر ناتھ ٹیگور، چ ف اینڈریوز اور بہت سے اور مشہور لوگوں کے دستخط تھے۔ جن میں سے اکثر کانگریس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ انڈمن کے قیدیوں سے زیادہ انسانیت کا سلوک کیا جائے

بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی جیلوں میں منتقل کر دیئے جائیں۔ حکومت ہندو کے ہوم ممبر اس اپیل پر بہت خفا ہوئے اور جن لوگوں نے اس پر دستخط کئے تھے ان کو برا بھلا کہا کہ وہ قیدیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آگے چل کر جہاں تک مجھے یاد ہے ان قیدیوں سے ہمدردی کرنا بنگال میں قابل سزا جرم قرار دے دیا گیا۔

سول نافرمانی کے التوا کی میعاد ختم ہونے سے پہلے ہمیں دہرہ دون جیل میں یہ خبر ملی کہ گاندھی جی پونا میں ایک بے ضابطہ کانفرنس منعقد کرنے والے ہیں۔ دو تین سو آدمی وہاں جمع ہوئے اور گاندھی جی کے مشورے سے عام سول نافرمانی ملتوی کر دی گئی تھی مگر انفرادی نافرمانی کی اجازت رہی اور ہر قسم کے خفیہ طریقوں کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ فیصلے حوصلہ افزا نہیں تھے مگر مجھے ان پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سول نافرمانی کو روکنے کے معنی صرف یہ تھے کہ موجودہ حالت کا اعتراف کیا جائے اور اس کو قائم رکھا جائے کیونکہ سچ پوچھئے تو عام تحریک پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ خفیہ کام کرنا محض ایک بہانہ تھا کہ تحریک اب بھی جاری ہے اور ہماری تحریک کی نوعیت دیکھتے ہوئے اس سے اخلاقی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ اس کی ضرورت صرف اس حد تک تھی کہ لوگوں کو ہدایتیں بھیجی جا سکیں اور ان سے تعلق قائم رکھا جا سکے مگر خود سول نافرمانی کو پوشیدہ رکھنا ناممکن تھا۔

مجھے جس بات سے تعجب اور افسوس ہوا وہ یہ تھی کہ پونا میں ہماری موجودہ حالت اور مقاصد کے متعلق صحیح معنوں میں کوئی بحث نہیں ہوئی۔ کانگریس والے تقریباً دو سال کی شدید جنگ کے بعد جمع ہوئے تھے اور اس عرصہ میں ساری دنیا میں اور ہندوستان میں بڑے بڑے اہم واقعات رونما ہو چکے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ برطانوی حکومت وہایٹ پیپر میں دستور اساسی کی اصلاح کی تجاویز شائع کی گئی تھیں۔ ہم اس عرصے میں مجبوراً خاموش رہے تھے اور دوسری طرف سے مسلسل جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا تھا کہ اصل مسئلہ لوگوں کی نظر سے چھپ جائے۔ نہ صرف

حکومت کے حامیوں بلکہ لبرل پارٹی اور دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی بار بار یہ کہا جا چکا تھا کہ کانگریس نے اپنا کامل آزادی کا مقصد ترک کر دیا ہے۔ میرے خیال میں اس موقع پر اور کچھ نہیں تو کم سے کم یہ ضرور کرنا چاہیے تھا کہ ہمارا سیاسی مقصد دوبارہ واضح کر دیا جائے اور ممکن ہو تو اس کے ساتھ سماجی اور معاشی مقاصد کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔ اس کے بجائے ساری بحث اس بات تک محدود رہی کہ عام سول نافرمانی بہتر ہے یا انفرادی نافرمانی اور خفیہ طریقوں سے کام لینا مناسب ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ ایک عجیب بات یہ تھی کہ حکومت سے ''صلح'' کرنے کا چرچا ہو رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے گاندھی جی نے وائسرائے کو ایک تار بھیجا اور ملاقات کی درخواست کی۔ مگر وائسرائے نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد گاندھی جی نے ایک اور تار بھیجا جس میں ''باعزت صلح'' کا ذکر تھا۔ بھلا اس وقت اس پر اسرار صلح کی تلاش کا کیا موقع تھا جب کہ حکومت بڑے زور شور سے قوم کو ہر طرح کچلنے کی کوشش کر رہی تھی اور انڈمن میں لوگ فاقے کر کے جان دے رہے تھے؟ مگر میں جانتا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو گا گاندھی جی کا اصول یہی ہے کہ وہ صلح کی درخواست ضرور کرتے ہیں۔

حکومت کا جبر و تشدد زور و شور سے جاری تھا اور پبلک جدوجہد کو روکنے کے لیے تمام خاص قوانین نافذ تھے۔ فروری ۳۳ء میں میرے والد کے یوم وفات کا جلسہ ہونے والا تھا۔ مگر پولیس نے اس کو بھی روک دیا حالانکہ اسے کانگریس سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کے صدر سر تیج بہادر سپرو جیسے اعتدال پسند تجویز کئے گئے تھے۔ آئندہ جو عنایات ہمارے حال پر ہونے والی تھیں ان کی جھلک ہمیں وہائٹ پیپر میں دکھائی گئی تھی۔

یہ ایک عجیب و غریب تحریر تھی جسے پڑھ کر انسان دم بخود رہ جاتا تھا۔ اس میں یہ تجویز تھی کہ ہندوستان موجودہ ہندوستانی ریاستوں کا ایک شاندار نمونہ بنا دیا جائے

اوراس کی وفاقی حکومت میں ان ریاستوں کے قدامت پسند نمائندوں کا اثر غالب ہومگر خود ریاستوں میں باہر آنے والوں کا کوئی اثر نہ ہو، وہاں بدستور خالص استبداد کا دور دورہ رہے۔ شہنشاہی کی اصل کڑیوں یعنی قرض کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہم پیشہ لندن کے صرافے کے غلام رہیں اور ہماری سکے اور زر کی پالیسی، ریزرو بینک کے توسط سے بینک آف انگلینڈ کے ہاتھ میں رہے۔ تمام مستقل حقوق رکھنے والے طبقوں کی حفاظت اس طرح کی جائے کہ اس میں کوئی دست اندازی نہ ہو سکے بلکہ نئے مستقل حقوق رکھنے والے طبقے پیدا کئے جائیں۔ عظیم الشان امپریل سروسیں جن سے ہمیں دلی محبت ہے، بدستور آزاد اور خود مختار رہیں تا کہ وہ ہمیں رفتہ رفتہ حکومت خود حکومت خود اختیاری کی تربیت دیں۔ صوبوں میں خود اختیاری حکومت ہومگر گورنر ایک شفقی مختار کل کی حیثیت سے ہماری تادیب کرتا رہے اور سب کے اوپر حاکموں کا حاکم، مختاروں کا مختار، وائسرائے ہو جسے سفید و سیاہ کا اختیار حاصل ہو۔ سچ پوچھئے تو برطانیہ کے حکمران طبقے کو نوآبادیوں پر حکومت کرنے کا جو ملکہ حاصل ہے اس کا کمال اس وہائٹ پیپر میں نظر آتا ہے اور اگر ہٹلر اور مسولینی جیسے لوگ ہندوستان کے وائسرائے پر رشک کریں تو کچھ بیجا نہیں۔

ہندوستان کو اس دستور کی زنجیروں میں جکڑنے کے بعد اوپر سے ''خاص ذمہ داریوں'' اور تحفظات کی بیڑیاں اس کے پیروں میں ڈال دی گئیں تا کہ یہ بدنصیب قیدی ہل جل بھی نہ سکے۔ بہ قول مسٹر نویل چمبرلین کے ''حکومت کے برطانیہ نے انتہائی کوشش سے ان تجویزوں کے ساتھ ان تمام تحفظات کو نتھی کر دیا ہے جو انسان کی عقل سوچ سکتی تھی۔''

پھر ہمیں یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ ان عنایات کے بدلے میں ہمیں ایک بھاری رقم ادا کرنی پڑے گی، چند کروڑ یکمشت اور پھر سالانہ قسطیں۔ ظاہر ہے کہ منوراج کی برکتیں بغیر معقول قیمت دیئے ہوئے کیوں کر حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہم اس دھوکے

میں تھے کہ ہندوستان غریب ملک ہے اور بھاری بوجھ میں دبا ہوا ہے اور ہمیں امید تھی کہ جب آزادی ملے گی تو بوجھ ہلکا ہو جائے گا مگر اب معلوم ہوا کہ نہیں۔ یہ تو اور بڑھ جائے گا۔

ہندوستان کے مسئلے کا یہ مضحک حل اس متانت کے ساتھ پیش کیا گی جو برطانوی قوم کے حصے میں آئی ہے اور ہم سے کہا گیا کہ دیکھو تمہارے حکمراں کس قدر فیاض ہیں۔ آج تک کسی شہنشاہی حکومت نے کسی محکوم قوم کو اتنے اختیارات اور حقوق اپنی خوشی سے نہ دیئے ہوں گے۔ انگلستان میں ان سخی داتاؤں میں اور ان لوگوں میں جو اس سخاوت کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے تھے اور اس کی مخالفت کر رہے تھے بڑی بڑی بحثیں ہوئیں۔ اس آمد و رفت کا جو ہندوستان اور انگلستان کے درمیان تین سال سے ہو رہی تھی، تین گول میز کانفرنسوں اور بے شمار کمیٹیوں کا یہ نتیجہ تھا۔

مگر انگلستان جانے کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی وہائٹ پیپر کا فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھی تھی اور ہندوستانی اسیسروں اور گواہوں کی حیثیت سے بلائے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور کمیٹیوں کا اجلاس لندن میں ہو رہا تھا اور ہمارے ملک میں پس پردہ لوگ ان کمیٹیوں کی ممبری کے لیے لڑ رہے تھے تا کہ لندن کا ٹکٹ مفت میں مل جائے اور مرکز سلطنت کی زیارت کا موقع نصیب ہو۔ وہائٹ پیپر کی دل شکن تجویزیں ان سورماؤں کی ہمت کو پست نہیں کر سکیں اور وہ سمندر اور ہوا کے سفر کی جوکھم اٹھانے اور لندن کے قیام کے شدید خطروں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئے تا کہ اپنی خطابت اور جادو بیانی کے زور سے ان تجویزوں کو بدلوانے کی کوشش کریں۔ وہ یہ جانتے تھے اور کہتے بھی تھے کہ کام بڑا دشوار اور مایوس کن ہے مگر وہ میدان سے ہٹنے والے نہ تھے اور اس پر تلے ہوئے تھے کہ کوئی سنے یا نہ سنے ہم اپنی کہے جائیں گے۔ ان میں سے ایک صاحب جو تعاونی پارٹی کے لیڈر تھے اور سب لوگوں کے واپس آنے کے بعد

بھی جمے رہے اور لندن کے ارباب اقتدار سے ملاقات پر ملاقات کرتے رہے اور ان کے ساتھ ڈنر پر ڈنر کھاتے رہے تا کہ خوب اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر دیں کہ وہ کیا سیاسی تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ جب وہ خدا خدا کر کے وطن لوٹے تو انہوں نے پبلک سے جو ان کے انتظار میں بے چین تھی، یہ فرمایا کہ وہ مرہٹوں کی شہرہ آفاق پارٹی کے ساتھ لندن میں ڈٹے رہے اور آخر وقت تک اپنے مطالبات کو دہراتے رہے۔

مجھے یاد ہے کہ میرے والد اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے تعاونی دوست ظرافت کی حس مطلق نہیں رکھتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انہوں نے مذاق میں کوئی بات کہی جس سے یہ حضرات محفوظ ہونے کے بجائے بگڑ بیٹھے اور والد کو اپنا مطلب سمجھانا پڑا اور ان کی تالیف قلوب کرنی پڑی۔ ظاہر ہے کہ اس سے انہیں بڑی کوفت ہوتی تھی۔ مجھے یہ شکایت سن کر مرہٹوں کے قابل قدر سپاہیانہ جوش کا دھیان آتا تھا جس کا اظہار نہ صرف پچھلے زمانہ میں ہوا بلکہ آج بھی ہماری قومی جنگ میں ہو رہا ہے اور تلک کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی جو دنیا کی کسی قوت سے نہیں ڈرتا تھا۔ جس کا سر کٹ جائے مگر جھکتا نہ تھا۔

لبرل وہائٹ پیپر کے دل سے مخالف تھے اور انہیں وہ جبر و تشدد بھی پسند نہ تھا۔ جو آئے دن ہندوستان میں ہوتا رہتا تھا بلکہ ایک آدھ بار انہوں نے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا مگر اسی کے ساتھ یہ بھی جتا دیا کہ وہ کانگریس اور اس کی جدوجہد کو برا سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ حکومت کو کسی بڑے کانگریسی لیڈر کی رہائی کا مشورہ دیتے تھے۔ ان کی ہمدردی صرف چند افراد تک محدود تھی جن سے ان کی ملاقات تھی۔ لبرل اور تعاونی دونوں جو دلیل پیش کرتے تھے وہ یہ تھی کہ فلاں شخص رہا کر دیا جائے کیونکہ اب امن عامہ کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور پھر حکومت کو ہر وقت اختیار ہے کہ اگر وہ اور کوئی شرارت کریں تو انہیں دوبارہ گرفتار کر لے۔ اس وقت حکومت یہ فعل

زیادہ قرین انصاف ہوگا۔ انگلستان کے بعض حضرات بھی ازراہ عنایت ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبروں اور چند خاص افراد کی رہائی کی تحریک کرتے تھے اور یہی تاویلیں پیش کرتے تھے۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہم ان حضرات کے شکرگزار نہ ہوں جو اسیری میں ہمارے پرسان حال تھے مگر بعض وقت یہ خیال آتا تھا کہ ہمارے یہ مہربان ع ہم پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احساس ہوتا۔ ہمیں ان کے خلوص نیت میں مطلق شبہ نہ تھا۔ مگر صاف ظاہر تھا کہ یہ سراسر برطانوی حکومت کے خیالات سے متاثر ہیں اور ہمارے اور ان کے درمیان بہت بڑا خلیج حائل ہے۔

لبرل حکومت کی بہت سی کارروائیوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اور انہیں بہت رنج ہوتا تھا مگر بے چارے کر ہی کیا سکتے تھے۔ حکومت کے خلاف کوئی موثر جدوجہد کرنا تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اپنی جداگانہ حیثیت قائم رکھنے کے لیے انہیں عام لوگوں سے اور عملی جدوجہد کرنے والوں سے دور ہٹنا پڑا اور اپنی پالیسی زیادہ معتدل کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ ان کے اور حکومت کے خیالات میں کوئی فرق نہیں رہا۔ ان کی تعداد بہت کم تھی اور عام لوگوں پر ان کا کوئی اثر نہیں تھا اس لیے ان کے الگ رہنے سے قومی تحریک کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ مگر ان میں بعض مشہور اور ممتاز اشخاص تھے جن کی ذاتی شخصیت سے بڑی قدر ومنزلت تھی۔ ان بزرگوں نے اور بہ حیثیت مجموعی لبرل اور تعاونی پارٹی نے اس نازک وقت میں سرکاری پالیسی کی اخلاقی مدد کر کے برطانوی حکومت کی زبردست خدمت کی۔ حکومت کے جبر وتشدد اور بے آئینی کو بھی اس سے بڑی شہ ملی کہ ان لوگوں نے اس کی کوئی موثر مخالفت نہیں کی بلکہ لبرل پارٹی نے تو کبھی کبھی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ غرض لبرل اور تعاونی جماعت نے اس شدید جبر واستبداد کی جو ملک میں ہو رہا تھا اخلاقی تائید کی جبکہ خود حکومت کے لیے اس جائز ثابت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

لبرل لیڈر یہ فرماتے تھے کہ وہائٹ پیپر برا ہے، بہت برا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے

کہ وہ کرتے کیا ہیں۔لبرل فیڈریشن کا جو سلسلہ اپریل ۳۳ء میں کلکتہ میں ہوا اس میں سب سے ممتاز لبرل لیڈر سری نواس شاستری صاحب نے اس پر زور دیا کہ دستور اساسی کی تبدیلیاں خواہ کتنی ہی نا قابل اطمینان کیوں نہ ہوں ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ ہم ان کو عمل میں لائیں۔انہوں نے کہا 'یہ اس کا وقت نہیں ہے کہ ہم چپ چاپ کھڑے رہیں اور کچھ نہ کریں۔'' ان کے ذہن میں عمل کا صرف ایک ہی تصور تھا اور وہ یہ تھا کہ جو کچھ ملے اسے قبول کرلیں اور اس پر عمل درآمد کریں۔ان کے خیال میں دوسری صورت یہی ہوسکتی تھی کہ کچھ نہ کیا جائے۔آگے چل کر انہوں نے فرمایا ''اگر ہم عقل، تجربہ، اعتدال رکھتے ہیں، اگر ہم میں خاموشی سے دوسروں پر اثر ڈالنے کی صلاحیت، ان کی رائے بدلنے کی قوت اور حقیقی قابلیت ہے تو یہی موقع ہے جب ہمیں اپنی خدمات کا پورا پورا ثبوت دینا چاہیے۔''

''بقول کلکتے کے اخبار اسٹیٹمین کے'' یہ پرزور اور دلکش الفاظ کا ایک طلسم تھا۔''

خطابت مسٹر شاستری کا شوق ہے۔سب خطیبوں کی طرح انہیں بھی عمدہ عمدہ الفاظ کو خوش الحانی سے ادا کرنے کا شوق ہے۔مگر وہ اکثر اپنے جوش کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور جن الفاظ کا طلسم وہ باندھتے ہیں ان میں معنی اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ نہ انہیں پتہ چلتا ہے اور نہ دوسروں کو۔اگر ہم ان کے اس اپیل پر جو انہوں نے ۳۳ء میں سول نافرمانی کے دوران میں، کلکتہ میں کیا تھا، تنقیدی نظر ڈالیں تو فائدے سے خالی نہ ہوگا۔بنیادی اصول و مقاصد سے قطع نظر کر کے مجھے دو باتیں قابل غور معلوم ہوتی ہیں۔اول یہ کہ ان کے خیال میں خواہ برطانوی حکومت ہمیں کتنا ہی ذلیل کرے، کچلے، لوٹے ہمیں اس کی اطاعت سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔کوئی ایسی حد نہیں مقرر کی جاسکتی جس کے آگے ہمیں نہ بڑھنا چاہیے۔کمزور سے کمزور مظلوم بھی ایک وقت تنگ آ کر ظالم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔مگر مسٹر شاستری کے مشورے کے مطابق ہندوستانیوں کو کبھی اس کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیے

گویا ان کے نزدیک برطانوی حکومت کی اطاعت اور اس کے احکام کی تعمیل ایک دینی فریضہ ہے (یہ لفظ یہاں موزوں نہیں مگر مجبوراً استعمال کرنا پڑا) یہ نوشتہ تقدیر ہے جو ہمیں چاروناچار پورا کرنا ہے۔ یہ یاد رہے کہ وہ یہ مشورہ کیس خاص صورت حال کے متعلق نہیں دے رہے تھے۔ ''دستور اساسی کی تبدیلیاں'' ابھی تک زیر غور تھیں اگرچہ لوگوں کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بہت ناقص ہوں گی۔ وہ یہ کہتے تو ایک بات بھی تھی کہ گو وہائٹ پیپر کی تجاویز ناقص ہیں لیکن میں تمام حالات کے لحاظ سے یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اگر وہ قانون کی شکل اختیار کر لیں تو ہمیں چاروناچار ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس صورت میں خواہ ان کا مشورہ اچھا سمجھا جاتا یا برا مگر وہ واقعات کے مطابق ہوتا۔ مگر شاستری صاحب تو اس سے کہیں آگے بڑھ گئے۔ ان کا ارشاد تھا کہ خواہ یہ تبدیلیاں کتنی ہی بری کیوں نہ ہوں ہمیں بہر حال قبول کر لینی چاہئیں۔ وہ اس معاملے میں جو قومی نقطہ نظر سے انتہائی اہمیت رکھتا تھا اور برطانوی حکومت کو سیاہ و سفید کا اختیار دینے کو تیار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح کوئی شخص یا جماعت نامعلوم مستقبل کے متعلق دوسروں کے فیصلہ کو پہلے سے قبول کر سکتی ہے۔ یہ تو تب ہی ہو سکتا ہے۔ جب وہ مطلق کوئی اصول یا اخلاقی اور سیاسی معیار نہ رکھتی ہو اور اس کا دین و ایمان یہی ہو کہ حاکم کے حکم پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہیے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ اس وقت مصلحت کا متضا دکیا تھا۔ وہائٹ پیپر صرف پہلا مرحلہ تھا اور ابھی ان تجویزوں کے قانون بننے میں بہت سے مرحلے باقی تھے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کے نقطہ نظر سے وہائٹ پیپر کی منزل بہت اہم تھی مگر بہر حال ابھی اسے بہت سی منزلوں سے گزرنا تھا اور یہ ممکن تھا کہ اس دوران میں اس میں اچھی یا بری تبدیلیاں ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلیاں اس بات پر منحصر تھیں کہ برطانوی حکومت اور پارلیمنٹ پر مختلف فریقوں کی طرف سے کس حد تک دباؤ پڑتا ہے۔ یہ بات بعید از قیاس نہ تھی کہ حکومت اس کشمکش میں ہندوستانی لبرل پارٹی

کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے ان تجاویز کو کچھ بہتر بنا دے یا کم سے کم بدتر بنانے سے باز رہے۔ مگر ابھی اصلاحات کے قبول کرنے یا رد کرنے کا سوال اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ مسٹر شاستری نے زور و شور سے اعلان کر دیا کہ حکومت پر ظاہر ہو گیا کہ ہندوستانی لبرل پارٹی کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں اپنی طرف کھینچنے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ خود بخود کھچے چلے آتے تھے اور اگر حکومت انہیں دھکے دے کر نکالنا چاہتی تب بھی نہ نکلتے۔ جہاں تک میں اس معاملے پر خود لبرل پارٹی کے نقطہ نظر سے غور کر سکتا ہوں مجھے یہی نظر آتا ہے کہ مسٹر شاستری کی کلکتہ کی تقریر بالکل خلاف مصلحت اور لبرل جماعت کے مقاصد کے لیے مضر تھی۔

میں نے مسٹر شاستری کی پرانی تقریر پر یہ تفصیلی بحث اس وجہ سے نہیں کی کہ بجائے خود یہ تقریر یا لبرل فیڈریشن کا جلسہ کوئی اہمیت رکھتا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ میں لبرل لیڈروں کی ذہنیت کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ یہ لائق اور قابل قدر لوگ ہیں۔ مگر انتہائی کوشش کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے یہ طرز عمل کیوں اختیار کیا ہے۔ مسٹر شاستری کی اور تقریر کا بھی جو میں نے جیل میں پڑھی تھی، مجھ پر بہت اثر ہوا۔ جون ۳۳ء میں وہ پونا میں سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے جلسے میں صدر کی حیثیت سے تقریر کر رہے تھے۔ اس میں انہوں نے یہ دکھایا کہ اگر برطانوی عملداری ہندوستان سے یکایک اٹھ جائے تو کس قدر خطرے پیدا ہو جائیں گے اور سیاسی تحریکیں باہمی نفرت اور ایک دوسرے پر جبر و تشدد کر کے کیا آفت برپا کر دیں گے۔ بقول ان کے برطانیہ کی سیاسی زندگی ہمیشہ رواداری پر مبنی رہی ہے اس لیے اگر ہندوستان کی آئندہ نشو و نما برطانیہ کے اتحاد عمل سے ہو تو یہاں رواداری پیدا ہونے کی زیادہ امید ہو سکتی ہے۔ جیل میں ہونے کی وجہ سے میرے پاس اس تقریر کا ماخذ صرف اس کا وہ خلاصہ تھا جو کلکتے کے اسٹیٹمین میں شائع ہوا۔ اس پر اسٹیٹمین نے یہ لکھا کہ "یہ بڑا دل خوش کن نظریہ ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر مونجے نے بھی

حال ہی میں اسی قسم کی تقریریں کی ہیں'' اپنی تقریر کے آخر میں مسٹر شاستری نے اس کا ذکر کیا کہ روس، اٹلی اور جرمنی میں رعایا کی آزادی سلب کر لی گئی ہے اور ان پر وحشیانہ مظالم ہو رہے ہیں۔

اس کو پڑھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں مسٹر شاستری کا خیال برطانیہ کی انتہائی قدامت پرست جماعت سے کس قدر حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہے۔ دونوں میں کچھ جزوی اختلافات ضرور ہیں، مگر بنیادی خیال ایک ہی ہے۔ اگر مسٹر ونسٹن چرچل بھی بالکل انہیں الفاظ میں تقریر کرتے تو کوئی بات ان کے اصول کے خلاف نہ ہوتی۔ مسٹر شاستری ہماری لبرل پارٹی کے ترقی پسند فریق سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے سب سے قابل لیڈر ہیں۔

افسوس ہے کہ میں شاستری کے تاریخی نظریے اور ان خیالات سے جو وہ ممالک عالم خصوصاً برطانیہ اور ہندوستان کے متعلق رکھتے ہیں مطلق اتفاق نہیں کر سکتا۔ غالباً انگریزوں کے سوا کوئی شخص بھی ان کی تائید نہیں کرے گا بلکہ بعض روشن خیال انگریز بھی ان سے متفق نہ ہوں گے۔ شاستری صاحب میں یہ کمال ہے کہ وہ دنیا کو اور خود اپنے ملک کو برطانوی حکمرانوں کی متعصابہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ پھر بھی یہ تعجب کی بات ہے کہ انہوں نے اپنی تقریر میں ان غیر معمولی واقعات کا کوئی ذکر نہیں کیا جو پچھلے اٹھارہ مہینے میں ہندوستان میں پیش آ چکے تھے اور عین اس تقریر کے وقت پیش آ رہے تھے۔ انہوں نے روس، اٹلی اور جرمنی کے مظالم بیان کر ڈالے مگر خود اپنے ملک کے خوفناک جبر و تشدد اور ہر قسم کی قانونی آزادی کی پامالی کا نام تک نہ لیا۔ ممکن ہے کہ انہیں صوبہ سرحد کے ہولناک واقعات اور بنگال کے حالات (جنہیں بابو راجندر پرشاد نے حال میں کانگریس کے خطبہ صدارت میں ''قیامت بنگال'' سے تعبیر کیا تھا) نہ معلوم ہوں، اس لیے کہ ان پر احتساب کا بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔ مگر کیا انہیں یہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا کہ ہندوستان سخت مصیبت میں ہے اور

ان کے ہم قوم ایک زبردست دشمن ہے سے شدید جنگ میں مصروف ہیں جن پر ان کی موت اور زندگی کا انحصار ہے؟ کیا وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ملک کے بڑے بازاری ہے، لوگ جیل میں بھوک ہڑتال کر رہے ہیں اور طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں؟ کیا انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ جس آزادی اور رواداری کے لیے وہ برطانیہ کی قصیدہ خوانی کر رہے تھے اسے خود برطانیہ ہندوستان میں کچل رہا ہے؟

اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ کانگریس سے متفق تھے یا نہیں تھے۔ انہیں اس کا پورا حق تھا کہ وہ کانگریس کی پالیسی پر تنقید کریں اور اسے برا کہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایک ہندوستانی، ایک محبّ آزادی، ایک ذی حس انسان کی حیثیت سے ان پر اپنے ملک کے مردوں اور عورتوں کی حیرت انگیز بہادری اور قربانی کا کچھ اثر نہیں ہوا؟ کیا انہیں یہ دیکھ کر مطلق تکلیف نہیں ہوئی کہ ہمارے حکمران ہندوستان کے دل پر آرے چلا رہے ہیں؟ کیا انہیں اس پر کوئی جوش نہیں آیا کہ بیسیوں ہزار آدمی ایک زبردست سلطنت کی قوت کے آگے جھکنے اور اپنی روح کو ہلاک کرنے سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ ان کے جسم روند ڈالے جائیں، ان کے گھر برباد ہو جائیں اور ان کے پیارے دنیا بھر کی تکلیفیں برداشت کریں؟ ہم لوگ جیل میں اور جیل سے باہر صبر کا اظہار کرتے تھے، ہنستے تھے اور مسکراتے تھے مگر اکثر تبسم کے ساتھ ہماری آنکھوں میں آنسو جھلک آتے تھے اور کبھی کبھی ہمارا ہنسنا رونے سے مشابہ ہوتا تھا۔

ایک بہادر اور فراخ دل انگریز مسٹر ویریر ایلون نے ان تاثرات کا ذکر کیا ہے۔ جو اس منظر سے اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ۱۹۳۰ء کے متعلق لکھتے ہیں ”ایک قوم کی قوم کو اپنی غلامی زنجیریں توڑتے ہوئے اور عزم و استقلال کی بلندی پر چڑھتے ہوئے دیکھنا ایک عجیب و غریب تجربہ تھا۔“ اور ایک موقع پر ”ستیاگرہ کی تحریک میں کانگریس کے اکثر والنٹیروں کا وہ حیرت انگیز انضباط جس کا ایک صوبے کے گورنر نے فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے.....“

مسٹر سری نواس شاستری ایک قابل اور زود حس آدمی ہیں۔ اور ان کے ہم وطن ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ کسی طرح یقین نہیں آتا کہ ان کے دل پر اثر نہیں ہوا اور انہیں اس تحریک میں اپنے ہم وطنوں سے ہمدردی نہ تھی۔ ان سے یہ توقع تھی کہ ان کی آواز جبر و تشدد کے خلاف اٹھے گی جس کے ذریعہ حکومت تمام قانونی حقوق کو پامال کر رہی تھی اور ہر قسم کی پبلک جدوجہد کو روک رہی تھی۔ یہ امید تھی کہ وہ اور ان کے رفیق خود مصیبت زدہ علاقوں، یعنی صوبہ سرحد، اور بنگال میں جائیں گے اس لیے نہیں کہ کانگریس یا سول نافرمانی کو مدد دیں بلکہ اس لیے کہ حکام اور پولیس کی زیادتیوں کا پردہ فاش کر کے انہیں روکیں۔ دوسرے ملکوں میں سیاسی اور مدنی آزادی کے حامی عموماً یہ کرتے ہیں مگر بجائے اس کے کہ وہ عاملہ کے استبداد کو روکتے جو ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کو کچل رہا تھا اور جس نے انہیں معمولی حقوق سے بھی محروم کر دیا تھا یا کم سے کم حقیقت حال سے واقفیت حاصل کرتے، انہوں نے برطانوی قوم کو حمایت، آزادی اور رواداری کی سند دیدی۔ عین سی وقت جب یہ خوبیاں ہندوستان کی برطانوی حکومت میں نام کو بھی نہ تھی۔ اپنی اخلاقی تائید سے انہوں نے حکومت کی ہمت افزائی کی اور اس کے استبداد کو تقویت پہنچائی۔

مجھے یقین ہے کہ ان کی نیت یہ نہ ہوگی اور انہیں اپنے طرز عمل کے نتائج کا اندازہ نہیں ہوا ہوگا۔ مر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ان کی تقریر کا یہی اثر ہوا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان کے یہ خیالات اور یہ عمل کیوں ہے؟

مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا سوا اس کے کہ لبرل پارٹی نے اپنے ہم وطنوں سے اور جدید خیالات سے بالکل قطع تعلق کر لیا ہے۔ جو فرسودہ کتابیں انہوں نے پڑھی ہیں ان کی بدولت ہندوستانیوں کے حالات اور خیالات ان کی نظر سے چھپ گئے ہیں اور وہ خود پرستی میں مبتلا ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم جیل میں گئے اور ہمارے جسم کال کوٹھڑی میں بند رہے مگر ہمارے ذہن قید سے آزاد، ہماری روحیں

ہیبت اور دہشت سے بری ہیں۔ مگر انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنے لیے ایک ذہنی قید خانہ بنالیا جس میں وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔ مگر نجات کی کوئی صورت نہیں پاتے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز جیسی اب ہے ویسی ہی رہنی چاہیے۔ مگر جب حالات بدلے جیسا کہ اس بدلنے والی دنیا کا دستور ہے، تو ان کی بے پتوار کی کشتی ڈگمگانے لگی۔ وہ جسمانی اور ذہنی حیثیت سے بے بس ہو کر رہ گئے۔ نہ ان کا کوئی نصب العین رہا اور نہ اخلاقی معیار۔ ہم میں سے ہر شخص کو دو چیزوں میں سے ایک چیز اختیار کرنی ہے یا خود قدم بڑھائے یا دھکے دے کر آگے بڑھایا جائے۔ اس حرکت پذیر دنیا میں کوئی ساکن نہیں رہ سکتا۔ ہمارے لبرل حرکت اور تغیر سے ڈرتے تھے۔ اس لیے وہ اس طوفان کو دیکھ کر، جو چاروں طرف سے اٹھ رہا تھا بدحواس ہو گئے ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ موجوں کو چیر کر آگے بڑھیں اس لیے ڈبکیاں کھانے لگے اور جو تنکا سامنے آ گیا اس کا سہارا ڈھونڈنے لگے۔ ہندوستان کی سیاست میں ان کی حیثیت شیکسپیر کے ہملٹ کی سی ہو گئی ''جس کے چہرے پر فکر کی زردی چھائی رہتی تھی'' اور شک، ہچکچاہٹ اور تذبذب کا شکار ہو کر رہ گئے۔

''زمانے کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ برا ہو تقدیر کی ستم ظریفی کا جس نے مجھے اسے سمیٹنے کے لیے پیدا کیا۔''

سرونٹ آف انڈیا نے، جو لبرل جماعت کا ہفتہ وار اخبار ہے، سول نافرمانی کے آخری دنوں میں کانگریس والوں پر الزام لگایا کہ وہ خود ہی جیل جاتے ہیں، اور پھر چاہتے ہیں کہ رہا کر دیئے جائیں۔ وہ اس پر خفا تھا کہ کانگریس کی لے دیکے یہی ایک پالیسی رہ گئی ہے اور لبرل جماعت کی پالیسی کیا تھی؟ برطانوی وزیروں کی خدمت میں ڈپوٹیشن بھیجنا اور دعائیں مانگتے رہنا کہ انگلستان کو میں حکومت بدل جائے۔

یہ ایک حد تک صحیح ہے کہ کانگریس کی پالیسی ان دنوں زیادہ تر یہی تھی، کہ لوگ

تعزیری ضابطوں کی خلاف ورزی کر کے جیل جائیں اور صحیح ہے کہ قوم ایک مدت تک لڑتے لڑتے پست ہوگئی تھی۔ اور حکومت پر کچھ زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکتی تھی۔ مگر یہ پالیسی اخلاقی اور عملی مصلحتوں پر مبنی تھی۔

کھلا ہوا استبداد، جو ان دنوں ہندوستان میں ہو رہا تھا، حکومت کو بہت مہنگا پڑتا تھا، خود اس کے لیے بھی یہ بڑی تکلیف دہ اور پریشان کن آزمائش تھی اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ پالیسی آخر میں اس کی قوت کی بنیادوں کو کمزور کر دے گی۔ اس سے نہ صرف ہندوستانی قوم بلکہ ساری دنیا کے سامنے اس طرز حکومت کا پردہ فاش ہو رہا تھا۔ وہ اسے بدرجہا بہتر سمجھتی تھی کہ اس کا آہنہ پنجہ مخمل کے دستانے میں چھپا رہے۔ حکومت کے لیے اس سے زیادہ ناگوار اور اگر غور سے دیکھا جائے تو اس سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں کہ اسے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑے جو کسی حال میں بھی اس کی مرضی کے آگے سر نہ جھکائیں۔ اس لیے استبدادی قوانین کی خلاف ورزی کی متفرق اور منتشر کوششیں بھی فائدے سے خالی نہ تھیں۔ ان سے قوم کو تقویت پہنچتی تھی اور حکومت کی ہمت پست ہوتی تھی۔

اخلاقی مصلحت اس سے بھی زیادہ اہم تھی۔ تھورو کا مشہور مقولہ ہے ''جب مرد اور عورتیں بے انصافی سے قید کی جا رہی ہوں تو ہر انصاف پسند مرد اور عورت کو قید خانے جانا چاہیے'' ممکن ہے کہ مشہور لبرل حضرات اور دوسرے بزرگوں کو پسند نہ آئے لیکن ہم میں سے اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ موجودہ حالات میں ''اخلاقی زندگی'' ناقابل برداشت ہے، جبکہ سول نافرمانی کے علاوہ یوں بھی ہمارے اکثر رفیق قید فرنگ میں گرفتار رہتے ہیں اور حکومت کے استبداد کا نظام ہمیں ہر وقت دباتا اور ذلیل کرتا رہتا ہے اور ہماری قوم کو ڈستا رہتا ہے۔ ہم اپنے ملک میں مشتبہ لوگوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہر وقت ہماری نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی رہتی ہے، ہر لفظ جو ہماری زبان سے نکلتا ہے قلم بند کر لیا جاتا ہے کہ کہیں اس میں ہمہ گیر قانون

بغاوت کی خلاف ورزی نہ ہو، ہمارے خطوط کھول لیے جاتے ہیں اور ہمیں ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ عاملانہ حکم امتناعی یا گرفتاری کا پروانہ نہ آ رہا ہو، ہمارے سامنے دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو حکومت کی قوت کے آگے سر جھکا دیں، روحانی ذلت اختیار کر لیں، اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیں، اپنی اخلاقی دولت کو ادنیٰ اغراض کے بدلے بیچ ڈالیں یا مخالفت کریں اور اس کی سزا بھگتیں۔ کوئی شخص خوشی سے جیل جانا یا تکلیف اٹھانا نہیں چاہتا۔ مگر اکثر جیل جانا ذلت کی زندگی بسر کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔ بہ قول برنارڈ شاہ کے ''زندگی کی حقیقی مصیبت یہ ہے کہ انسان موقع پرستوں کے ہاتھوں میں اغراض کا آلہ بن کر رہے جن کو وہ ادنیٰ اور ذلیل جانتا ہے۔ اور جتنی مصیبتیں وہ زیادہ سے زیادہ بدقسمتی اور تقدیری حوادث کا حکم رکھتی ہیں۔ یہی ایک چیز ہے جو شامت، غلامی اور دنیا کا دوزخ ہے۔''

----------اختتام ۔۔ حصہ دوئم----------